التیسیر المجد

شرح اردو

موطا امام محمد

شارح

مفتی محمد ریحان قاسمی صاحب کشن گنج، بہار

فاضل دارالعلوم دیوبند

پسند فرمودہ

حضرت مولانا و مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم

مہتمم و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

تقریظ و تصحیح

حضرت مولانا محمد صادق صاحب دولت پوری

سابق استاذ حدیث و تفسیر جامعہ اسلامیہ عربیہ مرادیہ مظفر نگر یوپی

مکتبۃ الحرمین دیوبند

﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾

التیسیر الممجد

شرح اردو

موطا امام محمدؒ

شارح

(مفتی) محمد ریحان قاسمی کشن گنج (بہار)

فاضل دار العلوم دیوبند (یوپی)

پسند فرمودہ:

حضرت مفتی ابو القاسم صاحب نعمانی

مہتمم و شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

نظر ثانی وتصحیح:

حضرت مولانا صادق صاحب دولت پوری

سابق استاذ حدیث وتفسیر جامعہ اسلامیہ عربیہ مرادیہ مظفر نگر (یوپی)

ناشر

مکتبۃ الحرمین دیوبند

موبائل نمبر: 8979354752

تفصیلات

نام کتاب : التَّیسِیرُ المُمَجَّد شرح اُردو موطا امام محمد

شارح : (مفتی) محمد ریحان قاسمی کشن گنج بہار (فاضل دارالعلوم دیوبند)

نظر ثانی : حضرت مولانا صادق صاحب دولت پوری سابق استاذ مدرسہ مرادیہ مظفر نگر

تعدادِ صفحات : 352/صفحات

سن اشاعت : نومبر 2021ء قیمت : .Rs

کمپوزنگ : فضل الرحمٰن عادل قاسمی موبائل نمبر:8868071165

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

خاکسار اپنی اس پہلی کاوش کو محسن انسانیت جناب سید المرسلین رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کرنا باعث سعادت سمجھتا ہے۔ بلاشبہ آپ ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنا اور آپ کے ارشادات کے مطابق زندگی گذارنا ہی اہلِ دنیا کے لئے نجات کا ذریعہ ہے۔ ”زہے نصیب اگر قبول اُفتد!!“ فقط والسلام

احقر العباد: محمد ریحان القاسمی، کشن گنج (بہار)

فاضل دارالعلوم دیوبند

ناشر:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرستِ عناوین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تاریخ آغاز

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ سَیِّدِ الْأَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی آلِہٖ وأَصْحَابِہٖ أَجْمَعِیْنَ أَمَّا بَعْدُ!

آج بروز جمعۃ المبارک بتاریخ ۲۷/ذی قعدہ ۱۴۴۰ھ مطابق ۲/جون ۲۰۱۹ء کو بعد نمازِ عصر دارالعلوم دیوبند کی عظیم الشان مسجد ''مسجدِ رشید'' میں بیٹھ کر اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے حدیث کی مشہور کتاب مؤطا امام مالکؒ -بروایت امام محمدؒ- کی شرح لکھنے کا آغاز کر رہا ہوں۔

اے اللہ! بندہ کی اِس علمی کاوش کو قبول فرما اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچادے اور بندہ کے لیے آخرت میں نجات کا ذریعہ بنادے! آمین یا رب العالمین، والحمد للہ اوّلاً واخراً

بندہ عاصی

محمد ریحان القاسمی کشن گنجوی

بروز بدھ ۲۸/جمادی الاولیٰ ۱۴۴۲ھ

موبائل نمبر: 7302124171

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ شارح

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ اَمَّا بَعْدُ!

اللہ تبارک وتعالیٰ کا اس ناچیز پر بے انتہا فضل وکرم اور احسان ہے کہ اس نے احقر کو علمِ حدیث کی خدمت کا موقع فراہم کیا، ربِّ کائنات کی اس نعمت پر اس کا جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

اس بے بضاعت کو اس حقیقت کا اعتراف واقرار کرنے میں کوئی تأمل نہیں کہ دریاءِ علم کا جو قطرہ اس تہی مایہ کے حصہ میں آیا وہ کسی تشنہ لب کو تو کیا سیراب کرتا، خود کو اس کی تشنگی رفع کرنے کے لیے بھی کافی نہیں۔ تاہم ''ہمتِ مرداں مددِ خدا'' طالبانِ علومِ نبوت کی خدمت میں یہ ایک معمولی سا تحفہ پیش کرنے کی سعادت ہو رہی ہے۔

حدیث شریف جتنا نازک فن ہے اللہ رب العزت نے اس کی خدمت کے لیے ایسے ہی افراد کو پیدا فرمایا، جنہوں نے حدیث کے حوالے سے نہایت ہی قابلِ قدر ولائقِ تحسین خدمات انجام دیں۔

یہی وہ بابرکت علم ہے جس میں مشغول رہنے والے کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے رحمت ونضارت کی دعاء اور جنت کی بشارت دی ہے۔ علم کی اسی اہمیت وفضیلت کی بناء پر علمائے اسلام نے قرآنِ کریم کے بعد سب سے زیادہ اسی علم کی خدمت کی ہے اور حدیث ومتعلقاتِ حدیث پر اس قدر کتابیں تالیف کی ہیں کہ آج اگر کوئی شخص انہیں شمار کرنا چاہے تو اس کی زندگی کے شب وروز تمام ہوجائیں گے؛ مگر ان کتابوں کا شمار پھر بھی پورا نہ ہوسکے گا۔

علمائے امت کا یہ سلسلہ تاہنوز اب بھی قائم ہے اور علماء اپنے ذوق کے مطابق حالات اور تقاضوں کے پیشِ نظر اس بابرکت مخدوم علم کی خدمت میں مصروف ہیں۔

چنانچہ احقر کے دل میں بھی عرصۂ دراز سے اس بات کی تمنا تھی کہ درسِ نظامی کی کسی کتاب کی شرح لکھوں؛ چنانچہ ابھی یہ تمنا پوری نہ ہوئی تھی کہ اسی سال دار العلوم دیوبند کے ''شعبۂ تعلیمی'' کا اجلاس نصاب پر غور وخوض کے سلسلے میں شعبان المعظم ۱۴۳۴ھ میں منعقد ہوا، جس میں بطورِ خاص دورۂ حدیث کے نصاب کو مدِّنظر رکھا گیا؛ چنانچہ جب شعبۂ تعلیمی کا اجلاس اختتام پذیر ہوا تو اس میں مختلف عربی درجات کی کتابوں کا نصاب تبدیل کیا گیا اور دورۂ حدیث کی بھی چند کتابوں کا نصاب تبدیل کردیا گیا، انہیں میں سے حدیث کی ایک مشہور کتاب مؤطا امام مالکؒ بروایت امام محمدؒ بھی ہے۔

شرح موطأ الإمام محمد (اردو شرح)

موطا امام محمدؒ ہمارے دیار برصغیر میں کافی اہمیت کی حامل ہے، یہی وجہ ہے کہ دیگر کتبِ احادیث صحاحِ ستہ وغیرہ کی طرح یہ بھی درسِ نظامی کا حصہ ہے، بعض اِداروں میں مکمل اور بعض میں منتخب ابواب کی تدریس عمل میں آتی ہے؛ چونکہ ہماری مادری زبان اُردو ہے؛ اس لیے چند علماء نے اُردو زبان میں ''موطا امام محمدؒ'' کی تشریح اور اس کے اسرار ورموز اور مشکلات ومضمرات کو حل کرنے کی کوششیں کی ہیں، اسی

سلسلہ کی ایک بہترین اور ممتاز کڑی "**التیسیر الممجد شرح اُردو موطا امام محمد**" نامی کتاب ہے۔

یہ کتاب فی الحال از کتاب النکاح تا کتاب الضحایا کی احادیث کی تشریح پر مشتمل ہے۔

تو احقر کو جب دورۂ حدیث کے نصاب کی تبدیلی کا علم ہوا تھا اسی وقت یہ ارادہ کرلیا تھا کہ اب کسی حدیث کی کتاب کی شرح تحریر کروں گا۔

پس عرصۂ دراز سے دل میں چھپی ہوئی تمنا کو پورا کرنے کا وقت آیا اور احقر نے اللہ کا نام لے کر ۲۷/ذی قعدہ ۱۴۴۰ھ کو اس عظیم الشان کام کا آغاز کرہی دیا اور تالیف کا سلسلہ ۲۸/ربیع الثانی ۱۴۴۲ھ مطابق ۲۳/اپریل ۲۰۱۹ء کو اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔

احقر نے موطا امام محمدؒ کا انتخاب اس لیے کیا؛ کیونکہ ابھی دارالعلوم دیوبند میں موطا امام محمدؒ کا جو نصاب تبدیل کیا گیا ہے، اس کی شروحات بازار میں ایک بھی نہیں ہے، صرف ایک ترجمہ بازار میں دستیاب ہے، وہ بھی بہت کم ملتا ہے۔

احقر کو اپنی کم علمی کا بھرپور احساس ہے اور یہ صرف اللہ رب العزت کا کرم ہے کہ اس نے احقر سے یہ خدمت لی ہے۔

احقر کی یہ پہلی کاوش دوستوں کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے، اُمید ہے کہ بنظرِ تحسین دیکھی جائے گی۔ بندہ نے اپنی اس کاوش میں مندرجہ ذیل چند چیزوں کا خاص طور پر التزام کیا ہے:

(۱) ہر حدیث پر صحیح اعراب لگا کر سلیس اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔

(۲) ہر حدیث کی قابلِ قبول اور اطمینان بخش تشریح کی گئی ہے۔

(۳) اختلافی مسائل کو "ائمۂ کرام کا اختلاف" کا عنوان دے کر ہر فریق کے

مذاہب اور دلائل کو قلم بند کیا گیا ہے، پھر احناف کی جانب سے ہر مذہب کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔

(۴) اگر کسی حدیث میں ایک ساتھ دو مسئلوں کا ذکر ہے تو دونوں مسئلوں کی الگ الگ وضاحت کی ہے۔

(۵) احقر نے کتاب کی طوالت کی وجہ سے راویوں کے احوال مرتب نہیں کیے ہیں۔

(۶) جو بھی لکھا گیا ہے وہ متقدمین علماء اور عصرِ حاضر کے علماء کی تحریرات سے ماخوذ ہے، جس کا جگہ جگہ پر حوالہ بھی دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد آپ کو زیرِ نظر کتاب میں ملیں گے۔

نیز یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اس کتاب کے مراجع بھی مہیا فرما دیے۔ جہاں مراجع کے حصول کے لیے احقر کا اپنی چھوٹی سی لائبریری کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ رہا، وہیں پر مادرِ علمی دار العلوم دیوبند کی عظیم الشان لائبریری سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ اِس شرح کا اکثر حصہ دار العلوم دیوبند میں ہی رہ کر لکھا گیا ہے؛ البتہ اس کا کچھ حصہ احقر نے اپنے گھر اور مدرسہ مدینۃ العلوم لدھیانہ (پنجاب) میں رہتے ہوئے لکھا ہے۔

تاہم کوئی بھی انسان خطاء اور نسان سے منزہ نہیں؛ اس لیے زیرِ نظر کتاب میں بہت سی خامیاں — جو ایک مبتدی مؤلف کی ترتیب و تالیف میں یقینی سی ہیں — ہوں گی، توجہ دلانے پر ان شاء اللہ دُور کر دی جائیں گی۔ اس سلسلے میں اہلِ علم حضرات کے مشورے بندۂ خاکسار کے لیے تشکر و امتنان کا باعث ہوں گے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ احقر کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور امتِ مسلمہ کے لیے نافع اور احقر کے لیے ذریعۂ نجات بنائے۔

نیز شکر گزار ہوں اُن احباب کا جنھوں نے اس شرح کی تکمیل میں کسی نہ کسی حیثیت سے تعاون کیا، اللہ تعالیٰ اُن کو اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ آمین! یا رب العالمین!!

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

بندہ عاصی

محمد ریحان القاسمی کشن گنجوی

بروز بدھ ۲۸ رجمادی الاولیٰ ۱۴۴۲ھ

موبائل نمبر: 7302124171

○❖○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب

(مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند)

الحمدُ لِلّٰہِ و کفٰی، و الصَّلاۃُ و السَّلامُ علیٰ عِبادِہِ الَّذِینَ اصطفٰی. أمّا بعدُ!

دورِ حاضر میں ہر علم وفن پر بیشمار کتب آئے دن منظرِ عام پر آ رہی ہیں۔ علم حدیث پر بھی بہت کچھ کام ہو رہا ہے۔ اُردو کا دامن بھی اس مبارک علم کے متعلقات سے پوری طرح معمور اور بھرپور ہے۔ حدیث کے ذخیرہ کو متعلقات کے حوالے سے مزید وسیع تر بنایا جا رہا ہے۔ اور شروح بھی سامنے آ رہی ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک سنہری کڑی ''التیسِیرُ المُمَجَّد شرح اُردو مُوطّا إمَامِ مُحَمَّدٌ'' ہے، جس کو مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کے ایک نوجوان فرزند مولوی محمد ریحان سلمہ نے تیار کیا ہے۔ یہ اُن کی خوش بختی ہے کہ ربّ کریم کی توفیق نے انھیں حدیث پاک علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے خدمت گذاروں کی صف میں شامل کر دیا۔

احقر نے کتابِ مذکور کے چند مقامات کا مطالعہ کیا، جس کی بنا پر میری رائے میں یہ ایک لائقِ اعتماد شرح ہے، جس سے طلبہ اور علماء بغیر کسی تردّد کے استفادہ کر سکتے ہیں۔

موصوف نے حدیث پر اعراب کے ساتھ ان کا سلیس ترجمہ بھی کر دیا ہے۔ تشریحِ احادیث اور نقلِ مذاہب میں بیانِ دلائل کا بھی اہتمام کیا ہے۔ مراجع اور مصادر کی بھی خوب نشاندہی کر دی ہے۔ غرضیکہ آں موصوف نے کتاب کو ہر طرح بہتر بنانے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں الحمد للہ کامیاب ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شارح کے علم وعمل میں از حد جلا بخشے۔ مزید حوصلہ دے۔ اور شرح کو قبولِ عام عطا فرما کر عزیز موصوف کو اجر جزیل عنایت فرمائے۔ آمین!

محمد ابوالقاسم نعمانی خادم دارالعلوم دیوبند

۲۳ ربیع الاوّل ۱۴۴۳ھ

تقریظ حضرت مولانا مفتی عمران اللہ صاحب قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دارالعلوم دیوبند میں تعلیم وتعلّم کے نظام کو عمدہ اور بہتر بنانے پر ہمیشہ توجہ برتی گئی۔ نصاب میں کتب درسِ نظامی کو اختیار کرتے ہوئے کچھ مفید اور ضروری اضافے کی بھی اس میں گنجائش باقی رکھی گئی۔ درسِ نظامی میں اگرچہ ہرفن کی بہترین اور مفید کتابیں شامل تھیں، اکابرین دارالعلوم نے حدیث شریف کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اور طلبہ میں حدیث شریف سے مناسبت پیدا کرنے کے مقصد سے صحاحِ ستہ، موطا امام مالک اور موطا امام محمد کو بھی نصاب کا حصہ بنایا۔ پھر اُن کتب حدیث کی تحقیق ودرایت کے ساتھ تدریس کا نظام بنایا، چنانچہ دارالعلوم دیوبند میں کتب حدیث اور دیگر تمام فنون کی کتابوں کا درس معیاری اور امتیازی شان کا حامل ہوتا ہے۔ دارالعلوم سے مربوط مدارس میں بھی یہی نہج کیا جاتا ہے۔ نتیجتاً طلبہ میں علمی رسوخ، فنی مہارت اور تدقیق وتحقیق کا مزاج پیدا ہوجاتا ہے، جو اکابر کے خلوص، اساتذہ کی فنی مہارت، محنت، لگن اور معیاری طرز کا نتیجہ ہے۔ نیز دارالعلوم کے فضلاء تعلیم کی تکمیل کے بعد دین اسلام کی اشاعت وتبلیغ اور علومِ اسلامیہ کی نشرواشاعت میں مصروف ہوجاتے ہیں اور حسب ذوق وصلاحیت خدمات انجام دیتے ہیں، چنانچہ فضلائے دیوبند نے ہردور میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ تصنیف وتالیف کے میدان میں تفسیر، اصولِ تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، منطق وفلسفہ وغیرہ ہرفن میں انھوں نے خامہ فرسائی کی ہے اور اپنے افادات ونکات سے فنون کا دامن مالا مال کردیا اور فن حدیث وفقہ کی طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ فن حدیث میں علمائے دیوبند کی وقیع خدمات کا عالمی سطح پر اعتراف کیا گیا، جب کہ شروحِ حدیث اور

متعلقاتِ حدیث میں بعض کتب کو اس قدر مقبولیت ملی کہ وہ مرجع خاص وعام قرار پائیں۔
الغرض تصنیف وتشریح علماءِ دیوبند کا خصوصی مشغلہ اور اُن کی دل چسپی کا میدان ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں حسب موقع نصاب پر غور وخوض ہوتا رہتا ہے اور مفید پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تغیر وتبدیلی اور اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ سالِ گذشتہ دورۂ حدیث کے نصاب میں چند جزوی ترمیمات کی گئی جس میں موطا امام محمد کے سلسلے میں طے پایا کہ پہلے اس کا ''کتاب الطہارۃ'' پڑھایا جاتا تھا، اب اس کا کتاب النکاح شامل درس کیا جائے، چنانچہ اب موطا امام محمد کا ''کتاب النکاح'' پڑھایا جاتا ہے۔ یہ حصہ طلبہ کے لئے نیا ہے، طلبہ کو اس حصے کے متعلقات کی تلاش رہتی تھی تاکہ اُن سے استفادہ کرکے درس وتدریس میں بصیرت حاصل کریں۔

عزیزم مولوی محمد ریحان قاسمی (فاضل دارالعلوم دیوبند) نے اسی ضرورت کو محسوس کیا اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے قلم اُٹھالیا، اس طرح یہ کتاب ''التَّیسِیرُ المُمَجَّد شرح اُردو موطا امام محمد'' آپ کے سامنے ہے۔ مولوی محمد ریحان نے اپنی اس شرح میں حدیث با اعراب، محاوری ترجمہ، ہر مسئلہ کی مکمل وضاحت، تمام ائمہ کے مذاہب مع دلائل اور احناف کی نسبت ان کے جوابات نقل کرتے ہوئے کتاب کو مفید اور معتبر بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ موصوف کی پہلی علمی کاوش ہے جس پر وہ بجا طور پر حوصلہ افزائی اور شکریہ کے مستحق ہیں۔ موصوف نے معتبر اور مستند کتب سے استفادہ کرکے ہی لکھنے کی کوشش کی ہے، اس لئے کتاب کی معتبریت یقینی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو قبول فرمائے اور اس کا نفع عام فرمائے۔ آمین!

(مفتی) عمران اللہ قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند
۴ ربیع الثانی ۱۴۴۳ھ

نظر ثانی وتصحیح حضرت مولانا محمد صادق صاحب دولت پوری
سابق استاذِ حدیث وتفسیر جامعہ اسلامیہ عربیہ مرادیہ مظفرنگر (یوپی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ العالَمِين، والصَّلاةُ والسَّلامُ علٰى رَسُولِهِ الكَرِيم، وَ علٰى آلِهِ وَ أصحابِهِ والَّذِين اتَّبَعُوهُم بإحسَان إلٰى يومِ الدِّين. أمَّا بَعـدُ!

عزیز گرامی قدر مولوی مفتی محمد ریحان سلمہ از ہر ہند دارالعلوم دیوبند کے ایک ذی استعداد اور سعادت مند طلبۂ کرام میں سے ہیں۔ عزیز موصوف کی علمی لگن، جدوجہد اور اساتذۂ کرام کے اعتماد سے بجا طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ عزیز موصوف مستقبل میں موفق علمائے کرام واعیان کی فہرست میں نمایاں مقام حاصل کریں گے ان شاء اللہ، کیونکہ مسلسل مطالعہ اور تحقیق وجستجو ان کا مزاج ہے۔

آں عزیز کی تحریر کردہ کتاب "التَّيسِيرُ المُمَجَّد شرح اُردو موطا امام محمدؒ" کا مسودہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ بندے سے نظر ثانی کی درخواست کی گئی، تو بندے نے اس درخواست کو بحسن وخوبی قبول کرلیا اور از اوّل تا آخر اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ اور جہاں جہاں غلطی اور تصحیح کی ضرورت محسوس ہوئی بندے نے بحسن وخوبی اس کام کو انجام دیا اور کتاب کے تعلق سے کچھ مفید مشوروں سے نوازا تو انھوں نے میرے مشوروں کو بشاشت کے ساتھ قبول کرلیا۔

موصوف نے بڑی عرق ریزی اور محنت شاقہ کے ساتھ اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔ بندہ عاصی اس اہم علمی خدمت کی انجام دہی پر مفتی محمد ریحان قاسمی کو مبارکباد پیش کرتا ہے اور بارگاہِ الٰہی میں دست بستہ دعا کرتا ہے کہ اللہ رب العزت والجلال اس کتاب کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور وابستگانِ علم حدیث کو اس کتاب سے مستفید فرمائے۔

عزیز موصوف کو علوم نافعہ سے بہرہ ور فرما کر تاعمر دین حمید کی خدمت کے لئے قبول فرمائے۔ آمین! یارب العالمین!! وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

بندہ عاصی محمد صادق دولت پوری، ۶ / ربیع الثانی ۱۴۴۳ھ بروز جمعہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعائیہ کلمات

والد محترم حضرت مولانا مفتی ابوالکلام صاحب قاسمی

سابق استاذ مدرسہ انوار العلوم بھیکم پورہ فرخ آباد (یوپی)

الحمدُ لِوَلِیِّه، والصَّلاةُ والسَّلامُ علٰی نَبِیِّه وآلِه وصحبِه. أمّا بعدُ!

حدیث نبوی علٰی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی خدمت کسی بھی نوعیت سے ہو، بڑی سعادت اور انسان کی فلاحِ دارین کا ذریعہ ہے۔ بڑی مسرت کی بات ہے کہ میرے لختِ جگر دارالعلوم دیوبند کے فاضل عزیزم مفتی محمد ریحان قاسمی کشن گنجی نے اسی کوچۂ سعادت میں قدم رکھنے کی ہمت کی ہے۔ اور حدیث پاک کی مشہور ومقبول کتاب موطا امام محمد کو اپنی محنت کا موضوع بنا کر اس کی شرح "التَّیسِیرُ المُمَجَّد" کے نام سے پیش کر رہے ہیں۔

مصنفہ مفتی محمد ریحان کا مسودہ نظر سے گذرا۔ بالتفصیل مطالعے کا موقع نہ مل سکا، البتہ جستہ جستہ بعض مقامات کا مطالعہ کیا اور اس پر اپنا تاثر یہ ہے کہ یہ شرح بعض اعتبار سے ایک منفرد شرح ہے اور ہر مسئلے پر سیر حاصل بحث کر کے تمام فقہاء کے اختلافات اور ان کے دلائل اور ان کے دلائل کے جوابات دینے کے بعد احناف کے مسلک کو خوب مدلل کیا ہے۔ متن پر اعراب کے ساتھ ترجمہ سلیس اور بامحاورہ ہے۔ یہ عزیز موصوف کی پہلی علمی کاوش ہے اور طلبائے علومِ دینیہ کے لئے ایک نادر تحفہ ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ عزیز موصوف کو مزید علمی کام کے لیے قبول فرمائے اور اس کی شرح کو قبولِ عام عطا فرمائے۔ آمین! ثم آمین!!

محمد ابوالکلام قاسمی غفرلہ

۱۴ ربیع الاوّل ۱۴۴۳ھ

صاحب کتاب امام محمدؒ کے حالات

نام ونسب

ابوعبداللہ کنیت، نام: محمد، والد کا نام حسن، اور دادا کا نام فرقد ہے اور شیبانی جزیرۂ شام میں جگہ ہے، اس کی طرف منسوب ہے۔

ولادت

آپ کی ولادت ۱۳۲ھ مقامِ ''واسط'' میں ہوئی، پھر اس کے بعد والدین کوفہ منتقل ہوگئے۔

تحصیل علم

۱۳-۱۴ ر سال کی عمر میں امام ابوحنیفہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلسل چار سال خدمت میں رہ کر علم حاصل کیا۔ امام ابوحنیفہؒ کے بعد امام ابو یوسفؒ، اوزاعی، مسعر، سفیان ثوری اور امام مالکؒ وغیرہ علماء سے بھی علم حاصل کیا۔ امام محمدؒ تین سال امام مالک کی خدمت میں رہے۔

امام محمدؒ خود فرماتے ہیں: اَقمتُ علٰی بابِ مالكٍ ثلاث سِنين أو أكثرَ، وسمِعتُ منهُ سبع مائة. (کردری، ص: ۱۶۰) ترجمہ: میں امام مالک کے دروازے پر تین سال رہا، یا اس سے کچھ زیادہ۔ اور اس مدت میں میں نے سات سو حدیثیں سنیں۔

ذہانت

آپ کی ذہانت کی آپ کے تمام ہی اساتذہ نے تعریف کی۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ: مشرق سے اس نوجوان (امام محمد) جیسا عقلمند آدمی میرے پاس کوئی نہیں آیا۔ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے امام محمد کے بارے میں لکھا: وَ کانَ مِن أذکِیاءِ العالَم. دنیا کے عقلمند ترین انسانوں میں سے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے قرآن کے حفظ کرنے کو فرمایا تو انھوں نے سات دن میں پورا قرآن حفظ کرلیا۔

درس وتدریس

ابھی عمر بیس سال کی ہی تھی کہ درس دینا شروع کردیا اور پھر اقصائے عالم کے گوشہ گوشہ سے تشنگانِ علم آکر اس چشمے سے سیراب ہونے لگے۔

(مناجاتِ کرزدری، ج:۲، ص:۱۶۲)

تلامذہ

آپ کے تلامذہ کی تعداد بے شمار ہے، جن کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں: امام شافعیؒ، ابوعبیدہ، قاسم بن سلام، اسد بن فرات، یحییٰ بن معین، شعیب بن سلیمان، علی بن صالح المبرجائی، ابوزکریا صمی بن صالح، موسیٰ بن نصیر رازی، محمد بن سماعہ، شیخ بن جریر، ہشام بن عبید اللہ وغیرہ۔

(معالم الایمان، ج:۲، ص:۵)

امام محمدؒ نے عورتوں کے لئے رات کا وقت رکھا ہوا تھا۔ عورتیں بھی آکر آپ سے استفادہ کرتی تھیں۔ امام محمدؒ کی عادت یہ تھی کہ اپنے تلامذہ کی مالی امداد بھی خوب فرماتے رہتے تھے۔

ایک مرتبہ اسد بن فرات کو دیکھا کہ وہ تنسری سے پانی پی رہے ہیں، امام محمد

نے اس کی وجہ معلوم کی تو انھوں نے صرف یہ کہا کہ میں مسافر آدمی ہوں، پھر رات کے وقت میں امام محمدؒ نے اپنے خادم کے ساتھ اسّی دینار اُن کو بھجوا دیئے۔

عادات واخلاق

اللہ تعالیٰ نے آپ کی شخصیت کو بہت جامع بنایا تھا۔ اسی اخلاق وعادات کی وجہ سے آپ اپنے ہم عصروں میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان عادات میں چند صفات میں آپ سب سے زیادہ ممتاز تھے:

(۱) سخاوت (۲) بردباری (اپنے مزاج کے خلاف بھی بات سن کر برداشت کر جاتے تھے (۳) جرأت وحق گوئی، آپ کی زندگی میں متعدد واقعات ہیں کہ آپ نے بغیر کسی خوف وخطر کے ہر بات کا اظہار فرمایا۔ (کردری، ج:۲، ص:۱۵۴) (۴) آخرت کا خوف۔ آپ آخرت کے خوف سے بہت ہی زیادہ لرزاں رہتے تھے۔ (۵) عبادت۔ بہت زیادہ عبادت کرنے والے تھے۔ آپ نے رات کو تین حصوں پر تقسیم کیا ہوا تھا۔ ایک حصہ درس وتدریس۔ دوسرا حصہ عبادت۔ اور تیسرا حصہ آرام کے لیے۔

وفات

آخری وقت میں آپ کو قاضی القضا بنا دیا گیا تھا۔ اسی دوران خلیفہ ہارون رشید کو مقام ''رَے'' جانا ہوا۔ ساتھ میں امام محمدؒ بھی تھے، جب مقامِ رَے میں پہنچے تو وہاں ہی ۱۸۹ھ میں ۵۸ برس میں اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

تدفین

مقامِ ''رَے'' میں صیلِ طرک، جو وہاں کا مشہور قلعہ ہے، وہاں اُن کی تدفین

کی گئی۔

تصانیف

اس بات میں شک نہیں کہ آپ کی تصانیف بہت زیادہ ہیں، مگر یہ کہنا کہ اُن کی تعداد ۹۹۹ ر ہے مبالغے سے خالی نہیں۔ اس کا جواب طاش بزدوی نے یہ دیا ہے کہ امام محمد جو کتابیں لکھنا چاہتے تھے اس کی فہرست کی یہ تعداد ہے۔ اگر زندہ رہتے تو یہ سب کتابیں لکھتے۔ ابن نبیل وغیرہ نے آپ کی کتابوں کی تعداد ۲۳ر تک شمار کی ہے۔ بہرحال آپ کی تصنیفی میدان میں ایک ادارے کے برابر تصنیفی خدمت انجام دی ہے۔ آپ کی تصانیف میں سے یہ چند کتابیں زیادہ مشہور ہیں:

(۱) مبسوط (۲) جامع صغیر (۳) جامع کبیر (۴) زیادات
(۵) کتاب الحج (۶) سیر صغیر (۷) سیر کبیر (۸) رقیات وغیرہ۔

اور یہی کتابیں فقہ حنفی کی اصل الاصول خیال کی جاتی ہیں، چونکہ امام صاحب کے مسائل روایۃً ان میں مذکور ہیں۔ کل مسائل جو آپ نے قرآن وحدیث کی روشنی میں استنباط کیے ہیں دس لاکھ ستر ہزار ایک سو (۱۰۷۰۱۰۰) ہیں۔

موطا امام محمد

حدیث میں امام محمدؒ کی یہ سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے زیادہ تر امام مالکؒ سے سنی ہوئی روایات کو جمع کیا ہے۔

موطا کتاب کی وجہ تسمیہ

موطا: یہ توطئة کا مفعول ہے۔ اہلِ لغت لکھتے ہیں کہ اس کے معنی: روندنے، نرم

اورآسان کرنے میں آتا ہے۔تو موطا کا معنی: روندا ہوا، تیار کیا ہوا، نرم کیا، بنایا ہوا۔

کتاب کا نام موطا اس لئے رکھا گیا کہ اس کتاب میں لوگوں کے لئے احادیث اور مسائل نرم اور آسان طریقے سے بیان کئے گئے ہیں۔

درحقیقت موطا امام محمد یہ موطا امام مالک ہی ہے۔امام مالک سے اُن کے شاگردوں نے موطا لکھی، جو تیس طریقوں سے مروی ہے، کیونکہ ہر ایک کے لکھنے میں کچھ نہ کچھ کمی بیشی ہوتی رہی، ان میں سے سولہ نسخے زیادہ مشہور ہیں۔ پھر اُن سولہ میں سے چند نسخے زیادہ مشہور ہیں۔

(۱) یحییٰ بن بکرؒ (۲) ابومصعبؒ (۳) ابن وہبؒ (۴) امام محمدؒ۔

سب سے زیادہ موطا مالک کا جو نسخہ مشہور ہوا وہ یحییٰ بن یحییٰ اندلسی الرمی (۲۰۴ھ) کا ہے۔شرح لکھنے والوں نے اسی نسخے کو سامنے رکھ کر شرح لکھی ہے۔ چونکہ یحییٰ بن یحییٰ یہ امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، اس لئے ان کا نسخہ زیادہ معتبر مانا جاتا ہے۔

دوسرا نسخہ

دوسرا نسخہ موطا کا جو مشہور ہوا وہ امام محمد بن حسن الشیبانی (متوفی: ۱۸۹ھ) کا لکھا ہوا ہے۔امام محمد نے امام مالک کی خدمت میں تین سال رہ کر یہ نسخہ لکھا۔

موطا امام محمد کہنے کی وجہ

سوال یہ ہوتا ہے کہ موطا امام محمد یہ موطا امام مالک ہی ہے تو پھر اس کا یہ الگ نام کیوں رکھا گیا؟

جواب: امام محمدؒ نے اپنی موطا میں بہت سے آثار وروایات اور مسائل کو امام

مالک کے علاوہ دوسرے حضرات سے بھی نقل کیا ہے، اس لئے اس کو مجازاً امام محمد کی طرف منسوب کرتے ہوئے ''موطا محمد'' کہہ دیا جاتا ہے۔

موطا امام محمد میں روایات کی تعداد

موطا امام محمد میں احادیث مرفوعہ، موقافاتِ صحابہ، مسند و مرسل روایات کی تعداد گیارہ سو پچاسی (۱۱۸۵) ہے، ان میں سے ایک ہزار پانچ (۱۰۰۵) تو امام مالک سے مروی ہیں۔ اور پچھتر (۷۵) دوسرے احباب سے ۔ اُن میں تیرہ (۱۳) امام ابوحنیفہ سے، چار (۴) امام ابو یوسف سے اور کچھ دوسرے احباب سے مروی ہیں۔

موطا امام محمد کی چند خصوصیات

(۱) سب سے پہلے ترجمۃ الباب یعنی باب کا مضمون قائم کرتے ہیں، پھر اس ضمن میں امام مالکؒ سے مرفوع یا موقوف روایت کو لاتے ہیں اور وہ لفظِ حدیث کے بجائے عموماً لفظِ اثر استعمال کرتے ہیں اور لفظِ اثر سے مرفوع اور موقوف دونوں طرح کی روایتیں نقل کرتے ہیں۔

(۲) ہر عنوان کی ابتداء باب یا کتاب سے اور کبھی کبھار لفظ ابواب سے کرتے ہیں۔ جس جگہ نسخوں کا اختلاف دکھلانا مقصود ہوتا ہے وہاں پر لفظ ''فصل'' لکھ دیتے ہیں۔

(۳) ایک مضمون کی ایک یا چند حدیثیں نقل کرنے کے بعد فاَخُذ یا بھٰذا نأخُذُ کہہ کر اپنے مسلک کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(۴) لفظ اخبرنا اور حدثنا میں کوئی فرق نہیں کرتے، جبکہ دوسرے محدثین فرق کرتے ہیں۔ امام محمدؒ اپنے شیوخ کی ہدایات کے نقل کرنے میں زیادہ تر لفظ اخبرنا کا

استعمال کرتے ہیں۔شیوخ سے اوپر کے لوگوں کے لئے لفظ ''حدثنا'' استعمال کرتے ہیں۔

(۵) اپنی رائے کے ذکر کرنے کے بعد کبھی کبھار آخری میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے کو بھی وَ هُوَ قَولُ أَبِي حَنِيفَةَ کہہ کر ذکر کر دیتے ہیں۔اور امام ابوحنیفہ کی رائے کے ساتھ ابراہیم نخعیؒ اور کبھی اس کے ساتھ العَامَّةُ مِن فُقَهائنا بھی کہتے ہیں، جس سے مراد کوفہ، عراق کے تمام فقہاء کی رائے کا ذکر کرنا مقصود ہوتا ہے۔

(۶) کئی مسائل کے بارے میں ''ہذا حسن، جمیل، مستحسن'' وغیرہ کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ان الفاظ سے مراد سنتِ مؤکدہ اور کبھی سنتِ غیر مؤکدہ بھی مراد لیتے ہیں۔اور جب يَنبَغِي کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو وہاں پر مراد سنتِ مؤکدہ یا واجب ہوتا ہے۔اور جب لَا بأس کا لفظ استعمال کرتے تو اس سے مراد اس حکم کا جواز بتانا ہوتا ہے۔

(۷) اگر حدیث غیر مستند ہے تو اس کے لئے وہ لفظ ''بلغنا'' کا استعمال کرتے ہیں۔اس کو محدثین کی اصطلاح میں ''بلاغیات'' کہتے ہیں۔اور علامہ شامیؒ نے امام محمدؒ کے بلاغیات کے بارے میں لکھا ہے: إنَّ بلاغاته مُستنده. کہ امام محمد کی بلاغیات مستند ہوتی ہیں۔

(۸) موطا امام محمد میں کوئی موضوع حدیث نہیں ہے۔اگرچہ ضعیف روایات موجود ہیں، مگر ان ضعیف روایات کو وہ متابعات یعنی اس جیسی متعدد روایات کو بیان کر دیتے ہیں، جس سے اس کا ضعف ختم ہو جاتا ہے۔

(مقدمہ موطا امام محمد، تالیف: مولانا عبدالحئی فرنگی محلّی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نکاح کی ضرورت واہمیت

دنیا کو آباد رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مرد وعورت کے درمیان فطری طور پر کشش رکھی ہے، اب اس کشش کے تقاضوں پر مطلقاً بند لگا دینا جس طرح خلافِ فطرت اور ناقابل عمل ہے، اسی طرح اس عمل کو بے لگام کر دینا بھی سخت فتنہ اور فساد کا سبب ہے، کیونکہ اگر صرف شہوت رانی کو مقصود بنایا جائے گا اور کسی ذمہ داری کے بغیر موج ومستی کی اجازت دے دی جائے گی تو انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہے گا اور نسل انسانی کی نگہداشت اور تربیت کی نازک ذمہ داری کوئی شخص اٹھانے کو تیار نہ ہوگا اور مغربی تصور کے مطابق صنفِ نازک "استعمال کرو اور پھینک دو" کے مقولہ کا مصداق بن جائے گی، جیسا کی آج یوروپ کا حال ہے کہ وہاں ناجائز رشتوں سے پیدا ہونے والوں کی کثرت نے انسانی معاشرہ سے سکون چھین لیا ہے اور انسانیت کو ضیق اور تنگی میں مبتلا کر دیا ہے لہٰذا معتدل اور قابل عمل راستہ یہی ہے کہ انسان کے فطری جنسی تقاضوں کا رخ پاکیزہ راستوں کی طرف موڑ دیا جائے اور ناپاک ذرائع پر پابندی لگا دی جائے، اسی بنا پر اسلام میں خصوصیت کے ساتھ نکاح کی تاکید کی گئی ہے۔ اور تجربہ سے یہ بات صادق آتی ہے کہ نکاح عفت و پاکیزگی کا سب سے بڑا ذریعہ اور وساوسِ شیطان کو دفع کرنے میں سب سے زیادہ مؤثر ہے، اسی کے ساتھ دنیا کی آبادی اور "عالمی امن" کی برقراری کا سبب اور انسان کی اہم ترین ضرورت بھی ہے۔

نکاح کی اہمیت ان احادیث سے واضح ہوتی ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے نوجوانو! تم میں سے جو نکاح کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے اسے نکاح کر لینا چاہئے کیونکہ نکاح نگاہ کو نیچی رکھتا ہے اور شرمگاہ کی حفاظت کرتا ہے۔ اور جو نکاح کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا ہے اسے چاہیے کہ شہوت کا زور توڑنے کے لیے وقتاً فوقتاً روزہ رکھے''۔

(صحیح بخاری، جلد:۲، صفحہ:۷۵۷)

نکاح کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی شریعتیں اُتاریں سب میں ''نکاح'' کو اہمیت حاصل رہی ہے، اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ: ایمان اور نکاح کے علاوہ ایسی کوئی عبادت نہیں جو ''از آدم تا ایں دم'' مشروع رہی ہو اور جس کا سلسلہ جنت میں بھی باقی رہے۔

نکاح کی لغوی تحقیق

لفظ ''نکاح'' لغت میں ضم اور ملنے کو کہتے ہیں۔ اور ثقب (سوراخ) کو بھی کہتے ہیں۔ نکاح میں دونوں مفہوم موجود ہیں۔ شاعر ساحر ابوطیب کہتا ہے:

اَنْسَاعُهَا مَمْغُوطَـةٌ مَنْكُوحَةٌ وَ طَرِيقُهَا عَذْرَاءُ

اس شعر میں ''مَنكُوحَة'' لفظ زخم اور سوراخ کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

''نکاح'' کے لفظی معنیٰ ''وطی'' کے بھی ہیں اور ''عقد'' کے بھی۔ پھر بعض نے پہلے معنیٰ کو حقیقت اور دوسرے کو مجاز قرار دیا ہے، كَمَا هُوَ مَذْهَبُ الحنفِيَّة. اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے، یعنی عقد کے معنیٰ میں حقیقت اور وطی کے معنیٰ میں مجاز، كَمَا هُوَ مَذْهَبُ الشَّافِعِيَّـة.

نکاح کی اصطلاحی تعریف

عربی میں نکاح کی تعریف فقہائے کرام کے یہاں اس طرح کی جاتی ہے:

اَلنِکَاحُ هُوَ عَقدٌ وُضِعَ لِتَملِيكِ المُتعَةِ بِالأُنثٰى قَصدًا.

اور اُردو میں تعریف اس طرح کی جاتی ہے: ''نکاح اس عقد اور اس معاہدہ کا نام ہے جو مرد اور عورت کے درمیان قرار پاتا ہے، جس سے اُن دونوں کے درمیان زوجیت کے تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ (التعریفات، ج:۱، ص:۸۱)

مختلف حالات میں نکاح کا حکم

انسان کے حالات کے اعتبار سے نکاح سے متعلق احکام بھی مختلف ہو جاتے ہیں، یعنی فرض، واجب، سنت، حرام اور مکروہ۔

نکاحِ فرض: اگر مرد بیوی کے مہر اور نان ونفقہ نیز دیگر حقوقِ زوجیت ادا کرنے پر قادر ہے اور ساتھ ہی اسے یقین ہے کہ اگر وہ نکاح نہیں کرے گا تو بدکاری میں مبتلا ہو جائے گا تو ایسی صورت میں ایسے شخص پر نکاح کرنا فرض ہے۔

فإنْ تَيَقَّنَ الزِّنَا إلاَّ بِهٖ فَرضٌ، أيْ بأنْ كانَ لاَ يُمكِنُهُ الاحتِرازُ عَن الزِّنَا إلاَّ بِهٖ فَرضٌ. (البحر الرائق، ج:۳، ص:۱٤٠)

نکاحِ واجب: اگر مرد بیوی کے مہر اور نان ونفقہ اور دیگر حقوق ادا کرنے پر قادر ہے اور ساتھ ہی اسے غالب گمان یہ ہے کہ اگر نکاح نہیں کرے گا تو مبتلائے معصیت (بدنظری) ہو جائے گا تو اس پر نکاح کرنا واجب ہے۔

نکاحِ سنت: جو شخص اعتدال کی حالت میں ہو، یعنی نان ونفقہ پر قادر ہو اور بیوی کے جملہ حقوق ادا کرسکتا ہو، لیکن اس کے دل میں ایسا تقاضہ نہ ہو کہ نکاح کے بغیر معصیت میں مبتلا ہونے کا یقین یا اندیشہ ہو تو ایسے شخص کے لیے نکاح کرکے

باعصمت زندگی گذارنا سنت مؤکدہ ہے۔ وَ يَسُنُّ مُؤَكَّدًا حالَةَ الاعتِدالِ وَ هُوَ الأصحُّ. (مجمع الأنهر، ج:١، ص:٤٦٧)

نکاحِ حرام: جو شخص بیوی کے مہر ونفقہ ودیگر حقوق ادا کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، یا اس کو خود اپنے مزاج وفطرت کی وجہ سے یقین ہے کہ وہ بیوی پر ظلم وزیادتی کرے گا تو اس کے لیے نکاح کرنا حرام ہے۔ فإنْ تيقَّنَهُ أي تيقَّنَ الجورُ حَرامٌ. (البحرالرائق، ج:٣، ص:١٤٠)

نکاحِ مکروہ: اگر مرد کو اپنی ہونے والی بیوی پر ظلم وزیادتی کا یقین تو نہیں ہے؛ مگر ظن غالب ہے، تو ایسی صورت میں نکاح کرنا مکروہِ تحریمی ہے۔ وَ مَكرُوهًا لِخَوفِ الجَورِ. (شامي، ج:٤، ص:٦٦)

وَ هُوَ فِي حَالَةِ التَّوقَانِ واجِبٌ، لأنَّ التحرُّزَ عَنِ الزِّنَا وَاجِبٌ وَ هُوَ لاَ يَتِمُّ إلَّا بالنِّكَاحِ، وَ فِي حَالَةِ الاعتِدالِ مُستَحَبٌّ، وَ فِي حَالَةِ الخَوفِ الجَورِ مَكرُوهٌ. (العناية، ج:٤، ص:٣١٤)

شرائط نکاح

ایک مسلمان کے نکاح کے لیے شرط یہ ہے کہ مجلس عقد میں دو گواہ موجود ہوں اور ان دونوں گواہوں میں آزاد ہونا، بالغ ہونا، عاقل ہونا اور مسلمان ہونا شرط ہے، اگر یہ دونوں گواہ مرد نہ ہوں؛ بلکہ ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، گواہ عادل ہوں یا عادل نہ ہوں تب بھی نکاح منعقد ہو جائے گا۔

کیا بغیر گواہوں کے نکاح منعقد ہو جائے گا؟

اس بارے میں دو مذہب ہیں: (۱) حضرت امام مالکؒ کے نزدیک گواہوں کا ہونا شرط نہیں ہے؛ بلکہ وہ صرف اعلان کو ہی کافی سمجھتے ہیں۔ (۲) جمہور کا مسلک

یہ ہے کہ بغیر گواہوں کے نکاح منعقد نہیں ہوتا۔

امام مالکؒ کی دلیل: زنا سرا ہوتا ہے جس کا تقاضہ یہ ہے کہ نکاح اعلانیہ ہو؛ تا کہ دونوں میں امتیاز ہو جائے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سرًا نکاح کی ممانعت ثابت ہے، حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: إنَّ النبيَّ ﷺ نَهٰى عَن نِكاحِ السِّرِّ. (مجمع الزوائد، ج: ٤، ص: ٢٨٥)

جواب: نکاح السر کا مصداق وہ نکاح ہے جس میں گواہ نہ ہوں اور جس نکاح میں گواہ موجود ہوں وہ نکاح اعلانیہ ہے، نہ کہ نکاحِ سر۔

جمہور کی دلیل: حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلبَغَايَا اللاّتِي يَنكِحنَ أنفُسَهُنَّ بِغَيرِ بَيِّنَةٍ. (ترمذي، ج: ١، ص: ١٣١) زانی وہ ہے جو اپنا نکاح بغیر گواہ کے کرے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بغیر گواہ کے نکاح نہیں ہوگا۔

نکاح کے مستحبات

(۱) مستحب یہ ہے کہ آدمی پہلے مخطوبہ منسوبہ عورت کو دیکھ لے، دونوں جانب سے تمام احوال کو ٹٹولا جائے، کیونکہ یہ عمر بھر کا سودا ہے۔

(۲) یہ بھی مستحب ہے کہ بیوی عمر میں کم ہو، شان وشوکت میں کم ہو اور مال میں بھی کم ہو؛ تا کہ شوہر کو غلام نہ بنائے۔

(۳) یہ بھی مستحب ہے کہ عورت خوبصورتی میں شوہر سے زیادہ ہو، سنجیدگی، حلم وادب اور وقار وتحمل میں شوہر سے زیادہ ہو اور کنواری ہو۔

(۴) یہ بھی مستحب ہے کہ نکاح اعلانیہ ہو، دونوں طرف سے بزرگ حضرات کھلے مقام یا مسجد میں تقریب میں شریک ہوں۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی مستحبات ہیں۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ردالمحتار، ج:۴، ص:۷۷)

نکاح میں اشتغال محض نفلی عبادت میں مشغولی سے افضل ہے

نکاح کے مشاغل (بیوی بچوں کی ضروریات پوری کرنا وغیرہ) میں لگنا محض نفلی عبادات انجام دینے سے افضل ہے، کیونکہ نکاح کے نتیجے میں بے شمار حقوق وفرائض وابستہ ہوجاتے ہیں جن کی ادائیگی میں مشقتیں بے شمار جھیلنی پڑتی ہیں اور قاعدہ ہے کہ محنت کے بقدر ہی ثواب میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

إنَّ الاشْتِغالَ بِه أَفضَلُ مِن التخَلِّي لِنَوافِلِ العِبادَاتِ أي الاشتِغالُ بِه، وَ مَا يَشتَمِلُ عَلَيهِ مِن القِيامِ بِمَصَالِحَة وإعفَافِ النَّفسِ عَنِ الحَرامِ وَ تَربِيَةِ الوَلَدِ وَ نَحوِ ذَلِكَ. (شامی، ج: ٤، ص: ٥٧)

نکاح کے فوائد

(۱) جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے نیک اعمال کا سلسلہ اور عبادات کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے؛ لیکن ایمان ونکاح دو ایسی عبادتیں ہیں جن کا سلسلہ دنیا سے لے کر جنت تک باقی رہتا ہے، کہ جس طرح دنیا میں نکاح کے ذریعہ ازدواجی زندگی کا تعلق رہتا ہے اسی طرح جنت میں بھی میاں بیوی کی رفاقت کی زندگی کا سلسلہ جاری رہے گا۔

(۲) نکاح کے ذریعہ جہاں بدنگاہی اور بدخیالی سے حفاظت ہوتی ہے وہیں شرمگاہ کی بھی حفاظت ہوجاتی ہے اور حرام کاری و بدکاری سے بچ کر عفت و پاکدامنی کی زندگی نصیب ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں ایک پاکیزہ اور صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ (درسِ ترمذی، ج:۳، ص:۴۲۵)

(۳) نکاح میں توالد وتواصل عمدہ طریقے پر ہوتا ہے، برخلاف بدکاری کے، اس لیے کہ اس نکاح میں ایک طرح کی خاص محبت ہوتی ہے اور دونوں مل کر بچوں

کی تعلیم و تربیت میں کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے اُمید کی جاتی ہے کہ بچوں کی اعلیٰ تربیت ہو جائے۔

(۴) نکاح کے ذریعہ جب نیک اولاد حاصل ہوتی ہے تو اس سے برکت کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔

(۵) اولاد کی عمدہ تربیت کر کے اسے بڑھاپے کے دست و باز و بناتا ہے۔

(۶) نکاح کے ذریعے انسان وقت کا پابند ہو جاتا ہے، مستعدی کے ساتھ کمانے اور حصولِ معاش کی فکر کرتا ہے اور کفایت شعاری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا عادی بن جاتا ہے۔

(۷) نکاح کے ذریعے نسب کی حفاظت ہوتی ہے، چنانچہ اگر یہ نظامِ الٰہی نہ ہوتا تو معاشرے میں ایسے بے شمار بچے بچیوں کی بھرمار ہوتی جن کا نہ تو کوئی نسب ہوتا اور وہ عزت و احترام اور اخلاقِ کریمانہ کے ماتھے پر ایک بدنما داغ بنتے۔

(۸) نکاح کی وجہ سے اُمورِ خانہ داری میں تعاون ملتا ہے، دل کو راحت و جمعیت اور اطمینان وسکون کی دولت ملتی ہے اور اس طرح مرد کو علم و عمل کے لیے فراغت نصیب ہوتی ہے۔ (شامی، ج:۴، ص:۵۷، اسلامی شادی، ص:۲۴)

(۹) بچپن میں فوت ہو جانے والی اولاد کل قیامت کو والدین کی شفیع ہوتی ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب ایک نامکمل بچے کے والدین کو جہنم میں داخل کیا جائے گا تو بچہ اپنے ماں باپ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ضد کرے گا، پھر اسے کہا جائے گا: جھگڑالو بچے! اپنے ماں باپ کو جنت میں لے آ، چنانچہ وہ اپنی ناف کے ذریعے کھینچ کر انہیں جنت میں لے جائے گا۔ (ابن ماجہ، ص:۱۱۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(ب:۱) بَابُ الرَّجُلِ تكُونُ عِندَهُ نِسوَةٌ كَيفَ يَقسِمُ بَينهُنَّ

ایک سے زائد بیویوں کے درمیان باری مقرر کرنے کا بیان

أَخبَرَنَا مَالِكٌ، حَدَّثَنا عَبدُ اللّٰهِ بنُ أَبِي بكرٍ عَن عَبدِ المَلكِ بنِ أَبِي بَكرِ بنِ الحَارِثِ ابنِ هِشَامٍ عَن أَبِيهِ أنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ حِيْنَ بَنٰى أُمَّ سَلَمَةَؓ قَالَ لَهَا حِيْنَ أصبَحَتْ عِنْدَهُ: لَيسَ بِكِ عَلٰى أهْلِكَ هوانٌ، إنْ شِئْتِ سَبَّعْتُ عِنْدَكِ وَ سَبَّعْتُ عِنْدَهُنَّ، وإنْ شِئْتِ ثَلَّثْتُ عِنْدَكِ وَ دُرْتُ، قَالَتْ: ثَلِّثْ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن ابوبکر اپنے والد کا یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ نے سیدہ اُمّ سلمہؓ کے ساتھ شادی کی، تو آپ نے شادی کے اگلے دن صبح اُن سے فرمایا: تم اپنے شوہر کے نزدیک کم حیثیت کی مالک نہیں ہو، اگر تم چاہو تو میں سات دن تمہارے ساتھ رہتا ہوں اور باقی بیویوں کے پاس بھی سات، سات دن رہوں گا۔ اگر تم چاہو تو میں تمہارے ساتھ تین دن رہتا ہوں، پھر باقی بیویوں کے پاس (تین تین دن رہ کے آجاؤں گا)؟ تو سیدہ اُمّ سلمہؓ نے عرض کیا: آپ میرے پاس تین دن رہیں۔

تشریح: **قَولُه:** قَالَ بِهَا حِينَ أصبحتْ عِندَهُ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت اُمّ سلمہؓ سے نکاح فرمایا اور آپ نے ان کے پاس تین دن

قیام فرمایا، پھر جب آپ دوسری ازواج کے پاس جانے لگے تو حضرت اُمّ سلمہؓ نے آپ کا کرتہ پکڑ لیا، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَيسَ بِكِ عَلٰى أهلِكِ هوانٌ.

قولُـهُ: "لَيسَ بِكِ عَلٰى أهلِكِ هَوانٌ" میں "ب" حرفِ جر سببیہ ہے اور "أهل" سے مراد حضرت اُمّ المومنین کا قبیلہ ہے اور "هوانٌ" کا معنی: حقارت وذلت ہے۔ مطلب ہے: لَا يَلحَقُ عَشِيرَتَكِ وَ قَبِيلَتَكِ بِسَبَبِكِ اِحتِقَارٌ وَ مَذَلَّةٌ، کہ تمہارے سبب تمہارے قبیلہ اور خاندان کو حقارت وذلت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

نیز ایک قول یہ ہے کہ حدیث میں "أهل" سے مراد ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اور "بك" میں "ب" "هوان" سے متعلق ہے۔ اب مطلب ہوگا: لَيسَ اِقتِصارِي عَلَى الثَّلاثَةِ لِهَوانِكِ عَلَيَّ وَ لَا لِعَدمِ رَغبَتِي فِيْكِ؛ بَلْ لِأَنَّ حُكمَ الشَّرعِ كَذٰلِكَ، یعنی ہمارا تمہارے پاس تین دن قیام کرنے پر اکتفاء اس وجہ سے نہیں ہے کہ تم ہماری نظر میں حقیر ہو، یا تم سے ہمیں بے رغبتی ہے؛ بلکہ اسکی وجہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ ازواج کے درمیان برابری اور عدل کا لحاظ رکھا جائے۔

اس لیے اگر تم چاہو تو میں تمہارے پاس سات دن رہوں اور دوسری ازواج کے پاس بھی سات، سات دن رہوں؛ تاکہ عدل وانصاف قائم رہے۔ اور اگر چاہو تو تمہارے پاس تین دن تک رہوں اور اس کے بعد دورہ کروں، یعنی دوسری ازواج کے پاس بھی تین تین دن تک رہوں۔ اب بتاؤ تمہیں کون سی صورت پسند ہے؟ حضرت اُمّ المومنین نے "ثلث" کہہ کر دوسری صورت کو اختیار فرمایا تاکہ شرعی ضابطہ کے مطابق بھی ہو اور دن جب کم ہوں گے تو باری جلدی عود کر آئے گی۔

قَالَ مُحمَّدٌ: وَ بِهٰذا نَأخُذُ، يَنبَغِي إنْ سَبَّعَ عِندَهَا أنْ يُسَبِّعَ عِنْدَهُنَّ، لاَ يَزِيْدُ لَهَا عَلَيهِنَّ شَيئًـا. وإنْ ثَلَّثَ عِندَها أنْ يُثَلِّثَ عِندَهُنَّ، وَ هُوَ قَولُ أبِي حَنِيفَةَؒ والْعَامَّةِ مِن فُقَهائِنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں: ہم اس کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں، شوہر کو چاہئے کہ اگر وہ نئی بیوی کے پاس سات دن رہتا ہے تو باقی بیویوں کے پاس بھی سات سات دن گذارے، اس سے زیادہ ان کے ساتھ نہ رہے، لیکن اگر وہ نئی بیوی کے ساتھ تین دن گذارتا ہے، تو باقی بیویوں کے ساتھ بھی تین دن گذارے گا۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد رحمہ اللہ کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ حضرت اُمّ المومنین نے فرمانِ نبوی کا مطلب ''مساوات بین الزوجین اور عدم خصوصیت بین القدیمہ والجدیدہ'' سمجھا، اسی مطلب کو ہم نے لیا اور مسلک کی بنیاد بنایا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر شوہر نئی بیوی کے پاس سات دن قیام کرے تو قدیم بیویوں کے پاس بھی اسے سات سات دن قیام کرنا ہوگا اور نئی بیوی کے لئے کچھ بھی اضافی ایام نہیں ہوں گے۔ اور اگر نئی بیوی کے پاس تین دن رہے تو قدیم بیویوں کے پاس بھی تین دن تک رہے۔

قدیمہ اور جدیدہ کی باری کے مابین اختلافِ ائمہ

جمہور کا مذہب: جمہور کے نزدیک نکاحِ جدید کے بعد نئی بیوی کے دو حق ہیں:

(۱) باری میں پہل کرنا اس نئی دلہن کا حق ہے۔

(۲) اور پھر یہ دن تقسیم سے مستثنیٰ رکھنا بھی اس نئی دلہن کا حق ہے۔ باکرہ کا اعزاز سات دن تک ہے۔ اور ثیبہ کا تین دن تک۔

امام ابوحنیفہؒ کا مذہب: امام صاحب کے نزدیک صرف پہل کرنا اس نئی دلہن کا حق ہے تالیف وتانیس قلب کی غرض سے، اس کے علاوہ کوئی حق اس نئی بیوی کا نہیں؛ بلکہ مساوات بین الزوجات واجب ہے، جس میں باکرہ، ثیبہ، قدیمہ اور جدیدہ کا کوئی فرق نہیں۔

جمہور کی دلیل: حضرت انسؓ کی روایت ہے: مِنَ السُّنَّةِ إِذَا تَزَوَّجَ الرَّجُلُ الْبِكْرَ عَلٰى امْرَأَةٍ أَقَامَ عِنْدَهَا سَبْعًا، وَ إِذَا تَزَوَّجَ الثَّيِّبَ عَلٰى امْرَأَتِهِ أَقَامَ عِنْدَهَا ثَلَاثًا، ثُمَّ قَسَمَ. (ترمذي، ج:١، ص:٢١٦) جمہور فرماتے ہیں کہ: باری مقرر کرنے کے سلسلے میں یہ حدیث واضح ہے، لہٰذا جب باکرہ سے شادی کرے گا تو اس کے یہاں سات روز قیام کرے اور جب ثیبہ سے شادی کرے گا تو اس کے یہاں تین روز قیام کرے۔

جواب: یہ ہے کہ کتاب اللہ کے نصوصِ قطعیہ مطلقہ سے چند بیویوں میں سے ایک کی طرف اختیاری میلان سے امتناع اور قدیمہ اور جدیدہ نیز باکرہ اور ثیبہ کے درمیان تقسیم میں مساوات کا وجوب ثابت ہوتا ہے، اس لئے اگر حدیث انسؓ کے ذریعہ قدیمہ وجدیدہ یا ثیبہ وباکرہ کے درمیان تقسیم میں امتیاز برتا جائے گا، تو کتاب اللہ کے اطلاقِ قطعی کو خبر واحد ظنی سے منسوخ کرنا لازم آئے گا جو درست نہیں ہے۔

احناف کی دلیل: قَوْلُهٗ تَعَالٰى: ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً﴾ (اگر تمہیں ایک سے زائد بیویوں کے درمیان عدل وانصاف نہ کر سکنے کا خوف ہو تو پھر ایک ہی پر اکتفاء کرو۔ النساء:۳)۔ اس حکم میں ایک سے زائد بیویوں کے درمیان عدل وانصاف کی صورت میں قدیمہ وجدیدہ، کنواری اور مطلقہ وغیرہ کے

درمیان کوئی فرق نہیں رکھا، لہٰذا آیتِ مذکورہ کا واضح مفہوم اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہر قسم کی بیوی کے درمیان اوقات کی تقسیم میں برابری ہونی چاہئے۔

دوسری دلیل: ﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ﴾ (النساء:۱۲۹)

(اور تم ایک سے زائد بیویوں کے درمیان ہرگز حقیقتاً برابری نہ کرسکو گے، اگرچہ تم اس کے شدید خواہش مند بھی ہو، لہٰذا ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ تم ان میں سے ایک کی طرف مائل ہو جاؤ اور دوسری کو لٹکا ہوا چھوڑ دو)۔ اس آیت کریمہ میں مرد کو، جو اپنی بیویوں سے قلبی محبت ہوتی ہے، اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ یہ محبت اللہ کی پیدا کردہ ہے، تم اس میں برابری نہ کرسکو گے، ہاں جن باتوں میں تم دو عورتوں کے درمیان برابری کرسکتے ہو اس میں بے انصافی اور زیادتی نہیں ہونی چاہئے۔ نیز اس میں قدیمہ وجدیدہ کے مابین کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا اور بقدرِ امکان عدل ومساوات کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

تیسری دلیل: عَنْ أَبِي هُرَيرةؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وسلَّمَ قَالَ: مَن كانَتْ لَهُ امرأتَانِ، فَمَالَ مَعَ أحدِهِما عَلَى الأخرىٰ، جَاءَ يَومَ القِيَامَةِ وَ وَاحِدٌ شَقَّيْهِ سَاقِطٌ. (أبوداؤد، ج:۱، ص:۲۹۰)

اس حدیث میں جس جھکاؤ کو بیان کیا گیا ہے اس سے مراد انہی اختیاری اُمور میں جھکاؤ ہے، دل میں محبت کی کمی بیشی اور دوسرے غیر اختیاری اُمور مراد نہیں ہیں؛ کیونکہ غیر اختیاری اُمور میں مساوات نہ ہونا اللہ کی طرف سے معاف کر دیا گیا ہے، لہٰذا قدیمہ وجدیدہ کا فرق کئے بغیر رہنے، سہنے، کھانے اور پینے وغیرہ اُمورِ اختیاریہ میں تمام عورتوں کے درمیان عدل وانصاف ضروری ہے۔

(ب:۲) بَابُ اَدنیٰ مَا یَتَزَوَّجُ الرَّجُلُ عَلَیهِ المَرأَةَ

کم از کم حق مہر کی مقدار کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، حَدَّثَنَا حَمِيْدُنِ الطَّوِيلُ عَن أنسِ بنِ مَالِكٍ أنَّ عَبدَ الرَّحمٰنِ بنَ عَوفٍ جاءَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ عَلَيهِ أثرُ صُفرَةٍ، فأخبرَهُ أنَّهُ تزَوَّجَ اِمْرأةً مِنَ الأنصَارِ، قَالَ: كَمْ سُقتَ إلَيْهَا؟ قَالَ: وَزْنُ نواةٍ مِنْ ذَهبٍ. قَالَ: أولِمْ وَ لَوْ بِشَاةٍ.

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بات نقل کرتے ہیں کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان پر زرد رنگ کا نشان موجود تھا، انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو بتایا کہ انہوں نے ایک انصاری خاتون کے ساتھ شادی کرلی ہے، نبی اکرم ﷺ نے دریافت کیا: تم نے اسے کتنا مہر دیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ایک گٹھلی کے وزن جتنا سونا۔ تو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم ولیمہ کرو، خواہ اس میں ایک بکری (ذبح کرکے دعوت کرو)۔

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ شریعت نے مہر کے لیے نہ تو کسی خاص مقدار کو متعین کرکے اسے واجب قرار دیا ہے اور نہ اس کی زیادہ سے زیادہ کوئی حد مقرر کی گئی ہے؛ بلکہ اسے شوہر کی حیثیت واستطاعت پر موقوف رکھا ہے، کہ جو شخص جس قدر مہر دینے کی استطاعت رکھتا ہو اسی قدر مقرر کرلے؛ البتہ مہر کی کم سے کم ایک حد مقرر کی گئی ہے؛ تاکہ کوئی شخص اس سے کم مہر نہ باندھے۔

علامہ ابن رشد نے یہ بات بیان کی ہے کہ اس پر تمام فقہاء کے درمیان اتفاق

پایا جاتا ہے کہ مہر کی زیادہ سے زیادہ مقدار میں کوئی حد متعین نہیں ہے؛ بلکہ جس بات پر فریقین کے درمیان اتفاق ہو جائے وہی چیز مہر شمار ہوگی؛ البتہ اس کی کم سے کم مقدار کے بارے میں فقہا کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

(بدایۃ المجتہد، ج:۳، ص:۵۴)

اقلّ مقدارِ مہر اور اختلافِ ائمہ

امام مالکؒ کا مذہب: امام مالکؒ کے نزدیک کم از کم مہر ربع دینار ہے، یہی سرقہ میں اُن کے نزدیک قطعِ ید کا نصاب ہے۔

امام شافعیؒ واحمدؒ کا مذہب: امام شافعی وامام احمد کے نزدیک اقل مہر کی بھی کوئی حد مقرر نہیں ہے؛ بلکہ زوجین جس پر راضی ہو جائیں وہی درست ہے، انکے نزدیک نکاح بیع وشراء کی طرح مالی معاملہ ہے، مال ہونا چاہئے، چاہے کم ہو یا زیادہ۔

امام ابوحنیفہؒ کا مذہب: امام صاحب کے نزدیک اقل مہر دس (۱۰) درہم چاندی ہے، اس سے کم جائز نہیں، یہ آخری حد ہے۔ اگر کسی شخص نے اتنا مہر باندھا جو دس درہم کی قیمت سے کم ہو، تو مہر صحیح نہیں ہوگا اور دس درہم ہی لازم ہوں گے۔ اور دس درہم میں دو تولہ ساڑھے سات ماشہ چاندی ہوتی ہے۔ اور یہ موجودہ گراموں کے حساب سے ۳۰ رگرام ۶۱۸ رملی گرام ہوتا ہے۔ اور دس گرام کے تولے سے ۳ رتولہ ۶۱۸ رملی گرام چاندی ہوتی ہے۔ (فتح الباری، ج:۹، ص:۲۶۲)

امام مالکؒ کی دلیل: حدیث "المِجَنْ" ہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں "ثَمَنُ المِجَنْ" پر نکاح ہوا ہے اور ڈھال کی قیمت رُبع دینار ہوتی تھی، لہٰذا اقل مہر بھی رُبع دینار ہوگا۔ (مشکوٰۃ شریف، ص:۲۶۲)

دوسری دلیل: حدِ سرقہ اور قطعِ ید سے ہے، فرماتے ہیں کہ ہاتھ رُبع دینار

کے بدلے چوری میں کاٹا جاتا ہے تو ایک عضو کی قیمت رُبع دینار ہے، یہاں نکاح میں ملکِ بضعہ بھی ایک عضو ہے، اس کا بدلہ بھی رُبعِ دینار ہونا چاہئے۔

جواب: امام مالکؒ کا مستدل ہمارے خلاف نہیں ہے؛ کیونکہ ابتدائی دور میں رُبعِ دینار یا ''ثَمَنِ مِجَن'' یہ چیزیں دس درہم کے برابر تھیں۔

اور قطعِ ید کے مسئلہ کو تو ہم بھی اپنی عقلی دلیل میں پیش کرتے ہیں؛ کیونکہ وہاں دس درہم کا ذکر ہے، وہی رُبعِ دینار ہے۔

امام شافعیؒ وامام احمدؒ کی دلیل: حدیثِ باب ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے جب حضور اکرم ﷺ کو اپنے نکاح کی خبر دی تو آپؐ نے فرمایا: مہر میں کیا دیا؟ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے فرمایا: ''وَزْنُ نُواةٍ مِن ذَهَبٍ'' گٹھلی کے وزن کے برابر سونا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معمولی سے معمولی چیز کو بھی مہر بنایا جاسکتا ہے۔

دوسری دلیل: وہ اکثر احادیث ہیں جن میں شَيءٌ قَلِيلٌ مِن المَال کا ذکر ہے، جیسے ترمذی کی ایک روایت ہے: ''زَوَّجْتُكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ القُرآن''. ایک روایت میں: أجازَ نِكاحَ اِمرأةٍ عَلٰى نَعلَيْن'' ہے، ایک روایت میں ''سَتُّو'' کا ذکر آیا ہے۔ ان تمام روایات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مہر کی کوئی حد متعین نہیں ہے۔ (ترمذی، ج:۱، ص:۲۱۱)

جوابات: شوافع جن احادیث سے استدلال کرتے ہیں ان کا تعلق مہر معجّل سے ہے۔ صاحب فتح القدیر نے بھی اسی طرح کی روایات کو مہر معجّل پر محمول کیا ہے؛ چونکہ اہل عرب کی عادت تھی کہ دخول سے قبل کچھ نہ کچھ ہدیہ ضرور پیش کرتے تھے، جو کہ مہر معجّل ہوتا تھا، جیسا کہ ہمارے یہاں بھی رائج ہے۔

(فتح القدیر، ج:۳، ص:۳۰۶، حاشیہ ترمذی، ص:۲۱۱)

دوسرا جواب: علامہ انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں چونکہ مسلمان غریب تھے اور عسر و تنگی کا دور تھا، اس لیے اس وقت شریعت نے بے شک مہر کے معاملے میں اس طرح کی رعایت کی تھی لیکن جب اللہ تعالیٰ نے فراخی اور مالداری عطا فرمائی تو پھر مہر میں زیادتی کردی گئی۔ (فیض الباری، ج:۴،ص:۲۰۹)

احناف کی دلیل: قَولُہُ تعالیٰ: ﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ﴾ حضرات حنفیہ نے آیت کے اس ٹکڑے میں "فَرَضْنَا" کو "قَدَّرْنَا" کے معنی میں لے کر استدلال کیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے مقدار مقرر فرمائی ہے، لیکن یہ آیت مقدار کے سلسلے میں مجمل ہے، اس مجمل آیت کی تفصیل حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت "لَا مَهْرَ دُونَ عَشَرَةِ دَرَاهِمَ" (دارقطنی، ج:۳،ص:۲۴۵) قرار پائی کہ دس درہم سے کم مہر نہیں ہے۔

دلیلِ عقلی: حنفیہ کی طرف سے دلیل عقلی کے طور پر یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ نکاح کے ذریعہ شوہر کو ملکیتِ بضعہ حاصل ہوتی ہے اور اس کے عوض میں مرد پر مہر واجب ہوتا ہے، شریعت نے ایک عضو کا عوض کم از کم دس درہم مقرر کیا ہے۔ اس کا علم ہمیں اس بات سے ہوتا ہے کہ چور کم از کم جب دس درہم کی چوری کرے گا تب اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، لہٰذا مہر کی کم از کم مقدار بھی دس درہم ہی ہوگی۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (احکام القرآن، ج:۲،ص:۱۴۰)

مہر فاطمی اور اس کی مقدار

"مہر فاطمی" اس مہر کو کہا جاتا ہے جو نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خاتونِ جنت سیدتنا حضرت فاطمۃ الزہراءؓ اور دیگر صاحب زادیوں اور اکثر ازواجِ مطہرات کا مقرر فرمایا، اُس کی مقدار ۵۰۰ر درہم چاندی ہے، جس کا وزن موجودہ حساب سے

ا رکلو ۵۳۰ رگرام ۹۰۰ رملی گرام ہوتا ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح، ج:۳،ص: ۴۴۷)

مہر فاطمی قدیم اوزان سے

مہر فاطمی ۵۰۰ر درہم = ۱۳۱ ر تولہ ۳ ر ماشہ چاندی ہے

ایک ماشہ = ۸ر رتی ۱۲ ر ماشہ = ۹۶ ر رتی ا ر تولہ

۱۵۷۲ ر ماشہ = ۱۳۱ ر تولہ ۱۲۵۷۶ ر رتی

۱۵۷۵ ر ماشہ = ۱۳۱ ر تولہ ۳ ر ماشہ = ۱۲۶۰۰ ر رتی

۱۲۶۰۰ ر رتی = ۶۰۰ ر رتی ۵۰۰ ر درہم = مہر فاطمی

مہر فاطمی موجودہ اوزان سے

ایک رتی ۱۲۱-۲/۱ ملی گرام

دس رتی ۱۲۱۵ ر ملی گرام

۹۶ ر رتی ۱۱۶۶۴ ر ملی گرام ۱۱ ر گرام ۶۶۴ ر ملی گرام قدیم تولہ

ایک ماشہ = ۹۷۲ ر ملی گرام، ۱۲ ر ماشہ = ۱۱ ر گرام ۶۶۴ ر ملی گرام = ایک تولہ

۱۵۷۲ ر ماشہ = ۱۳۱ ر تولہ = ۱۵۲۷۹۸۴ ر ملی گرام

۱۵۷۵ ر ماشہ = ۱۵۳۰۹۰۰ ر ملی گرام ۱۶۳۰ ر گرام ۹۰۰ ر ملی گرام = ۱۳۱ ر تولہ

۳ ماشہ

۱۳۱ ر تولہ ۳ ر ماشہ ڈیڑھ کلو ۳۰ ر گرام ۹۰۰ ر ملی گرام چاندی مہر فاطمی ہے۔ اور دس گرام تولہ کے حساب سے مہر فاطمی ۱۵۳ ر تولہ ۹۰۰ ر ملی گرام چاندی ہے۔

(ایضاح المسائل، ص: ۱۳۰)

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَ بِهٰذا نَأخُذُ، أدنٰى المَهرِ عَشرَةُ دَرَاهِمَ مَا تُقْطَعُ فِيهِ اليَدُ، وَ هُوَ قَولُ أبِي حَنيفَةَؒ وَالعَامَةِ مِن فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ہم اس روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں، مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہے، یعنی جس مقدار کی (قیمت والی) چیز کی چوری کرنے پر ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ہمارے اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ فرمان کا مطلب یہ ہے کہ مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم ہے، اس سے کم مہر نہیں ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص دس درہم سے کم مہر باندھے گا تو یہ مہر صحیح نہ ہوگا اور اس پر دس درہم ہی لازم ہوں گے۔ اور اس مسئلہ کو قیاس کیا ہے چوری والے مسئلہ پر، جب چور کوئی چیز چوری کرتا ہے تو اس کا ہاتھ اس وقت کاٹا جاتا ہے جب وہ چوری کی ہوئی چیز دس درہم کے برابر ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہے۔ اور اس کی تائید حضرت علیؓ کے اثر سے بھی ہوتی ہے: لَا تُقْطَعُ الأيْدِي فِي أقَلِّ مِن عَشرَةِ دَرَاهِم، وَ لَا يَكُونُ المَهرُ أقَلَّ مِن عَشرَةِ دَرَاهِمَ. (حاشیہ نمبر:۱، ص:۲۴۳)

یہی امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔

(ب:۳) بَابُ لَا يَجمَعُ الرَّجُلُ بَينَ المَرأَةِ وَ عَمَّتِهَا فِى النِّكَاحِ

عورت اور اسکی پھوپھی کو بیک وقت نکاح میں جمع نہ کرنے کا بیان

أخبَرَنَا مَالِكٌ، حَدَّثَنَا أبُو الزِّنَادِ عَن عَبدِ الرَّحمٰنِ الأعرَجِ عَن أبِي

هُرَيرَةَؓ أنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَ سَلَّمَ قَالَ: لَا يَجمَعُ الرَّجُلُ بَينَ المَرأةِ وَ عَمَّتِهَا وَ لَا بَينَ المَرأةِ وَ خَالَتِهَا.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے: آدمی کسی عورت اور اس کی پھوپھی کو، یا کسی عورت اور اس کی خالہ کو نکاح میں جمع نہ کرے۔

ایسی دو عورتیں جن کو ایک عقد میں جمع کرنا جائز نہیں ہے؟

تشریح: اس حدیث میں ایک ضابطہ اور ایک اصولی قاعدہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور علمائے اُمت نے اس قاعدہ کی تشریح کر کے واضح فرمایا ہے۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ: ہر ایسی دو عورتیں جن میں قرابت محرمیت ہو، اگر اُن میں سے ایک کو مرد اور دوسری کو عورت فرض کیا جائے تو ان دونوں کا نکاح درست نہ ہوتا ہو ایسی دو عورتوں کو نکاح میں اکٹھا کرنا حرام ہے۔ اس کی مثال مذکورہ حدیث میں پھوپھی اور بھتیجی کی ہے۔ اگر پھوپھی کو مرد فرض کیا جائے تو چچا بھتیجی کا رشتہ ہو جائے گا۔ اور اگر بھتیجی کو مرد فرض کیا جائے تو بھتیجے اور پھوپھی کا رشتہ ہو جائے گا۔ اور چچا کا بھتیجی سے اور پھوپھی کا بھتیجے سے نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہے، لہٰذا کسی مرد کا ان دونوں عورتوں کو اپنے نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔

اس قاعدہ کے متعلق ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ حرمت دونوں طرف سے ضروری ہے، یعنی جانبین میں سے جس کو بھی مرد فرض کرلو تو نکاح حرام ہو جاتا ہو، اگر ایسا نہیں؛ بلکہ ایک طرف سے تو حرمت آتی ہے؛ لیکن دوسری طرف سے حرمت نہیں آتی ہے، تو یہ قاعدہ اس صورت کو شامل نہیں ہے؛ بلکہ ایسی دو عورتوں کو ایک نکاح میں اکٹھا کیا جا سکتا ہے، مثلاً بیوی اور اس کے پچھلے شوہر کی بیٹی کو جمہور

کے نزدیک ایک نکاح میں اکٹھا کیا جاسکتا ہے جب کہ وہ لڑکی اس بیوی سے نہ ہو، اب اگر پچھلے خاوند کی اس بیٹی کو مرد فرض کیا جائے تو یہ بیوی اس کے باپ کی بیوی یعنی ''زوجۃ الاب'' بنتی ہے اور ''زوجۃ الاب'' سے نکاح حرام ہے، لیکن اگر اس بیوی کو مرد فرض کیا جائے تو اس لڑکی سے نکاح کی حرمت کی کوئی وجہ نہیں ملتی ہے، لہٰذا مذکورہ بالا قاعدہ طرفین کی حرمت پر مبنی ہے، ایک طرف کی حرمت کافی نہیں ہے ۔اور مذکورہ بالا ضابطہ محض اختراعی اور عقلی نہیں بلکہ حدیث میں مذکور ہے: لَا یَنبغِي لِلرَّجُلِ أَنْ یَجمَعَ بَینَ اِمرَأتَینِ لَو کانَ أحدُهُما رَجُلاً لَمْ یَحِلَّ لَہٗ نِکَاحُهَا. (الجَامِع لأحکامِ القُرآن، ج:۳، ص:۸۳، الکُتب العِلمیَّۃ)

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اعتراض: خوارج کا یہ نظریہ ہے کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی دونوں کا بیک وقت نکاح میں لانا جائز ہے، کیونکہ قرآنِ کریم میں ﴿اُحِلَّ لَکُمْ مَا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ﴾ کے تحت جن محرمات کا ذکر آیا ہے اُن میں یہ شامل نہیں؟

جواب: یہ ہے کہ یہ حرمت حدیث مشہور کی وجہ سے ہے، اس لیے کہ باب کی روایت مشہور حدیث ہے اور جب کوئی حدیث مشہور ہو تو اس سے آیت کے مفہوم میں اضافہ کیا جاسکتا ہے، اس لیے ان احادیث کی وجہ سے اُخت کے مفہوم میں پھوپھی اور خالہ کو بھی شامل کرلیا گیا اور اُن کو جمع کرنا حرام قرار دیدیا گیا۔

(فتح الباری، ج:۱، ص:۴۰۹)

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذا نَأخُذُ، وَ هُوَ قَولُ أبِي حَنیفَۃَؒ وَالعَامَّۃِ مِن فُقَهَائِنَا

ترجمہ: حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت سے استدلال کرتے ہیں اور یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ہمارے عام فقہائے کرام کا مذہب ہے۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ فرمان کا مطلب یہ ہے کہ نکاح میں ایسی دو عورتوں کو جمع کرنا کہ اگر اُن میں سے ایک کو مرد فرض کیا جائے تو دوسرے کا اس سے نکاح درست نہ ہونے میں ہمارا استدلال اسی روایت سے ہے جو باب میں بیان کی گئی ہے۔اور یہی حضرت امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أخبرَنَا يَحيىٰ بْنُ سَعِيدٍ أَنَّهُ سَمِعَ سَعِيدَ بنَ المُسَيِّبِ يَنْهىٰ أَنْ تُنْكَحَ المَرأةُ عَلىٰ خَالَتِهَا، أوْ عَلىٰ عَمَّتِهَا، وأنْ يَطَأَ الرَّجُلُ وَلِيْدَةً فِي بَطْنِهَا جَنِينٌ لِغَيْرِهِ.

ترجمہ: سعید بن میبّبؒ نے اس بات سے منع کیا ہے کہ آدمی اپنی بیوی کی بھانجی کے ساتھ شادی کرے، یا اپنی بیوی کی بھتیجی کے ساتھ شادی کرے۔اور (اس بات سے بھی منع کیا ہے کہ) کسی ایسی کنیز کے ساتھ صحبت کرے کہ اس کے پیٹ میں کسی دوسرے شخص کا بچہ موجود ہو۔

تشریح: قَولُہ: أنْ يَطَأَ الرَّجُلُ وَلِيْدَةً: حدیث شریف کے مذکورہ جملے کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایسی کنیز کے ساتھ صحبت کرنا جائز نہیں جس کے پیٹ میں دوسرے کا بچہ موجود ہو، اس لیے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''دوسرے کے پانی (منی) کے ساتھ اپنا پانی نہ ملاؤ''۔

حکم یہ ہے کہ وہ حاملہ عورت جو کسی دوسرے شخص کے بچے کی ماں بننے والی ہوں ایسی عورت کے ساتھ اس وقت تک صحبت نہیں کی جاسکتی جب تک کہ وہ اپنے بچے کو جنم نہیں دے لیتی۔اور اگر کوئی عورت حاملہ ہو، تو اس کے ساتھ اس وقت تک صحبت نہیں کی جاسکتی جب تک کہ اسے حیض نہیں آجاتا (یہ حکم اُن عورتوں کے لئے ہے جو کنیز کے طور پر مسلمان کی ملکیت میں آتی ہیں)۔

تاہم اس روایت سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ جب کوئی عورت دوسرے شخص کے ساتھ صحبت کی وجہ سے حاملہ ہوئی ہو تو ایسی عورت سے نکاح کرنا جائز ہے۔ اور ہمارے جمہور علماء نے اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے، لیکن وہ صحبت اس وقت تک نہیں کرے گا جب تک وہ بچہ کو جنم نہیں دیتی، یہ حکم اس وقت ہے کہ جب زنا کرنے والے کے علاوہ کسی دوسرے نے اس کے ساتھ شادی کی ہو، لیکن اگر زنا کرنے والے شخص ہی نے اس کے ساتھ شادی کر لی تو اب اس کے لیے اس عورت کے ساتھ صحبت کرنا جائز ہوگا، اس صورت میں وہ اپنے پانی کے ذریعہ اپنی ہی کھیتی کو سیراب کرے گا۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأخُذُ، وَ هُوَ قَولُ أَبِي حَنِيفَةَؒ وَالعَامَةِ مِن فُقَهَائِنَا

ترجمہ: حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ اور یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ہمارے عام فقہائے کرام کا مذہب ہے۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ فرمان کا مطلب یہ ہے کہ جس کنیز (باندی) کے پیٹ میں دوسرے شخص کا بچہ موجود ہے اس سے وطی کی حرمت کے سلسلے میں ہمارا استدلال اسی روایت سے ہے جو اوپر گذری ہے اور یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ اور دیگر فقہائے کرام کا مذہب ہے۔

(ب:۴) بَابُ الرَّجُلِ يَخطِبُ عَلٰى خِطبَةِ أَخِيهِ

اپنے بھائی کے پیغامِ نکاح پر اپنے لیے پیغام بھیجنے کا بیان

أَخبَرَنَا مَالِكٌ، أَخبَرَنَا يَحيىٰ بنُ سَعِيدٍ عَن مُحَمَّدِ بنِ يَحيىٰ بنِ حِبَّانَ عَن عَبدِ الرَّحمٰنِ بنِ هُرمُزَ الأَعرَجِ عَن أَبِي هُرَيرَةَؓ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَ سَلَّمَ قَالَ: لَا يَخطِبُ أَحَدُكُم عَلٰى خِطبَةِ أَخِيهِ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے: کوئی شخص اپنے بھائی کے پیغامِ نکاح پر نکاح کا پیغام نہ بھیجے۔

تشریح: مذکورہ حدیث شریف کے تحت عام طور پر دو باتیں ذکر کی جاتی ہیں: ایک پیغامِ نکاح، دوسرا لین دین۔ یعنی اپنے بھائی کے پیغامِ نکاح پر نکاح کا پیغام نہ بھیجو اور اپنے بھائی کے سودا کرتے وقت تم سودا کرنے سے باز رہو۔ یہاں کتاب میں صرف پہلے والا مسئلہ ذکر کیا گیا ہے، اس مسئلہ کی تین صورتیں بنتی ہیں اور تینوں کے احکام جدا جدا ہیں، لہٰذا جہاں جیسا مرحلہ ہوگا وہاں ویسا ہی حکم لگے گا۔

(۱) لڑکا یا لڑکی اس مرحلہ میں ہیں کہ مختلف جگہوں سے ان کے پیغام آرہے ہیں، کسی طرف بھی اتفاق نہیں ہے، ایسے مرحلہ میں ہر کوئی پیغام دے سکتا ہے۔

(۲) کسی کا پیغام قبول ہوگیا، بات پکی ہوگئی اور منگنی بھی ہوگئی، تو دوسرا شخص ہرگز پیغام نہ دے؛ کیونکہ یہ تو ایک اخلاقاً بہت ہی بری حرکت ہے اور دوسرا غیر کا حق مجروح قرار پائے گا۔

(۳) درمیانی مرحلہ کسی کا پیغام آیا ہوا ہے، ابھی بات پکی تو نہیں ہوئی ہے؛ لیکن اس کی طرف میلان اور جھکاؤ ہے تو اس صورت میں پیغام بھیجنے اور نہ بھیجنے کے سلسلے میں اختلاف ہے۔

امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک اس صورت میں پیغام دینا جائز ہے۔ اور شوافع کی بھی اصح روایت یہی ہے۔ امام احمدؒ سے بھی ایک روایت اسی کے مطابق مروی ہے۔

امام شافعیؒ سے دوسری روایت امام ترمذی نے اس صورت میں عدمِ جواز کا

قول نقل کیا ہے۔ (النووی، ج:۱،ص:۴۵۴)

صاحب عمدۃ القاری فرماتے ہیں: یہ ممانعت اس وقت تک ہے جب تک پہلا پیغام دینے والا اسے ترک نہ کردے، یا پھر وہ خود اجازت دیتا ہے کہ تم بھی قسمت آزمائی کرسکتے ہو۔ حدیث میں جو نہی وارد ہے وہ اس حدیث سے منسوخ ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ بنت قیسؓ کے لیے رشتہ طلب کیا، باوجودیکہ آپ سے قبل اسی عورت سے حضرت امیر معاویہؓ اور ابوجہم رشتہ طلب کرچکے تھے؛ لیکن فقہائے کرامؒ نے اس سے نہی کو منسوخ قرار نہیں دیا؛ بلکہ نہی کو اپنے حال پر برقرار رکھا۔ اس کی دو وجوہات ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جو اُسامہؓ کے لیے خطبہ دیا وہ نہی سے قبل کا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ فاطمہ بنت قیس نے امیر معاویہ اور ابوجہم کے ساتھ مسئلہ کو طے نہیں کیا تھا؛ بلکہ ابھی بات چل رہی تھی؛ لیکن اس ممانعت کے باوجود اگر کسی نے دوسرے کی بات چلنے نہ دی اور اپنی بات پکی کرکے شادی کرلی تو نکاح باطل نہ ہوگا۔ (عمدۃ القاری، ج:۲۰،ص:۱۳۲)

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذا نَأخُذُ، وَ هُوَ قَولُ أبِي حَنيفَةَؒ وَالعَامَةِ مِن فُقَهَائِنَا

ترجمہ: حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ اور یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ہمارے عام فقہائے کرام کا مذہب ہے۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص پیغام بھیج دے تو اب دوسرا شخص اس کے پیغامِ نکاح پر پیغام نہ بھیجنے میں ہمارا استدلال اسی روایت سے ہے، جو باب میں ذکر کی گئی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور دیگر فقہائے کرام کا یہی مذہب ہے۔

(ب: ۵) بَابُ الثَّيِّبِ اَحَقُّ بِنفسِهَا مِن وَلِيِّهَا

ثیبہ کا بہ نسبت اپنے ولی کے خود زیادہ حقدار ہونے کا بیان

أَخْبَرَنا مَالِكٌ، أخبرَنا عَبدُ الرَّحمٰنِ بنُ القَاسِمِ عَن أبِيْهِ عَنْ عَبدِ الرَّحمٰن وَ مُجَمَّعُ ابنَي يَزِيْدَ ابنَ جَارِيَةَ الأنصارِيِّ عَن خُنسَاءَ ابنَةِ خِذَامٍ أنَّ أباهَا زَوَّجَهَا وَ هِيَ ثَيِّبٌ، فَكَرِهتْ ذٰلِكَ، فَجَاءَتْ رسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَرَدَّ نِكَاحَهَا.

ترجمہ: عبدالرحمٰن اور مجمع یہ دونوں یزید بن جاریہ انصاری کے صاحبزادے ہیں، یہ سیدہ خنساء بنت خدام کے بارے میں بات نقل کرتے ہیں کہ اُن کے والد نے اُن کی شادی کردی وہ خاتون ثیبہ تھیں، انھیں یہ رشتہ پسند نہیں آیا، تو وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو نبی اکرم ﷺ نے اس نکاح کو کالعدم قرار دیدیا۔

باکرہ اور ثیبہ کے لیے ولی کے احکام

تشریح: یہاں ترجمۃ الباب میں صاحب کتاب نے لفظ ''ثیبہ'' استعمال کیا ہے۔ ''ثیبہ'' اس عورت کو کہتے ہیں جس کی ایک مرتبہ شادی ہوچکی ہو اور اس کے بعد اُسے طلاق ہوچکی ہو، یا وہ بیوہ ہوچکی ہو، یا وہ عورت جو کنواری نہ رہی ہو۔

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ ثیبہ کی اجازت کے بغیر نکاح درست نہ ہوگا، وہ اجازت دے گی تب ہی نکاح منعقد ہوگا، چوں کہ حضرت خنساء کے والد نے بیٹی کی مرضی کے بغیر نکاح کردیا تھا اور بیٹی نے اس کی شکایت آپؐ سے کی تھی تو حضور صلی

اللہ علیہ وسلم نے اُن کا نکاح فسخ کر دیا۔

یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ثیبہ اپنے بارے میں ولی سے زیادہ مختار ہے۔ پورے ذخیرۂ حدیث میں کہیں ایسا نہیں ہے کہ کسی بالغہ لڑکی نے ولی کی مرضی کے بغیر نکاح کیا ہو اور آپ نے اس کو رد کر دیا ہو۔

فائدہ: اس آدمی کا نام کیا تھا؟ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ مجھے اس کا علم نہ ہو سکا؛ البتہ واقدی نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس آدمی کا نام انس تھا اور وہ جنگ بدر میں مارے گئے تھے اور اس کا تعلق قبیلۂ مزنیہ سے تھا۔

(فتح الباری، ج:۱۱، ص:۴۱۴)

سوال: حضور ﷺ نے جب حضرت خنساء کا نکاح کو کالعدم (فسخ) قرار دیا تو اس وقت ان کی کیا حالت تھی؟

جواب: اس کے بارے میں روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

امام مالکؒ نے اپنی سند کے ساتھ یہ بات نقل کی ہے کہ یہ خاتون اس وقت ثیبہ تھیں، جب کہ ابن مبارکؒ نے اپنی سند کے ساتھ یہ بات نقل کی ہے کہ حضرت خنساء اس وقت کنواری تھیں۔ تاہم علامہ ابن عبد البرؒ نے یہ بات بیان کی کہ اسکے بارے میں امام مالکؒ کی نقل کردہ روایت زیادہ مستند ہے۔ (حاشیہ نمبر:۷، ص:۲۴۴)

قَالَ مُحَمَّدٌ: لَا یَنبَغِي أن تُنکَحَ الثَّیِّبُ وَ لَا البِکرُ إذَا بَلَغَت إلَّا بِإذنِهَا، فأمَّا إذنُ البِکرِ فَصَمتُها، وأمَّا إذنُ الثَّیِّبِ فَرِضَاهَا بِلِسَانِها زَوَّجَها وَالِدُها أو غَیرُهُ. وَ هُوَ قَولُ أبِي حَنِیفَةَ وَالعَامَّةِ مِن فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: یہ بات مناسب نہیں ہے کہ ثیبہ عورت یا کسی باکرہ عورت کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر کیا جائے،

جب کہ وہ بالغہ ہو چکی ہو۔ جہاں تک باکرہ کی اجازت کا تعلق ہے، تو اس کی خاموشی اس کی اجازت ہوگی۔ جہاں تک ثیبہ کی اجازت کا تعلق ہے تو اس کی زبانی رضامندی ضروری ہوگی، خواہ اس کے والد نے اس کی شادی کی ہو یا والد کے علاوہ کسی اور نے کی ہو۔ یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ہمارے عام فقہائے کرام کا قول ہے۔

تشریح: إِذَا بَلَغَتْ: اس جملہ کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ عبدالحیٔ لکھنویؒ نے یہ بات تحریر کی ہے: اگر وہ بالغہ نہیں ہوتی ہے تو اس کے ولی کو اس کی اجازت کے بغیر نکاح کرنے کا حق حاصل ہوگا؛ البتہ جب وہ بالغہ ہو جائے گی تو اسے اُس نکاح کو فسخ کرنے کا اختیار ہوگا، اس کے لیے یہ بات شرط ہے کہ اس کا نکاح کرنے والا ولی باپ یا دادا کے علاوہ کوئی اور شخص ہو۔

إِذْنُ البِكْرِ فَصَمْتُهَا: خاموشی کے لیے یہ ضابطہ سمجھ لینا چاہئے کہ عورت کی خاموشی اس کی اجازت کے قائم مقام ہونا صرف اس کے ولی کے حق میں ہے، یعنی عورت کی خاموشی اس وقت اجازت سمجھی جائے گی جب اس کے ولی نے اس سے اجازت مانگی ہو اور وہ خاموش ہوگئی، یہ خاموشی قائم مقام رضا ہے۔ اور اگر غیر ولی نے نکاح کا مطالبہ کیا اور عورت خاموش ہوگئی تو اس خاموشی کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ باکرہ لڑکی نا تجربہ کار اور شرمیلی ہوتی ہے، لہٰذا اس کے نکاح کے تمام تر انتظامات ولی کو سنبھالنے ہوں گے۔

إِذْنُ الثَّيِّبِ: ثیبہ عورت کا زبان سے اقرار کرنا اس کی رضامندی سمجھی جائے گی، خواہ اس کا ولی باپ ہو، یا کوئی اور دوسرا شخص۔ چنانچہ حدیث میں ہے: "الأَيِّمُ أَحَقُّ بِنَفْسِهَا" (کہ ثیبہ عورت اپنے ولی کے مقابلے میں اپنی ذات کے بارے

میں زیادہ حق رکھتی ہے)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ثیبہ عورت شوہر دیدہ اور تجربہ کار ہوتی ہے اور اپنے نفع ونقصان کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے، لہٰذا یہ اپنے نکاح کے انتظامات خود کرنا چاہے تو کرلے، ولی اس کا معاون بنے گا۔

(ب:٦) بَابُ الرَّجُلِ يَكُونُ عِنْدَهُ أَكْثَرُ مِن أَربعِ نِسوةٍ فَيُرِيدُ أَن يَتَزَوَّجَ

چار سے زائد بیویاں ہوتے ہوئے مزید شادی کرنے کا بیان

أَخْبَرَنا مَالِكٌ، أخبَرَنا ابنُ شِهَابٍ، قَالَ: بَلَغَنَا أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ لِرَجُلٍ مِن ثَقِيفٍ وَ كَانَ عِندَهُ عَشرُ نِسوَةٍ حِينَ أَسلَمَ الثَّقفِيُّ، فَقَالَ لَهُ: أَمسِكْ مِنهُنَّ أَربَعًا وَ فَارِقْ سَائِرَهُنَّ.

ترجمہ: ابن شہاب بیان کرتے ہیں کہ ہم تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پہنچی ہے کہ قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھنے والا ایک شخص مسلمان ہوا، جب کہ اس کے نکاح میں دس عورتیں موجود تھیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ: ان میں سے چار عورتیں رکھ لو اور باقی کو جدا کردو۔

ایک مرد بیک وقت کتنی بیویاں رکھ سکتا ہے؟

تشریح: مذکورہ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ نکاح میں بیک وقت چار سے زائد بیویاں رکھنا جائز نہیں ہے۔ اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر شوہر بیوی کے ساتھ مسلمان ہو جائے تو تجدید نکاح کی ضرورت نہیں ہے، میاں بیوی کا رشتہ باقی رہے گا۔ اگر کسی کے نکاح میں ذی رحم محرم ہو تو تفریق کردی جائے گی۔

مذکورہ حدیث میں زمانۂ جاہلیت کا ایک واقعہ مذکور ہے کہ، زمانۂ جاہلیت میں

قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھنے والے ایک شخص کے پاس دس بیویاں تھیں، جب اس نے اسلام قبول کرلیا، تو آپؐ نے اُسے چار کی اجازت دی اور بقیہ کو جدا کرنے کا حکم دیا، یہاں تک سب ائمہ کا اتفاق ہے۔

قَالَ مُحمَّدٌ: وَ بِهٰذا نأخُذُ، يَختارُ مِنهُنَّ أربَعًا أيَّتُهُنَّ شاءَ وَ يُفارِقُ مَا بَقِيَ. وَ أمَّا أبُو حَنيفَةَ؛ فقالَ: نِكاحُ الأربَعِ الأوَّلُ جَائِزٌ، وِنكاحُ مَن بَقِيَ مِنهُنَّ باطِلٌ. وَ هُوَ قولُ إبراهيم النَخعِيِّ.

ترجمہ: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں، ان میں سے جو بھی چار رکھنا پسند کرتا ہے رکھ لے اور باقی ماندہ کو جدا کردے۔ جہاں تک امام ابوحنیفہؒ کا تعلق ہے تو وہ اس بات کے قائل ہیں کہ اس شخص نے جو چار نکاح پہلے کیے تھے وہ جائز ہوں گے، اس کے بعد کیے جانے والے نکاح باطل شمار ہوں گے۔ ابراہیم نخعیؒ بھی اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ فرمان کا مطلب یہی ہے کہ جب کوئی کافر مسلمان ہو جائے اور اس کی بیویاں بھی ساتھ میں مسلمان ہو جائیں، تو اب اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ شخص چار بیویاں اپنے پاس رکھ سکتا ہے، باقی کو چھوڑنا پڑے گا؛ لیکن اختلاف اس بات میں ہے کہ ان عورتوں میں کن کو رکھے اور کن کو چھوڑ دے، فیصلہ کیسے کرے؟

فقہائے کرام کا اختلاف

جمہور کا مذہب: ائمہ ثلاثہ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اس شخص کو اختیار ہے جن کو رکھنا چاہتا ہے رکھ لے اور جسے چھوڑنا چاہتا ہے چھوڑ دے۔

امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ کا مذہب: امام صاحبؒ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ شوہر کو تخییر کا حق حاصل نہ ہوگا؛ بلکہ ترتیب کو مدنظر رکھا جائے گا، یعنی جن چار عورتوں سے پہلے نکاح ہوا ہے انہی کو رکھے اور چار کے نکاح کے بعد جن سے نکاح کیا ہے وہ چھوڑنے کے لیے متعین ہیں۔

جمہور کی دلیل: جمہور حدیث باب سے استدلال کرتے ہیں جس میں "أمْسِكْ مِنهُنَّ أربَعًا" مطلق الفاظ ہے، کوئی قید نہیں کہ پہلے کس کو چھوڑے اور بعد میں کس کو رکھے، اس لیے شوہر کو حق تخییر حاصل ہوگا۔

دوسری دلیل: حضرت ضحاک بن فیروز کی روایت ہے جس میں "اِختَرْ أيَّتَهُما شِئْتَ" کے الفاظ آئے ہیں جو تخییر اور اختیار استعمال کرنے پر دلالت کرتے ہیں۔ (مشکوٰۃ، ص:۲۷۴)

جواب: امام طحاویؒ نے جمہور کے مستدلات کا یہ جواب دیا ہے کہ مذکورہ احادیث میں شوہر کو جو اختیار دیا گیا ہے، یہ اس پرانے اور قدیمی نکاح کی بات ہے، جب کہ چار سے زائد بیویوں کے اکٹھا رکھنے کی تحریم کا حکم ہی نہیں آیا تھا، لہٰذا اس وقت تمام نکاح صحیح تھے، تو سب میں اختیار دیا گیا کہ جسے چاہے رکھ لو، جسے چاہے چھوڑ دو، پھر یہ حکم موقوف ہوگیا، لیکن فتویٰ جمہور کے قول پر ہے۔

امام صاحبؒ کی دلیل: فرماتے ہیں کہ نکاح کے معاملات میں کفار شرعی نصوص اور احکامات اور فروعات کے پابند ہیں، تو جو چار نکاح کسی کافر نے پہلے کیے تھے وہ تو اسلام کی نظر میں صحیح تھے؛ لیکن چار کے بعد والے نکاح صحیح نہیں تھے؛ مگر کافر پر شرعی احکامات کی تنفیذ اس لیے نہیں تھی کہ وہ مسلمان نہیں اور اہل ذمہ اپنی شخصی زندگی میں آزاد ہیں، لیکن جب وہ شخص مسلمان ہوا تو اب شریعت کا حکم اس

کی طرف متوجہ ہوا، لہٰذا جو چار کے بعد نکاح میں آئی تھیں ان کا نکاح لا نکاح تھا، وہ اسی وقت کالعدم تھا، لہٰذا وہ باقی کو چھوڑ دے۔

احناف کی یہ دلیل شریعت کے مجموعی قواعد اور اصول پر مبنی ہے، یہ کوئی قیاس نہیں جو نصوص کے مقابلہ میں آیا ہے؛ تاہم امام محمد بھی جمہور کے ساتھ ہیں، لہٰذا فتویٰ جمہور کے قول پر ہے۔ اسی میں احتیاط بھی ہے۔ (توضیحات، ج:۵، ص:۱۱۱)

أَخْبَرَنا مَالِكٌ، أخبَرَنا رَبِيعَةُ بنُ أَبِي عَبدِ الرَّحمٰنِ أنَّ الوَلِيْدَ سأَلَ القَاسِمَ وَ عُروَةَ، وَ كانَتْ عِندَهُ أربَعُ نِسوَةٍ، فأرادَ أن يَّبِتَّ وَاحِدَةً وَ يَتزوَّجَ أخرىٰ، فَقالاَ: نَعمْ، فَارِقْ امرأتَكَ ثَلٰثًا، وَ تَزوَّجْ، فقالَ القَاسِمُ: فِي مَجَالِسَ مُختَلِفَةٍ.

ترجمہ: ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ حضرت ولید نے قاسم اور عروہ سے سوال کیا کہ ان کے پاس چار بیویاں ہیں، اب وہ اُن میں سے ایک کو طلاق دے کر کسی دوسری عورت کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے؟ تو اُن دونوں نے جواب دیا: ٹھیک ہے، تم اپنی ایک بیوی کو تین طلاق دے دو اور پھر اس کی جگہ دوسری شادی کرلو؛ تاہم قاسم نے کہا: وہ تین طلاقیں مختلف مجالس میں دو۔

تشریح: مذکورہ روایت کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ جب ولید نامی شخص نے جناب قاسم اور عروہ رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ میں چار بیویوں کا خاوند ہوں اور اب ایک اور شادی کرنا چاہتا ہوں اور میرا پروگرام یہ ہے کہ ایک کو فارغ کردوں، پھر نئی شادی کرلوں، آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ دونوں حضرات کا جواب ذرا مختلف تھا۔

پہلے نے یہ کہا کہ ایک بیوی کو تین طلاق دے دو پھر اس کی عدت میں ہی اگر چاہو تو نیا نکاح کر سکتے ہو۔ جناب قاسمؒ نے کہا کہ تین طلاقیں تین مختلف مجلسوں میں دو، پھر نکاح کرلو۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ جب تین طلاقیں تین مختلف مجلسوں میں ہوں گی، تو عورت مغلظہ ہو جائے گی، اب وہ بغیر حلالہ کے اس کے پاس نہیں آ سکتی، اس لیے اب پانچویں کے ساتھ نکاح کرنا درست ہے، خواہ چوتھی کی ابھی عدت پوری نہ ہوئی ہو۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: لَا يُعجِبُنَا أن يَتزوَّجَ خَامِسةً وإنْ بَتَّ طَلَاقَ إحدٰهُنَّ حَتّٰى تَنقَضِيَ عِدَّتُها،لَايُعجِبُنَا أَن يَّكُونَ مَاءُهُ فِي رَحِمِ خَمسِ نِسوَةٍ حَرَائِرَ، وَ هُوَ قَولُ أَبِي حَنِيفة رَحمةُ اللّٰهِ عَلَيهِ، وَالعَامَّةِ مِن فُقَهَائِنَا

ترجمہ: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ہمارے نزدیک یہ بات درست نہیں ہے کہ چار عورتوں میں سے ایک کو طلاق دے کر پانچویں عورت سے شادی کرے حتیٰ کہ مطلقہ اپنی عدت پوری کر لے، کیونکہ ہمیں یہ بات پسند نہیں ہے کہ اس کا نطفہ پانچ آزاد عورتوں کے رحم میں موجود ہو۔ اور یہی قول حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ہمارے عام فقہائے کرام کا ہے۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ پانچویں عورت سے نکاح اس وقت تک جائز نہیں جب تک چوتھی عورت کی عدت مکمل نہ ہو جائے، خواہ وہ بائنہ ہو، یا مغلظہ ہو۔ اگر کوئی شخص چوتھی کی عدت میں پانچویں سے نکاح کر لیتا ہے تو یہ بیک وقت پانچ آزاد عورتوں کے شکم میں اپنا نطفہ ٹھہرانا ہے، جو کہ کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ اور دیگر فقہاء کا یہی مذہب ہے۔

(ب:۷) بَابُ مَا يُوجِبُ الصَّداق

مہر کس چیز سے واجب ہوتا ہے؟ اس کا بیان

أَخْبَرَنا مَالِكٌ، أخبرَنا ابنُ شِهَابٍ، عَن زَيدِ بنِ ثَابتٍؓ، قَالَ: إذَا دَخلَ الرَّجُلُ بِامرأتِهِ وَ اُرْخِيَتِ السُّتُورُ فَقَدْ وَجَبَ الصَّدَاقُ.

ترجمہ: زید بن ثابتؓ بیان کرتے ہیں کہ: جب آدمی اپنی بیوی کو رخصت کر کے گھر لے جائے اور (اپنے کمرہ کا) پردہ گرادے (یعنی خلوتِ صحیحہ ہو جائے) تو مہر کی ادائیگی لازم ہو جائے گی۔

خلوت کا بیان

تشریح: یہاں سے فرمارہے ہیں کہ حقِ مہر کب اور کن حالات میں واجب ہوتا ہے؟ اس بارے میں امام محمدؒ نے جو اثر ذکر فرمایا ہے وہ زید ابن ثابتؓ کا فتویٰ ہے کہ جب نکاح کے بعد میاں بیوی کسی ایسی جگہ اکٹھے ہو جائیں جہاں کوئی عذر شرعی یا جسمانی ایسا نہ ہو جو ہم بستری سے رکاوٹ بنے، تو اس طرح سے اکٹھا ہونا ''خلوتِ صحیحہ'' کہلاتا ہے، اب خلوتِ صحیحہ کے میسر آنے کے بعد وہ وطی کرے یا نہ کرے، حقِ مہر مکمل ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے، احناف کا یہی مسلک ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عورت کے لیے آدھا مہر لازم ہوگا، کیونکہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: مہر واجب نہیں ہوگا جب تک صحبت نہ کرے، ورنہ اس کے لیے آدھا مہر ہوگا۔ (مصنف عبدالرزاق، ج:۶، ص:۲۹۰)

خلوت کی دو قسمیں ہیں: (۱) خلوتِ صحیحہ (۲) خلوتِ فاسدہ۔

اگر کوئی مانعِ وطی نہ پایا جائے تو ایسی صورت میں جو خلوت ہوگی وہ ''خلوتِ

صحیحہ" کہلائے گی۔ اور اگر کوئی مانع وطی موجود ہے، تو ایسی صورت میں جو خلوت ہوگی، وہ "خلوتِ فاسدہ" کہلائے گی۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذا نَأخُذُ، وَ هُوَ قَولُ أبي حَنيفَةَؒ وَالعَامَةِ مِن فُقَهَائِنَا

ترجمہ: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہا اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ فرمان کا مطلب بیان کرتے ہوئے علامہ ابن منذر نے لکھا ہے کہ یہاں امام محمدؒ کی جو رائے ہے وہی رائے حضرت عمر، علی، زید بن ثابت، عبداللہ بن جابر اور معاذ رضی اللہ عنہم کی بھی ہے۔ اور امام شافعیؒ کا قولِ قدیم بھی یہی ہے؛ تاہم انہوں نے اپنے جدید قول میں یہ بات بیان کی ہے کہ جب شوہر خلوت ہو جانے کے بعد طلاق دیتا ہے تو اسے مقررہ مہر کا نصف ادا کرنا پڑے گا۔ اس بارے میں امام احمدؒ کی رائے امام ابوحنیفہؒ کی رائے کے موافق ہے۔ اور ہمارے مذہب کی تائید اللہ کے فرمان "بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ" سے ہوتی ہے، اس کا مطلب ہے کہ ایسا ملاپ ہو چکا ہو جس میں رکاوٹ نہ ہو۔ (تلخیص حاشیہ نمبر: ۳، ص: ۲۴۵)

وَ قَالَ مَالِكُ بنُ أنسٍؓ: إنْ طَلَّقَهَا بعدَ ذٰلكَ لَم يَكُنْ لَهَا إلاَّ نِصفُ المَهرِ إلاَّ أنْ يَطُولَ مَكثُها وَ يَتَلَذَّذُ مِنهَا، فَيَجِبُ الصَّداقُ.

ترجمہ: امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر مرد نے اس (خلوتِ صحیحہ) کے بعد اسے طلاق دے دی، تو اس عورت کو صرف نصفِ مہر ملے گا؛ البتہ وہ عورت چند دن تک اس کے گھر میں رہی ہو اور وہ اس عورت سے لذت حاصل

کرتا رہا ہو، تو (مکمل) مہر کی ادائیگی لازم ہوگی۔

تشریح: ماقبل میں امام ابو حنیفہؒ کا مسلک بیان ہوا کہ خلوتِ صحیحہ ہو جانے کے بعد مہر کی ادائیگی لازم ہو جاتی ہے، خواہ وطی کیا ہو، یا نہ کیا ہو، لیکن امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ محض خلوتِ صحیحہ سے حق مہر مکمل ادا کرنا واجب نہیں ہوتا؛ بلکہ اگر ایک دو مرتبہ وطی بھی پائی جائے تب بھی نہیں، اس صورت میں اگر طلاق ہو جائے تو نصف مہر دینا پڑے گا۔ ہاں! اگر کافی عرصہ وہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے لطف اندوز ہوتے رہے تو اب حق مہر مکمل واجب ہوگا۔

(ب:۸) بَابُ نِكَاحِ الشِّغَارِ

نکاحِ شغار کا بیان

أَخْبَرَنا مَالِكٌ، أخبرَنا نَافِعٌ، عَن ابنِ عُمَرَؓ أنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَليهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الشِّغَارِ. وَالشِّغَارُ أنْ يُنكِحَ الرَّجُلُ اِبنَتَهُ علٰى أنْ يُنكِحَهُ الآخَرُ اِبنَتَهُ لَيسَ بَينَهُما صَدَاقٌ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''نکاحِ شغار'' سے منع کیا ہے۔ ''شغار'' یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی کا نکاح دوسرے شخص سے اس شرط پر کر دے کہ اس دوسرے شخص کو اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کرنا ہوگا اور دونوں میں مہر کچھ بھی نہ ہو۔

لفظ شغار کی تحقیق

تشریح: نَهٰى عَنِ الشِّغَارِ: ''شغار'' شغر سے ماخوذ ہے۔ اور شغر: اُٹھانے کے معنی میں آتا ہے، چنانچہ کتا جب ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرتا ہے تو کہتے

ہیں: "شَغَرَ الكَلبُ". اور چونکہ نکاح شغار میں بھی جانبین سے یہ شرط ہوتی ہے: "لاَ تَرفَعُ رِجلَ بِنتِي حَتّٰى أرفَعَ رِجلَ بِنتِكَ" (کہ تم میری بیٹی کی ٹانگ نہیں اٹھا سکتے، یہاں تک کہ میں تمہاری بیٹی کی ٹانگ نہ اٹھاؤں) اس لیے یہ شغار ہوا، اس میں ہر قسم کی عار کی طرف اشارہ ہے۔ (اوجز المسالک، ج:۱۰، ص:۴۲۵)

شغار کی صورت تو حدیث میں ترجمہ کے ساتھ بیان ہو چکی ہے۔ ذرا مزید وضاحت سے یوں سمجھئے کہ "شغار" یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے سے کہہ دے کہ: مجھے اپنی بیٹی نکاح میں دے دو۔ وہ کہتا ہے کہ تم اپنی بیٹی میری بیٹی کے عوض نکاح میں دے دو۔ اس طرح دونوں کے راضی ہو جانے پر عقد ہو جاتا ہے اور درمیان میں مہر نہیں ہوتا؛ بلکہ لڑکیوں کا یہ تبادلہ ہی مہر مانا جاتا ہے۔ فقط یہی عقد گویا ایک دوسرے کے لئے مہر ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَ بِهٰذَا نَأخُذُ، لاَ يَكُوْنُ الصَّدَاقُ نِكَاحَ اِمرَأَةٍ، فَإِذَا تَزَوَّجَهَا عَلٰى أنْ يَكُونَ صَدَاقَهَا أن يُزَوِّجَهُ اِبنَتَهُ، فَالنِّكَاحُ جَائِزٌ، وَ لَهَا صَدَاقُ مِثلِهَا عَن نِسَائِهَا، لاَ وَكَسَ وَ لاَ شَطَطَ. وَ هُوَ قَولُ أَبِي حَنِيفَةَ وَالعَامَةِ مِن فُقَهَائِنَا.

ترجمه: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں کہ عورت کا نکاح مہر کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جب کوئی شخص کسی کے ساتھ اس شرط پر نکاح کرتا ہے کہ اس عورت کا مہر یہ ہوگا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اس (عورت کے باپ، یا بھائی) کے ساتھ کر دے گا، تو یہ نکاح جائز ہوگا؛ تاہم عورتوں کو مہر مثل ملے گا، جس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوگی۔ امام ابو حنیفہ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ فرمان کا مطلب یہ ہے کہ اگر نکاح کرتے ہوئے کوئی ایسی شرط عائد کی جائے جو شرعی طور پر درست نہ ہو، تو اس شرط کو کالعدم قرار دیا جاتا ہے، اور نکاح اپنی جگہ درست ہو جاتا ہے، اور مہر مثل کی ادائیگی لازم ہوتی ہے۔ یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء کا مذہب ہے؛ لیکن اس مسئلہ میں دیگر ائمہ کرام کی آراء مختلف ہیں۔

نکاحِ شغار اور اختلافِ ائمہ

جمہور کا مذہب: جمہور فرماتے ہیں کہ یہ عقد باطل ہے۔ اسحاق بن راہویہ اور ابوعبید رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

امام ابوحنیفہ کا مذہب: امام صاحب فرماتے ہیں کہ یہ عقد صحیح ہے؛ البتہ ایسا کرنا مکروہ ہے۔ (توضیحات، ج:۵، ص:۸۷)

جمہور کی دلیل: جمہور باب میں ذکر کردہ روایت سے استدلال کرتے ہیں، اس میں صاف صاف یہ مذکور ہے کہ آپؐ نے نکاحِ شغار سے منع فرمایا ہے۔

دوسری دلیل: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت کے اس جملہ سے ہے: لَا شِغَارَ فِي الإِسلَامِ" کہ اسلام میں شغار کی گنجائش نہیں ہے۔ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! شغار سے کیا مراد ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "عورت کے بدلہ میں عورت کے ساتھ شادی کر لینا، جب کہ اس صورت میں ان دونوں کا کوئی مہر نہ ہو۔ (ترمذی، ج:۱، ص:۲۱۳)

اس حدیث کی سند اگر چہ ضعیف ہے؛ لیکن اس مقام پر اسے دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

جواب(۱): پہلی روایت (حدیثِ باب) کا جواب یہ ہے کہ اس میں شغار جاہلیت سے ممانعت وارد ہوئی ہے جس میں مہر نہیں ہوتا، وہ ہمارے نزدیک بھی ناجائز ہے، ہم نے جواز کا جو قول اختیار کیا ہے وہ مہر مثل کے ساتھ ہے، اس لیے یہ شغار ممنوع کے زمرے میں نہیں آتا؛ کیونکہ یہ نکاحِ شغار رہا ہی نہیں۔ (عمدۃ القاری، ج:۲۰، ص:۱۰۹)

(۲) دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مخالفت پر محمول ہے نہ کہ ابطال پر۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل: نکاحِ شغار کے انعقاد کا مسئلہ اصولِ فقہ کے مشہور قاعدہ کہ: ''نہی عن الافعال الشرعیہ منہی عنہ'' کی مشروعیت کا تقاضہ کرتی ہے یا نہیں؟ تو حنفیہ کے نزدیک نہی عن الافعال الشرعیہ منہی عنہ کی مشروعیت کا تقاضہ کرتی ہے، لہٰذا نکاح منعقد ہوگا اور مہر مثل واجب ہوگا۔

وجہ یہ ہے کہ أحد البضعین کو جو دوسرے کا مہر مقرر کیا گیا ہے یہ تسمیہ فاسد ہے، کیونکہ بضع مال نہیں ہے، لہٰذا ایسی صورت میں عورت مہر مثل کی مستحق ہوگی۔ اور أحد البضعین کو مہر قرار دینا شرطِ فاسد ہے اور شرطِ فاسد سے نکاح باطل نہیں ہوتا؛ بلکہ شرط باطل اور نکاح صحیح ہوجاتا ہے۔ (کشف الباری، ج:۱۰، ص:۱۷۰)

دوسری دلیل: یہ ہے کہ علامہ بدرالدین عینی نکاحِ شغار کے تعلق سے لکھتے ہیں: ''فَالعَقدُ صَحِيحٌ وَ يَجِبُ مَهرُ المِثلِ'' (کہ نکاح درست ہے اور مہر مثل واجب ہوگا) کیونکہ نکاحِ شغار میں ایسی چیز کو مہر بنایا جاتا ہے جو کہ مہر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور قاعدہ ہے کہ جو چیز مہر بننے کی صلاحیت نہ رکھے اگر اس کو مہر بنایا جائے تو عقد صحیح ہوجاتا ہے اور مہر مثل واجب ہوتا ہے۔

(ہدایہ، ج:۲، ص:۲۹۷)

(ب:۹) بَابُ نِكَاحِ السِّرِّ

خفیہ طور پر نکاح کرنے کا بیان

أَخبَرَنا مَالِكٌ عَن أبِي الزُّبيرِ أنَّ عَمَرَ أُتِيَ بِرجُلٍ فِي نكَاحٍ لَم يَشْهَدْ عَليهِ إلَّا رجُلٌ وامرَأةٌ، فَقالَ عُمَرُ: هٰذا نِكاحُ السِّرِّ وَ لاَ نُجِيْزُهُ، وَ لَوْ كُنْتُ تَقَدَّمْتُ فِيْهِ لَرَجَمْتُ.

ترجمہ: حضرت ابوزبیرؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں ایک ایسا شخص لایا گیا جس کے نکاح میں صرف ایک مرد اور ایک عورت گواہ تھی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: یہ خفیہ نکاح ہے اور ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اور اگر میں نے اس کے بارے میں پہلے سے کچھ ہدایات دی ہوتیں تو میں اس شخص کو سنگسار کر دیتا۔

چھپ کر نکاح کرنا کیسا ہے؟

تشریح: هٰذَا نِكَاحُ السِّرِّ: ان الفاظ کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسا نکاح ہے جو کہیں چھپ چھپا کر چہار دیواری کے اندر کیا جائے، جہاں عام لوگوں کا آنا جانا نہ ہو؛ لیکن اس کی تعریف یہ نہیں ہے؛ بلکہ امام محمد رحمہ اللہ نے اس کی تعریف فرمائی کہ ہر وہ نکاح جو کامل گواہی کے بغیر ہو وہ خفیہ نکاح ہے، خواہ کھلم کھلا یا تنہائی میں انجام پائے۔ اور جس نکاح میں گواہی کا نصاب کامل ہے وہ اعلانیہ ہے، خواہ بند کمرے میں کیوں نہ کیا جائے۔

نکاح کی کامل گواہی یا تو دو مردوں، یا ایک مرد اور دو عورتوں سے ہوتی ہے۔ اگر ایک مرد اور ایک عورت گواہ ہوں تو یہ نامکمل گواہی ہوگی اور نکاح خفیہ کہلائے گا،

چنانچہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس جب نامکمل گواہی کی موجودگی میں نکاح کرنے والے مرد کو لایا گیا تو آپ نے فرمایا کہ: اگر اس کے بارے میں پہلے سے میں لوگوں کو ہدایت دے چکا ہوتا کہ یہ نکاح درست نہیں، تو پھر اس شخص کو رجم کی سزا دیتا؛ کیونکہ ایسا نکاح نکاح نہیں؛ بلکہ زنا کے زمرے میں آتا ہے۔

قَالَ مُحمَّدٌ: وَ بِهٰـذا نأخـذُ، لِأنَّ النِّكاحَ لايَجُوزُ فِي أقلَّ مِن شَاهِدَينِ وَ إنَّمَا شَهِدَ عَلٰى هٰذا الَّذِي رَدَّهُ عُمَرُ بِرَجُلٍ وَ امرَأةٍ، فهٰذَا نِكاحُ السِّرِّ، لِأنَّ الشَّهادَةَ لَمْ تُكمَلْ، وَلَو كَمُلَتِ الشَّهادةُ بِرَجُلَينِ أو رَجُلٍ وَامْرأتَيْنِ كَانَ نِكاحًا جائِزًا، وإنْ كانَ سِرًّا، وَ إنَّمَا يُفسِدُ نِكاحُ السِّرِّ أنْ يَكُوْنَ بِغَيرِ شُهُودٍ، فأمَّا إذَا كَمُلتْ فِيهِ الشَّهَادَةُ فَهُوَ نِكاحُ العَلانِيَّةِ، وإنْ كانُوْا سَرُّوهُ.

ترجمہ: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں، کیونکہ دو گواہوں سے کم کی موجودگی میں نکاح جائز نہیں ہوتا۔ اور حضرت عمر فاروقؓ نے جس شخص کے نکاح کو مسترد کیا اس میں ایک مرد اور ایک عورت گواہ تھی، یہ خفیہ نکاح ہے؛ کیونکہ نکاح کی گواہی مکمل نہ تھی۔ اور اگر نکاح کی گواہی دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں سے پوری ہو جائے تو نکاح جائز ہوگا، اگرچہ وہ خفیہ طور پر کیا گیا ہو۔ اُس خفیہ نکاح کو فاسد قرار دیا گیا ہے جو گواہوں کے بغیر کیا جاتا ہے۔ اور اگر اس میں گواہی مکمل ہو تو وہ علانیہ نکاح ہوتا ہے، اگرچہ لوگ اس کو پوشیدہ رکھیں۔

نکاح کے گواہ کیسے ہونے چاہیئے؟

تشریح: حضرت امام محمدؒ کے مذکورہ قول کا وہی مطلب ہے جو باب

میں ذکر کردہ روایت کی وضاحت کے ضمن میں گزر چکا ہے، اس لیے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں؛ البتہ یہاں ایک بات بطور فائدہ کے ذکر کرتا ہوں کہ احناف کا مسلک محض قیاس پر مبنی نہیں؛ بلکہ بہت سی کتب فقہ میں مذکور ہے، چنانچہ دُرِّ مختار میں ہے: ''شرط (حُضُور) شَاهِدَين (حُرَّيْنِ) أو حُرّ وَ حُرَّتَيْنِ (مُكَلَّفَيْنِ سَامِعَيْنِ قَولَهُمَا مَعًا)'' کہ نکاح کے لیے دو آزاد مردوں، یا ایک آزاد مرد اور دو آزاد عورتوں کی گواہی شرط قرار دی گئی ہے، جو عاقل بالغ ہونے کیساتھ ساتھ میاں بیوی کے ایجاب وقبول کو اکٹھے سننے والے ہوں۔ (دُرِّ مختار، ج:۴، ص:۸۷)

قَالَ مُحَمَّدٌ: أَخبَرَنَا مُحَمَّدُ بنُ أَبانَ عَن حَمَّادٍ، عَن إبرَاهِيمَ أَنَّ عُمَرَ بنَ الخَطَّابِ أَجازَ شَهادَةَ رَجُلٍ وَ امرَأَتَينِ فِي النِّكاحِ والفُرقَةِ. قَالَ مُحَمَّدٌ: وَ بِهٰذَا نأخُذُ، وَ هُوَ قَولُ أَبِي حَنِيفَةَ.

ترجمہ: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں حضرت ابراہیم کا بیان ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کو نکاح اور علیحدگی (فسخ نکاح) میں جائز قرار دیا ہے۔ حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ بھی اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ کے اسی فیصلہ پر ہمارے مسلک کی بنیاد ہے کہ نکاح اور فسخ نکاح میں اگر ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہوں تو نکاح صحیح اور درست ہوگا۔ اور یہی حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب بھی ہے۔

(ب:۱۰) بَابُ الرَّجُلِ يَجمَعُ بَينَ المَرأَةِ وابنَتِهَا وَ بَينَ المَرأَةِ وأختِهَا فِي ملكِ اليَمِينِ

کسی مرد کا ماں بیٹی اور دو بہنوں کو ملک یمین میں جمع کرنے اور وطی کرنے کا بیان

أَخْبَرَنا مَالِكٌ، حَدَّثَنَا الزُّهرِيُّ، عَن عُبَيدِ اللّٰهِ بنِ عَبدِ اللّٰهِ بنِ عُتْبَةَ عَن أبِيهِ؛ أنَّ عَمرؓ سُئِلَ عَنِ المَرأةِ وابنَتِهَا مِمَّا مَلَكَتِ اليَمِينُ، اَتُوطَأُ إحدٰهُمَا بَعدَ الأخرىٰ؟ قَالَ: لَا أُحِبُّ أن أُجِيزَهُما جَمِيعًا، وَ نَهَاهُ.

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ قَبِيصَةَ بْنِ ذُؤَيْبٍ، أَنَّ رَجُلا سَأَلَ عُثْمَانَ عَنِ الأُخْتَيْنِ مِمَّا مَلَكَتِ الْيَمِينُ هَلْ يُجْمَعُ بَيْنَهُمَا؟ فَقَالَ: أَحلَّتْهُمَا آيَةٌ وَحَرَّمَتْهُمَا آيَةٌ، مَا كُنْتُ لِأَصْنَعَ ذَلِكَ، ثُمَّ خَرَجَ فَلَقِيَ رَجُلا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَسَأَلَهُ عَنْ ذَلِكَ؟ فَقَالَ: لَوْ كَانَ لِي مِنَ الأَمْرِ شَيْءٌ، ثُمَّ أُتِيتُ بِأَحدٍ فَعَلَ ذَلِكَ جَعَلْتُهُ نَكَالا، قَالَ ابْنُ شِهَابٍ: أُرَاهُ عَلِيًّا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ،

ترجمہ: عبید اللہ بن عبد اللہؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ سے ماں اور اس کی بیٹی کو بطور ملک یمین جمع کرنے اور یکے بعد دیگرے ان سے جماع کرنے کے سلسلے میں سوال کیا گیا؟ آپ نے فرمایا: میں اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا کہ میں ان دونوں کے ساتھ صحبت کرنے کو جائز قرار دوں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو اس سے منع فرمایا۔

ابن ذویب کہتے ہیں کہ: ایک شخص نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے دو

بہنوں کو بطورِ ملک یمین جمع کرنے کے سلسلے میں پوچھا؟ آپ نے جواب دیا: ایک آیت ان کو حلال قرار دیتی ہے: "اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ". جبکہ دوسری آیت ان دونوں کو حرام قرار دیتی ہے: "وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ". میں اس بارے میں کچھ نہیں کروں گا (یعنی کوئی سزا نہیں دوں گا)۔ پھر وہ شخص وہاں سے تشریف لے گئے، ان کی ملاقات ایک صحابی سے ہوئی، انھوں نے ان صحابی سے اس بارے میں دریافت کیا، تو وہ صحابی بولے: اگر مجھے اس بارے میں اختیار ہوا اور میرے پاس کسی ایسے شخص کو لایا جائے جس نے یہ حرکت کی ہو، میں اسے سخت سزا دوں گا۔ ابن شہاب کہتے ہیں: میرا خیال ہے کہ وہ صحابی حضرت علیؓ تھے۔

تشریح: اس حدیث کی وضاحت سے قبل ایک اصول ملاحظہ ہو:

اصول یہ ہے کہ جن دو رشتوں کو نکاح میں جمع نہیں کیا جا سکتا انہیں ملک یمین میں بھی جمع نہیں کیا جا سکتا، یعنی اگر کوئی شخص ماں بیٹی کا مالک بن جاتا ہے، یا دو بہنوں کا مالک بن جاتا ہے، تو وہ ملک یمین ہونے کی وجہ سے اُن دونوں کے ساتھ صحبت نہیں کر سکتا، کیونکہ ملک یمین کے اس حوالے سے احکام آزاد عورتوں کے ساتھ نکاح کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں، یعنی جس حوالے سے آزاد عورتوں کو جمع کرنا حرام ہے، اسی حوالے سے کنیزوں کو جمع کرنا بھی حرام ہے؛ البتہ صرف تعداد کا حکم مختلف ہے۔

اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے امام محمدؒ نے دو رشتوں (ماں بیٹی، اور دو بہنوں) کو ملک یمین میں لا کر ان سے وطی کرنے کے موضوع پر ایک حضرت عمر فاروقؓ اور دوسرا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہما کا قول ذکر فرمایا، دونوں حضرات نے اسے ناجائز قرار دیا۔ اور آخر میں حضرت علیؓ کا فیصلہ ذکر فرمایا کہ وہ ایسا کرنے

والے کو سزا دینے کے قائل تھے۔

اس مسئلہ میں احناف کا بھی یہی مسلک ہے کہ ان دو رشتوں (ماں بیٹی، دو بہنوں) کو ملک یمین میں وطی کے اعتبار سے جمع کرنا جائز نہیں ہے۔

قَالَ مُحمَّدٌ: وَ بِهٰذَا كُلِّهِ نأخُذُ، لَا ينبَغِي أن يُجْمَعَ بَينَ المَرأةِ وَ أُخْتِهَا فِي اليَمِيْنِ. قَالَ عَمَّارُ بنُ يَاسِرٍؓ: مَا حَرَّمَ اللّٰهُ تَعالٰى مِن الحَرَائِرِ شَيئًا إلَّا وَ قَدْ حَرَّمَ مِن الإمَاءِ مِثلَهُ، إلَّا أنْ يَجْمَعَهُنَّ رَجُلٌ يَعنِيْ بِذٰلِكَ أنَّهُ يَجمَعُ مَا شَاءَ مِن الإمَاءِ، وَ يَحِلُّ لَهُ فَوقَ أربَعُ حَرَائِرَ. وَ هُوَ قَولُ أبِي حَنِيفَةَؒ.

ترجمہ: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم اس روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں، عورت اور اس کی بیٹی کو (صحبت کرنے میں) جمع نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح عورت اور اس کی بہن کو بھی ملک یمین (صحبت کرنے میں) جمع نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت عمار بن یاسرؓ بیان فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے آزاد عورتوں کے بارے میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، باندیوں کے بارے میں بھی اسی چیز کو حرام قرار دیا ہے؛ البتہ صرف ایک حکم مختلف ہے، وہ یہ کہ مرد بیک وقت جتنی چاہے باندیاں رکھ سکتا ہے (اور اُن کے ساتھ صحبت بھی کرسکتا ہے)؛ لیکن وہ چار سے زیادہ آزاد عورتوں سے بیک وقت شادی نہیں کرسکتا۔ حضرت امام ابوحنیفہ بھی اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: بِهٰذَا كُلِّهِ: حضرت امام محمدؒ کے مذکورہ فرمان کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ وغیرہ صحابہ کرامؓ کے یہی مذکورہ فیصلے ہمارے اس مسلک کی بنیاد ہیں کہ نکاح اور فسخِ نکاح میں جس طرح ماں بیٹی، یا دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں

اکٹھا رکھنا جائز نہیں ہے، اسی طرح ان کو ملک یمین میں وطی میں جمع کرنا جائز نہیں ہے، چنانچہ حضرت عمار بن یاسرؓ فرماتے ہیں کہ: آدمی پر آزاد عورتوں کے سلسلے میں اللہ نے جو چیزیں حرام قرار دی ہیں، وہ باتیں باندیوں کے سلسلے میں بھی اس پر حرام کردی ہیں، ہاں! البتہ باندیوں کے سلسلہ میں اس کو یہ گنجائش ہے کہ وہ جتنی چاہے وطی میں جمع رکھ سکتا ہے مگر یہ گنجائش آزاد عورتوں کے سلسلے میں نہیں ہے۔ اور حضرت امام ابوحنیفہ کا مذہب بھی یہی ہے۔

(ب:۱۱) بَابُ: الرَّجُلِ يَنْكِحُ الْمَرْأَةَ وَلَا يَصِلُ إِلَيْهَا لِعِلَّةٍ بِالْمَرْأَةِ أَوْ بِالرَّجُلِ

نکاح ہو جانے کے بعد میاں بیوی میں سے کسی ایک کو عارضہ ہونے کی بناء پر مرد کا عورت سے ہم بستری نہ کرسکنے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا ابْنُ شِهَابٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: مَنْ تَزَوَّجَ امْرَأَةً فَلَمْ يَسْتَطِعْ أَنْ يَمَسَّهَا فَإِنَّهُ يُضْرَبُ لَهُ أَجَلُ سَنَةٍ، فَإِنْ مَسَّهَا، وَإِلَّا فُرِّقَ بَيْنَهُمَا.

ترجمہ: سعید بن مسیبؒ کہتے ہیں: کہ جو شخص کسی عورت کے ساتھ شادی کرلے اور پھر اس کے ساتھ صحبت نہ کرسکے، تو اس کو ایک سال کی مہلت دی جائے گی، اگر وہ اس دوران صحبت کرنے پر قادر ہو جاتا ہے، تو ٹھیک ہے؛ ورنہ ان (میاں بیوی) کے درمیان علیحدگی کرادی جائے گی۔

تشریح: اس باب میں حضرت سعید بن مسیبؒ کا اثر مذکور ہے، جس میں یہ فرمایا کہ جماع پر قدرت نہ رکھنے والے کو ایک سال کی مہلت دی جائے گی،

اگر علاج وغیرہ سے وہ جماع پر قادر ہو گیا، تو اس کی بیوی کو علیحدگی کا کوئی اختیار نہیں۔ اور اگر وہ بدستور نااہل رہا، تو اس کی بیوی بذریعہ قاضی تفریق کرالے گی اور یہ طلاق طلاقِ بائنہ شمار ہوگی۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ إِنْ مَضَتْ سَنَةٌ وَلَمْ يَمَسَّهَا خُيِّرَتْ فَإِنِ اخْتَارَتْهُ فَهِيَ زَوْجَتُهُ، وَلَا خِيَارَ لَهَا بَعْدَ ذٰلِكَ أَبَدًا، وَإِنِ اخْتَارَتْ نَفْسَهَا فَهِيَ تَطْلِيقَةٌ بَائِنَةٌ، وَإِنْ قَالَ إِنِّي قَدْ مَسِسْتُهَا فِي السَّنَةِ إِنْ كَانَتْ ثَيِّبًا فَالْقَوْلُ قَوْلُهُ مَعَ يَمِينِهِ، وَإِنْ كَانَتْ بِكْرًا نَظَرَ إِلَيْهَا النِّسَاءُ، فَإِنْ قُلْنَ هِيَ بِكْرٌ، خُيِّرَتْ بَعْدَ مَا تُحَلَّفُ بِاللّٰهِ مَا مَسَّهَا. وَإِنْ قُلْنَ هِيَ ثَيِّبٌ، فَالْقَوْلُ قَوْلُهُ مَعَ يَمِينِهِ، لَقَدْ مَسِسْتُهَا. وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ اور امام ابوحنیفہؒ بھی اسی بات کے قائل ہیں کہ جب ایک سال گذر جائے اور وہ شخص اس کے ساتھ صحبت نہ کر سکے تو عورت کو اختیار دیا جائے گا، اگر وہ عورت اس مرد کے ساتھ رہنا پسند کرتی ہے تو وہ اس کی بیوی شمار ہوگی اور پھر اس کے بعد اس عورت کو کبھی اختیار حاصل نہیں ہوگا؛ لیکن اگر وہ عورت اپنی ذات کو اختیار کر لیتی ہے تو اُسے ایک طلاقِ بائنہ ہوگی۔ اور اگر مرد یہ کہتا ہے کہ میں نے اس ایک سال کے دوران اس عورت سے کے ساتھ صحبت کر لی تھی، تو اگر وہ عورت ثیبہ ہو تو اس سلسلے میں مرد کا قول معتبر ہوگا اور اس سے قسم لی جائے گی، لیکن اگر وہ عورت کنواری ہو تو خواتین اس کا جائزہ لیں گی، اگر وہ یہ کہتی ہیں کہ یہ ابھی بھی کنواری ہے تو عورت کو اختیار دیا جائے گا اور وہ اللہ کے

نام کے ساتھ قسم اُٹھائے گی کہ اس مرد نے اس عورت کے ساتھ صحبت نہیں کی ہے، لیکن اگر وہ خواتین یہ کہتی ہیں کہ یہ عورت ثیبہ ہے تو اس بارے میں مرد کا قول معتبر ہوگا اور اس سے قسم لے لی جائے گی، وہ یہ قسم اُٹھائے گا کہ میں اُس کے ساتھ صحبت کر چکا ہوں۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمدؒ کے مذکورہ قول کی تشریح کی ایک صورت پیچھے حدیث کی ضمن میں آ چکی ہے۔

وإنْ قالَ قَد مَسستُها: اب یہاں سے اس بات کو بیان کر رہے ہیں کہ اگر میاں بیوی کے درمیان وطی کرنے یا نہ کرنے کے متعلق اختلاف ہو جائے، تو وہاں کس طریقے کو اختیار کیا جائے گا؟ چنانچہ فرماتے ہیں: اس کی ایک صورت یہ ہے کہ سال ختم ہونے پر مرد کہتا ہے کہ میں نے وطی کی۔ اور عورت اس کا انکار کرتی ہے۔ اب عورت کی حالت دیکھی جائے گی کہ وہ ثیبہ ہے یا باکرہ، اور تحقیق کرنے والی عورتیں گواہی دیتی ہیں کہ یہ ثیبہ ہے، تو اس صورت میں مرد سے قسم دلائی جائے گی کہ وہ حلفاً کہے: ''میں نے وطی کی ہے''۔ اس پر مرد کی بات تسلیم کی جائے گی۔

ایک سوال اور اس کا جواب

سوال: مرد کو قسم دلانے کی ضرورت نہ تھی؛ کیونکہ وہ ثیبہ تھی اور اس کے ثیبہ ہونے کی عورتوں نے گواہی بھی دی ہے، لہٰذا مرد سچا ہے، اسے قسم نہیں دلانی چاہیے؟

جواب: یہ ہے کہ صورتِ مذکورہ میں عورت مدعیہ ہے اور مرد منکر، وہ اس طرح کہ عورت نے دعویٰ کیا کہ میرا خاوند جماع کرنے کے قابل نہیں اور نہ ہی اس نے سال بھر میں جماع کیا، مرد اس کا انکار کرتا ہے، لہٰذا ''البَيِّنَةُ عَلَى المُدَّعِي واليَمِينُ عَلَى مَن أنكرَ'' کے تحت منکر پر قسم آتی ہے، اس لیے مرد سے قسم کھلائی

جائے گی۔ مزید یہ کہ ثیبہ ہونا صرف جماع کے ساتھ مخصوص نہیں؛ بلکہ اچھلنے، کودنے، یا کسی بیماری وغیرہ سے بھی پردۂ بکارت زائل ہوسکتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس اختلاف کے بعد عورت باکرہ نکلی اور عورتوں نے باکرہ ہونے کی گواہی دی، تو اب عورت کو اختیار ملے گا؛ لیکن عورت کو اس صورت میں قسم بھی اُٹھانا پڑے گی؛ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ مرد نے وطی کی ہو، لیکن پردۂ بکارت اس سے زائل نہ ہوا ہو۔ اب اس صورت میں مرد مدعی ہوگا کہ میں نے اس سے جماع کیا اور عورت منکر ہونے کی وجہ سے قسم اُٹھائے گی۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء کا یہی مذہب ہے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا مُجَبَّرٌ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ، أَنَّهُ قَالَ: أَيُّمَا رَجُلٍ تَزَوَّجَ امْرَأَةً وَبِهِ جُنُونٌ، أَوْ ضُرٌّ فَإِنَّهَا تُخَيَّرُ إِنْ شَاءَتْ قَرَّتْ وَإِنْ شَاءَتْ فَارَقَتْ.

ترجمہ: حضرت سعید بن مسیّب کہتے ہیں کہ جس شخص نے کسی عورت سے شادی کی درآں حالانکہ اس مرد کو جنون یا کوئی اور بیماری لاحق ہے، تو عورت کو اختیار ملے گا، اگر چاہے تو اس نکاح کو برقرار رکھے اور اگر چاہے تو علیحدگی اختیار کرلے۔

تشریح: اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے علامہ ''ابن رشد'' نے یہ بات تحریر کی ہے کہ کسی نکاح کو برقرار رکھنے یا کالعدم قرار دینے کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ اختلاف دو حوالوں سے ہے۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ کیا عیب کی وجہ سے نکاح کو مسترد کیا جاسکتا ہے، یا نہیں؟

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کون سے عیوب ہیں جن کی وجہ سے نکاح کو مسترد کیا جاسکتا ہے اور کن کی وجہ سے نکاح کو مسترد نہیں کیا جاسکتا؟

اس حوالے سے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا اختلاف پایا جاتا ہے۔

چنانچہ چار بیماریوں کی وجہ سے نکاح کو مسترد کیا جاسکتا ہے: (۱) جنون (۲) جذام (۳) برص (۴) شرمگاہ کی وہ بیماری جو صحبت کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے، خواہ اس کی وجہ عورت کی شرمگاہ کا تنگ ہونا ہو، یا اُس کی شرمگاہ کا ملا ہوا ہونا ہو، جب کہ مرد میں یہ چیزیں عِنِّین اور خَصِّی (صحبت کے قابل نہ ہونا) ہیں۔

امام مالکؒ نے چار بیماریوں کے بارے میں اختلاف کیا ہے، یعنی مرد یا عورت میں سے کسی ایک کو دانتوں کی بیماری ہو، یا منھ سے بدبو آتی ہو، یا شرمگاہ سے بدبو آتی ہو، یا مرد گنجا ہو۔ ایک قول کے مطابق ان بیماریوں کی وجہ سے نکاح کو مسترد کیا جاسکتا ہے، جب کہ دوسرے قول کے مطابق مسترد نہیں کیا جاسکتا۔

امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں کہ صرف دو بیماریاں ایسی ہیں جن کی وجہ سے نکاح کو مسترد کیا جاسکتا ہے، وہ "قرن" اور "رتق" ہے (یہ بیماریاں خاتون کے ساتھ مخصوص ہیں)۔ اختلاف کی رو سے اگر دیکھا جائے تو یہ ایک عام بات ہوئی۔ (بدایۃ المجتہد، ج:۲، ص:۴۳)

باب میں ذکر کردہ حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ فرمایا کہ "عِنِّین" یا "مَجْبُوب" کے علاوہ دوسری بیماریوں، مثلاً: جنون، جذام اور برص وغیرہ، کہ جن کی وجہ سے میاں بیوی کے درمیان تعلق قائم نہیں ہوسکتا، ان بیماریوں میں قاضی عورت کو بغیر مہلت کے اختیار دے گا، جیسا کہ باب کی روایت سے واضح ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: إِذَا كَانَ أمرًا لَا يَحتَمِلُ خُيِّرَتْ، فَإِنْ شَاءَ قَرَّتْ، وإن، شَاءَ فَارَقَتْ، وَ إِلَّا لَا خِيَارَ لَهَا، إِلَّا فِي العِنِّينِ وَالمَجْبُوْبِ.

ترجمہ: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: جب مرد کو ایسی

بیماری لاحق ہو جس کے ٹھیک ہونے کا امکان نہ ہو، تو عورت کو اختیار دیا جائے گا، اگر وہ چاہے تو اس کے ساتھ رہے گی اور اگر چاہے تو علیحدگی اختیار کر لے گی۔ ویسے عورت کو اختیار صرف اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے، جب مرد ''عنین'' (نامرد) یا ''مجبوب'' ہو (جس کا عضو مخصوص کٹا ہوا ہو)۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ فرمان کا مطلب یہ ہے کہ اگر شوہر کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہے کی بیوی کے لئے اس کے پاس رہنا بالکل ممکن نہ رہے، تو عورت کو اختیار ہے، چاہے تو وہ اس کے پاس رہنے کو اختیار کر لے یا اس سے علیحدگی اختیار کر لے؛ لیکن اگر شوہر کی بیماری بیوی کے لئے قابل تحمل ہے تو عورت کو علیحدگی کا کوئی اختیار نہیں ملے گا؛ ہاں البتہ شوہر اگر ''عِنّین'' یا ''مجبوب'' ہو تو اُسے علیحدگی یا مصاحبت (ساتھ رہنا) کا اختیار ملے گا۔

(ب: ۱۲) بَابُ: البِکرِ تُستَأمَرُ فِی نَفسِهَا

کنواری عورت سے اجازت لینے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ الْفَضْلِ، عَنْ نَافِعِ بْنِ جُبَيْرٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: الأَيِّمُ أَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا، وَالْبِكْرُ تُسْتَأْمَرُ فِي نَفْسِهَا، وَإِذْنُهَا صُمَاتُهَا.

ترجمہ: عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: عورت اپنے ولی کے مقابلے میں اپنی ذات پر زیادہ حق رکھتی ہے۔ اور باکرہ لڑکی سے اس کی مرضی معلوم کی جائے گی۔ اس کی خاموشی ہی اس کی اجازت ہوگی۔

تشریح: "أیِّم" کا لفظ تشدید کے ساتھ ہے۔ "أیِّم" اس عورت کو کہتے ہیں جس کا شوہر نہ ہو، خواہ باکرہ ہو، یا ثیبہ ہو، مطلقہ ہو، یا شوہر کا انتقال ہو گیا ہو؛ لیکن یہاں اس حدیث میں صرف ثیبہ مراد ہے، یعنی جن کی بکارت زائل ہو چکی ہو، خواہ نکاحِ صحیح سے زائل ہوئی ہو، یا نکاحِ فاسد سے، یا شبہِ وطی سے، یا زنا سے، اور یا چھلانگ وغیرہ سے ختم ہو گئی ہو۔ علامہ طیبیؒ نے ایسا ہی لکھا ہے۔

اس حدیث میں "أیِّم" کے ساتھ "نفسھا" کا لفظ آیا ہے، کیونکہ ثیبہ میں اصل نسوانی حیاء باقی نہیں رہتی، لہٰذا وہ اپنے نکاح کا خود حکم دے کر الفاظ کی قطار لگا دے گی۔

اور البکر کے ساتھ اذن اور اجازت کا لفظ لگا ہوا ہے، کیونکہ وہ دوشیزہ ہے، اس میدان میں نسوانی حیاء اس میں کامل ہوتی ہے، تو زبان سے حکم نہیں دے سکتی ہے، اس لیے اس کا چپ رہنا اور سکوت اس کی رضامندی پر دلالت کرے گا۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَذَاتُ الأَبِ وَغَيْرِ الأَبِ فِي ذَلِكَ سَوَاءٌ.

ترجمہ: حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ اور امام ابو حنیفہؒ بھی اسی بات کے قائل ہیں، خواہ لڑکی کا باپ اُس کا ولی ہو، یا باپ کے علاوہ کوئی اور ولی ہو، دونوں صورتوں میں حکم برابر ہے۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ باکرہ بالغہ کے نکاح کے نفاذ کے لیے اس کی اجازت ضروری ہے اور اس اجازت کے لینے میں باپ اور غیر باپ سب برابر ہیں۔ اور ہم نے اس سلسلے میں مذکورہ حدیث ہی کو اپنا مستدل بنایا ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا قَيْسُ بْنُ الرَّبِيعِ الأَسَدِيُّ، عَنْ عَبْدِ الْكَرِيمِ الْجَزَرِيِّ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: تُسْتَأْذَنُ الأَبْكَارُ فِي أَنْفُسِهِنَّ ذَوَاتِ الأَبِ وَغَيْرِ الأَبِ، قَالَ مُحَمَّدٌ: فَبِهٰذَا نَأْخُذُ.

ترجمہ: سعید بن میبّب کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کنواری لڑکیوں سے اُن کے بارے میں اجازت لی جائے گی؛ خواہ اُن کا باپ (ولی ہو)، یا باپ کے علاوہ کوئی اور ہو۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں: ہم اس روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔

تشریح: واضح رہے کہ مذکورہ روایت کی تشریح وتوضیح وہی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے تحت آچکی ہے کہ کنواری لڑکی سے اجازت لی جائے گی، خواہ ولی اس کا باپ ہو، یا کوئی اور ہو۔ ہاں! البتہ اس کے ضمن میں ایک اور اختلاف آتا ہے، جسے عرفِ عام میں ''ولایت اِجبار'' کا نام دیا جاتا ہے، اس میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔

ولایت اِجبار میں فقہائے کرامؒ کا اختلاف

سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ولایت اِجبار اور عدمِ اِجبار میں عورتوں کی چار اقسام ہیں:

(۱) پہلی قسم: ثیبہ بالغہ ہے۔ اس قسم کی عورتوں میں تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ ثیبہ کی اجازت ضروری ہے، بغیر اجازت نکاح درست نہیں ہے۔

(۲) دوسری قسم: باکرہ صغیرہ ہے، اس میں بھی تمام علماء کا اتفاق

ہے کہ اس کے نکاح کے لئے اس سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۳) **تیسری قسم:** "ثیبہ صغیرہ" ہے۔ اس میں جمہور کا خیال ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہوسکتا ہے؛ مگر احناف کہتے ہیں کہ یہاں اسکی اجازت کی ضرورت نہیں۔ صورت یہ ہے کہ لڑکی چھوٹی ہے اور بلوغت سے پہلے بیوہ ہوگئی۔

(۴) **چوتھی قسم:** باکرہ بالغہ ہے۔ اس میں بھی اختلاف ہے۔ علمائے احناف فرماتے ہیں کہ اس کا نکاح اس کی رضامندی اور اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے۔ جمہور کہتے ہیں کہ اس کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح اس کا ولی کرا سکتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ نکلا کہ احناف کے نزدیک ولایت اِجبار کا مدار صرف صغر پر ہے، یعنی کم سن لڑکی پر اولیاء کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر اس کا نکاح کرائیں؛ خواہ ثیبہ ہو، یا باکرہ ہو۔

جمہور کے نزدیک ولایت اِجبار کا مدار بکارت پر ہے۔ ولی کو جبر کا حق صرف اس صورت میں حاصل ہوگا جب لڑکی کنواری باکرہ ہو؛ خواہ بالغہ ہو یا نابالغہ ہو۔ شروع کی دوصورتوں میں سب کا اتفاق ہے۔ اور اخیر کی دوصورتوں میں فقہاء کا اختلاف ہے، جس کی تفصیل ماقبل میں آچکی ہے۔

جمہور کی دلیل: جمہور کے پاس ولایت اِجبار کے لیے ایسی کوئی صریح حدیث نہیں ہے جو جبر کی تمام صورتوں کے لیے دلیل بن جائے، صرف ایک حدیث کے مفہومِ مخالف سے اپنے مدعا پر دلیل قائم کرتے ہیں، وہ ابن عباسؓ کی حدیث ہے: "الأَیِّمُ أَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِیِّهَا" کہ عورت اپنی ذات کے بارے میں ولی سے زیادہ حقدار ہے۔ اور عورت سے یہاں "ثیبہ" مراد ہے۔ اب اگر اس کا

مفہوم مخالف نکالا جائے، تو یہ عبارت ہوگی: "وَالبِكرُ لَيسَتْ أحَقّ بنفسِهَا مِن وَلِيّهَا" کہ باکرہ اپنی ذات پر ولی سے زیادہ حقدار نہیں ہے۔ اسی مفہومِ مخالف سے استدلال کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ باکرہ اپنے نکاح کی حقدار نہیں؛ بلکہ ولی کو اس پر ولایت اِجبار حاصل ہے اور ثیبہ اپنے نکاح کی حقدار ہے، اس لیے اس پر ولی کو ولایت اِجبار حاصل نہیں ہوگی۔

جواب: یہ ہے کہ ہم مفہومِ مخالف کو نہیں مانتے ہیں، کیونکہ مفہومِ مخالف کو اگر بطورِ قاعدہ اور ضابطہ تسلیم کیا جائے، تو شریعت کے بعض نصوص کے مفہومِ مخالف کے ماننے سے شریعت کی کھلی خلاف ورزی لازم آئے گی۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ جب مفہومِ موافق موجود ہے اور حکم منطوق ثابت ہے، تو مفہومِ مخالف کی طرف اور غیر منطوق حکم کی طرف جانے کی نہ ضرورت ہے اور نہ مناسب ہے، اس لیے ہمارے دلائل راجح ہیں۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل: احناف نے زیرِ بحث حدیث سے استدلال کیا ہے: وَالْبِكْرُ تُسْتَأْمَرُ فِي نَفْسِهَا، وَإِذْنُهَا صُمَاتُهَا. دوسری دلیل: حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے، جس میں لَا تُنكَحُ البِكرُ حتّٰى تُستأذن. تیسری دلیل: اَليَتِيمَةُ تُستأمَرُ فِي نَفْسِهَا. جیسے الفاظ ہیں، یتیمہ باکرہ کے معنیٰ میں ہے۔ یہ متعدد احادیث اس پر واضح دلالت کرتی ہیں کہ باکرہ جب بالغہ ہو، وہ اپنے نکاح کا اختیار خود رکھتی ہے، اس پر کوئی جبر نہیں کرسکتا۔ ہاں! یہ الگ بات ہے کہ عورت اپنے نکاح کا معاملہ اپنے بزرگوں کے حوالے کرے۔

☆☆☆

(ب:۱۳) بَابُ النِّکَاحِ بِغَیرِ وَلِیٍّ

ولی کی عدمِ موجودگی میں نکاح کرنے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا رَجُلٌ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، قَالَ: قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِؓ: لا يَصْلُحُ لامْرَأَةٍ أَنْ تُنْكَحَ إِلا بِإِذْنِ وَلِيِّهَا، أَوْ ذِي الرَّأْيِ مِنْ أَهْلِهَا، أَوِ السُّلْطَانِ.

ترجمہ: سعید بن مسیّب کہتے ہیں: حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا: اگر کوئی عورت اپنے ولی یا اپنے خاندان کے صاحب الرائے یا خلیفۂ وقت کی اجازت کے بغیر نکاح کر لے، تو درست نہیں ہے۔

تشریح: نکاح زندگی بھر کے بندھن کا نام ہے۔ شریعت نے اس میں سوچ سمجھ کر قدم رکھنے کی تعلیم دی ہے، اس کے لیے لازم ہے کہ فریقین کی رضا ورغبت اس میں شامل ہو؛ تاکہ بعد میں کوئی پیچیدگی نہ آئے، شریعت نے نہایت اعتدال کے ساتھ ایک طرف اولیاء کو ترغیب دی ہے کہ وہ لڑکی کی مرضی کا خیال رکھا کریں۔ اور دوسری طرف لڑکی کو ترغیب دی ہے کہ وہ اپنے ولی کی مرضی کے بغیر نکاح نہ کرے؛ تاہم یہ ترغیب کا معاملہ ہے، لیکن اگر کوئی عاقلہ بالغہ لڑکی کفو میں مہر مثل پر نکاح کرتی ہے اور ولی سے اجازت نہیں لیتی، یا اس کا نکاح کوئی دوسری عاقلہ بالغہ عورت کراتی ہے، جس کو ''انعقاد النکاح بعبارۃ النساء'' کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے، تو کیا اس سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے، یا نہیں؟ فقہائے کرام کا اس میں اختلاف ہے، ملاحظہ فرمائیں:

عبارۃ النساء اور اختلافِ ائمہ

ائمہ ثلاثہ کا مذہب: ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ اِذن ولی کے بغیر نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔

امام ابو حنیفہ کا مذہب: امام صاحب فرماتے ہیں کہ اگر نکاح کفو میں ہوا ہے اور مہر مثل مقرر ہے تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔ اور اگر غیر کفو میں ہوا ہے، یا مہر مثل سے کم پر نکاح ہوا ہے تو امام صاحب سے دو روایتیں ہیں: ایک ظاہر الروایہ ہے، وہ یہ کہ نکاح تو ہو جائے گا؛ مگر ولی کو اس نکاح کے فسخ کرانے کا حق حال ہوگا۔ نادر الروایہ یہ ہے کہ نکاح بالکل صحیح نہیں ہے، لہٰذا راجح اور مفتی بہ قول یہ ہے کہ نکاح منعقد نہیں ہوگا۔ (بدایة المجتهد، ج:۳، ص:۴۴)

ائمہ ثلاثہ کی دلیل: قولہ تعالیٰ: ﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ﴾.

اس آیت میں اولیاء کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ تم عورتوں کی شادی کر دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کی شادی اولیاء کریں گے، بغیر ان کے شادی نہیں ہو سکتی۔ اور حدیث میں ہے: لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ. (ترمذی، ج:۱، ص:۲۸) نیز حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے: أَيُّمَا امرأةٍ نَكَحَتْ بِغَيرِ إِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ، فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ، فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ. (دارقطني، ج:۳، ص:۲۲۱) ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح منعقد ہونے کے لیے ولی کی اجازت ضروری ہے، بغیر اس کی اجازت کے نکاح منعقد نہیں ہو سکتا۔

جواب: یہ ہے کہ آیت کریمہ میں عورتوں کے بجائے اولیاء سے اس لیے خطاب کیا گیا ہے، کیونکہ عورت باحیاء ہوتی ہے، خود سے نکاح کے لیے نہیں کہہ سکتی۔ دوسرے یہ کہ نکاح کے لیے محفل نکاح میں جانا ہوتا ہے، وہاں بھی عورت

نہیں جاسکتی ہے، اس لیے اولیاء سے خطاب کیا گیا ہے، اس لیے نہیں کہ بغیر اس کے نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

حدیث اوّل کا جواب یہ ہے کہ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر غیر کفو میں نکاح ہوا ہو تو ولی کی اجازت ضروری ہے، یعنی اگر غیر کفو میں نکاح ہوا ہو تو ولی اس کو فسخ کرسکتا ہے، گویا یہ نکاح ولی کی اجازت پر موقوف ہے۔

دوسری حدیث کا جواب یہ ہے کہ خود حضرت عائشہؓ کا عمل اس روایت کے برعکس ہوا ہے، کیونکہ آپ نے عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کی بیٹی کا نکاح خود کروادیا، جس پر عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ ناراض تھے؛ مگر نکاح کو نافذ مانا گیا، لہٰذا اس روایت میں یہ روایت قابل حجت نہیں۔ (توضیحات، ج:۵،ص:۷۲)

امام ابوحنیفہ کی دلیل: قرآنِ کریم میں متعدد جگہ نکاح کرنے کی اضافت عورتوں کی طرف کی گئی ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ﴾. اس آیت میں کہا گیا ہے کہ جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دیدو اور اُن کی عدت مکمل ہوجائے تو تم ان کو دوسرے شوہروں سے نکاح کرنے سے مت روکو۔ اس میں نکاح کرنے کی نسبت عورتوں کی طرف کی گئی ہے، معلوم ہوا کہ عورت اپنے نکاح کی خود حقدار ہے۔ نیز ابن عباسؓ سے مروی ہے: الأَيِّمُ أَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا.

دلیل عقلی: سے اس طرح استدلال کیا ہے کہ عورت انسان ہے، جب ان کو تمام فسوخ وعقود کا حق حاصل ہے تو نکاح بھی ایک عقد ہے، اس میں عورت کو حیوانات کی طرح نہیں رکھا جاسکتا ہے، لہٰذا ''عبارات النساء'' سے بھی نکاح منعقد ہوجاتا ہے اور ولی کی اجازت کے بغیر بھی۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: لا نِكَاحَ إِلا بِوَلِيٍّ، فَإِنْ تَشَاجَرَتْ هِيَ وَالْوَلِيُّ فَالسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لا وَلِيَّ لَهُ، فَأَمَّا أَبُو حَنِيفَةَ، فَقَالَ: إِذَا وَضَعَتْ نَفْسَهَا فِي كَفَاءَةٍ وَلَمْ تُقَصِّرْ فِي نَفْسِهَا فِي صَدَاقٍ، فَالنِّكَاحُ جَائِزٌ، وَمِنْ حُجَّتِهِ قَوْلُ عُمَرَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ: أَوْ ذِي الرَّأْيِ مِنْ أَهْلِهَا، إِنَّهُ لَيْسَ بِوَلِيٍّ، وَقَدْ أَجَازَ نِكَاحَهُ لأَنَّهُ إِنَّمَا أَرَادَ أَنْ لا تُقَصِّرَ بِنَفْسِهَا فَإِذَا فَعَلَتْ هِيَ ذَلِكَ جَازَ.

ترجمہ: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ولی کی اجازت کے بغیر نکاح درست نہیں ہوتا۔ اگر عورت اور اس کے ولی کے درمیان اس سلسلے میں اختلاف ہو جاتا ہے، تو جس کا کوئی ولی نہ ہو، حاکمِ وقت اس کا ولی ہوتا ہے۔ بہرحال امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: جب کوئی عورت اپنے کفو میں نکاح کرے اور اس کے مہرِ مثل میں بھی کمی نہ ہو، تو وہ نکاح درست ہے۔ اس کی دلیل حضرت عمر فاروقؓ کا قول ہے، جو مذکورہ حدیث میں مذکور ہے أَوْ ذِي الرَّأْيِ مِنْ أَهْلِهَا، جب کی وہ ولی نہیں ہے۔ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے نکاح کو جائز قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی غرض یہ تھی کہ عورت مہر میں کمی نہ کرے، جب عورت ایسا کر لیتی (مہرِ مثل متعین کر لیتی) ہے، تو نکاح جائز قرار پائے گا۔

تشریح: قَوْلُه: لا نِكَاحَ إِلا بِوَلِيٍّ: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ اپنا مسلک بیان فرماتے ہیں کہ: ولی کے بغیر نکاح درست نہیں ہوگا؛ مگر چونکہ مذکورۂ بالا حدیث ان کے اس مسلک کے معارض ہے، اس لیے تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: مذکورۂ بالا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر عورت اور اس کے ولی میں نکاح

کے سلسلے میں اختلاف ہو جائے، مثلاً: عورت کسی ایک متعین شخص سے نکاح کرنا چاہتی ہے اور ولی اس سے راضی نہیں ہے، تو اس صورت میں یہ ولایت دوسروں کی جانب منتقل ہوگی۔ اور حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ ولی کے بغیر نکاح ہو جائے گا۔

فأمّا أبو حنيفة: حضرت امام ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ بالغ اپنا نکاح کرنے میں خود مختار ہے، لہٰذا اگر وہ ولی کی اجازت کے بغیر بھی اپنا نکاح کر لے، تو وہ نکاح درست قرار پائے گا؛ البتہ دو صورتوں میں ولی کو نکاح پر اعتراض کا حق ہوگا:

(۱) ایک یہ کہ عورت غیر کفوء میں نکاح کر لے۔

(۲) دوسرے یہ کہ وہ مہر مثل سے کم پر نکاح کر لے۔

وَ مِنْ حُجَّتِہٖ: حضرت امام صاحبؒ کے مسلک کے دو جزء ہیں: ایک یہ کہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح درست ہونا۔ دوسرے یہ کہ عدمِ کفاءت اور مہر مثل میں کمی کی وجہ سے ولی کو اعتراض کا حق ہونا۔ پہلے جزء کی دلیل حضرت عمر کا یہ فرمان کہ: "ذَوِي الرأي مِن أهلِها" یعنی خاندان کے ذی رائے شخص کی اجازت بھی نکاح کے نفاذ کے لئے درست ہے، تبھی حضرت عمرؓ نے مذکورہ فرمان میں ذوی الرأی کی اجازت سے نکاح کو جائز قرار دیا؛ حالانکہ وہ ولی نہیں تھے۔

لأَنَّهُ إِنَّمَا أَرَادَ: یہاں سے دوسرے جزو کی دلیل بیان کی ہے، وہ یہ ہے کہ ولی یا ذوی الرأی کی اجازت کی قید اس لیے لگائی گئی کہ عورت خود کا نقصان نہ کر بیٹھے اور خود کا نقصان یہی غیر کفوء میں نکاح کرنا اور مہر مثل میں کمی ہے، اس لیے اگر عورت خود سے نکاح کر کے اس نقصان میں پڑے تو مذکورہ حضرت عمرؓ کے فرمان کی وجہ سے اولیاء کو اعتراض کا حق حاصل ہوگا۔

(ب: ۱۴) بابُ الرَّجُلِ يَتزوّجُ المَرأة ولا يَفرِضُ لَها صَداقًا

مہر مقرر کیے بغیر نکاح کرنے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، حَدَّثَنَا نَافِعٌ، أَنَّ بِنْتًا لِعُبَيْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ وَأُمُّهَا ابْنَةُ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍؓ كَانَتْ تَحْتَ ابْنٍ لِعَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ فَمَاتَ، وَلَمْ يُسَمِّ لَهَا صَدَاقًا، فَقَامَتْ أُمُّهَا تَطْلُبُ صَدَاقَهَا؟ فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: لَيْسَ لَهَا صَدَاقٌ وَلَوْ كَانَ لَهَا صَدَاقٌ لَمْ نُمْسِكْهُ وَلَمْ نَظْلِمْهَا، فَأَبَتْ أَنْ تَقْبَلَ ذَلِكَ فَجَعَلُوا بَيْنَهُمْ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ فَقَضَى أَنْ لا صَدَاقَ لَهَا، وَلَهَا الْمِيرَاثُ، قَالَ مُحَمَّدٌ: وَلَسْنَا نَأْخُذُ بِهَذَا.

ترجمہ: نافعؒ کہتے ہیں کہ عبیداللہ بن عمرؓ کی صاحبزادی جو حضرت زید بن ثابتؓ کی نواسی تھیں وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے کے نکاح میں تھی، ان کا انتقال ہو گیا اور نکاح کے وقت ان کا مہر مقرر نہیں کیا گیا تھا، ان کی والدہ نے (ان کے انتقال کے بعد مہر) وصول کرنے کا مطالبہ کیا، تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ اس کے لیے کوئی حق مہر نہیں ہے۔ اور اگر حق مہر ہوتا تو ہم اسے نہ روکتے اور نہ ہم نے اس عورت پر کوئی زیادتی کی ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کی اس بات کو اس عورت کی والدہ نے تسلیم نہ کیا اور لوگوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کو ان کے درمیان ثالث مقرر کیا، انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ اس عورت کو حق مہر نہیں ملے گا؛ البتہ اسے وراثت میں حصہ ملے گا۔ حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ: ہم اس روایت کے مطابق فتویٰ نہیں دیتے۔

تشریح: اس روایت میں مسئلہ یہ ہے کہ کسی شخص نے نکاح کیا اور نکاح کے وقت لڑکی کا مہر مقرر نہیں کیا اور وطی کرنے سے قبل خاوند کا انتقال ہو گیا، تو اب **سوال** یہ ہے کہ اس عورت کو مہر ملے گا یا نہیں؟ تو **جواب** میں ذکر کردہ روایت سے پتہ چلتا ہے کہ مہر نہیں ملے گا، چونکہ روایت میں ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے صاحبزادے کا انتقال ہو گیا، تو اس پر لڑکی کی والدہ نے اپنی بیٹی کے حق مہر کا مطالبہ کیا، کیونکہ حق مہر بوقتِ نکاح مقرر نہیں کیا تھا، اس لئے حضرت عمرؓ اور زید بن ثابتؓ نے یہ فیصلہ دیا کہ اس صورت میں حقِ مہر نہیں ملے گا۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ جب حقوقِ زوجیت ادا نہیں ہوئے، جس کی وجہ سے حق مہر لازم ہوتا ہے، تو حق مہر کی ادائیگی بھی لازم نہ ہوگی، ہاں میراث میں سے حصہ ملے گا۔ اس روایت کے بارے میں امام محمدؒ فرماتے ہیں کی ہمارا اس روایت پر عمل نہیں ہے۔

أَخْبَرَنَا أَبُو حَنِيفَةَ، عَنْ حَمَّادٍ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ النَّخَعِيِّ، أَنَّ رَجُلا تَزَوَّجَ امْرَأَةً وَلَمْ يَفْرِضْ لَهَا صَدَاقًا، فَمَاتَ قَبْلَ أَنْ يَدْخُلَ بِهَا، فَقَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْعُودٍ: لَهَا صَدَاقُ مِثْلِهَا مِنْ نِسَائِهَا، لا وَكْسَ، وَلا شَطَطَ، فَلَمَّا قَضَى قَالَ: فَإِنْ يَكُنْ صَوَابًا فَمِنَ اللَّهِ، وَإِنْ يَكُنْ خَطَأً فَمِنِّي، وَمِنَ الشَّيْطَانِ، وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ بَرِيئَانِ، فَقَالَ رَجُلٌ مِنْ جُلَسَائِهِ: بَلَغَنَا أَنَّهُ مَعْقِلُ بْنُ سِنَانٍ الأَشْجَعِيُّ، وَكَانَ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، قَضَيْتَ وَالَّذِي يُحْلَفُ بِهِ بِقَضَاءِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي بَرْوَعَ ابنةِ وَاشِقٍ الأَشْجَعِيَّةِ، قَالَ: فَفَرِحَ عَبْدُ اللَّهِ فَرْحَةً مَا فَرِحَ قَبْلَهَا مِثْلَهَا لِمُوَافَقَةِ قَوْلِهِ قَوْلَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ مَسْرُوقُ بْنُ الأَجْدَعِ: لا يَكُونُ مِيرَاثٌ حَتَّى يَكُونَ قَبْلَهُ صَدَاقٌ.

ترجمہ: ابراہیم نخعیؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک عورت کے ساتھ شادی کر لی اور اس کا مہر مقرر نہیں کیا، پھر اس عورت کے ساتھ صحبت کرنے سے پہلے اس کا انتقال ہو گیا، تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس عورت کو اس کے جیسی دیگر خواتین کی طرح مہر مثل ملے گا، اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوگی۔ جب انہوں نے یہ فیصلہ سنا دیا تو بولے: اگر یہ درست ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اگر غلط ہے تو میری طرف سے ہے، اور شیطان کی طرف سے ہے، اللہ اس کا رسول اس سے بری ہوں گے۔ تو اُن کے پاس بیٹھے لوگوں میں سے ایک صاحب بولے: ہم تک یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت معقل بن سنان اشجعیؓ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، انہوں نے یہ بات بیان کی کہ: اس ذات کی قسم جس کے نام پر قسم اٹھائی جاتی ہے! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بروع بنت واشق اشجعیہ کے بارے میں یہی فیصلہ دیا تھا۔ (راوی کہتے ہیں) تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس پر اتنا خوش ہوئے کہ اس سے پہلے کبھی اتنے خوش نہیں ہوئے تھے، وہ اس لیے اتنے خوش ہوئے، کیونکہ ان کا فیصلہ نبی اکرمؐ کے فرمان کے مطابق تھا۔

مسروق بن اجدع فرماتے ہیں وراثت کی تقسیم سے پہلے مہر ادا کیا جائے گا۔

تشریح: اس روایت میں ایک واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ، کچھ لوگ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بولے: ہمارے خاندان کے ایک شخص نے ایک عورت کے ساتھ شادی کر لی، اس نے اس عورت کا کوئی مہر مقرر نہ کیا، وہ اس عورت کے ساتھ خلوت بھی نہ کر سکا اور اس کا انتقال ہو گیا۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: جب سے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

جدا ہوا ہوں مجھ سے اس سے زیادہ مشکل سوال نہیں پوچھا گیا، تم لوگ کسی اور کے پاس چلے جاؤ۔ وہ ایک ماہ مسلسل ان کے پاس آتے رہے۔ آخرکار ان لوگوں نے کہا: ہم اب صرف آپ ہی سے سوال کر سکتے ہیں، آپ کے علاوہ کسی اور سے سوال نہیں کر سکتے، آپ اس شہر میں آخری صحابی ہیں، ہمیں آپ کے علاوہ کسی اور کا پتہ نہیں ہے۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: میں اس حوالے سے اپنی رائے کے مطابق جواب دوں گا، اگر وہ ٹھیک ہوا تو یہ اللہ کی طرف سے ہوگا، جو ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اگر غلط ہوا تو میری طرف سے ہوگا، اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اس جواب سے بری الذمہ ہوں گے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں ایسی عورت کو مہر مثل کی ادائیگی کروں گا، جس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوگی اور اس عورت کو وراثت میں سے حصہ ملے گا۔ اور وہ بیوہ عورت کی طرح چار ماہ (دس دن) عدت بسر کرے گی۔

راوی کہتے ہیں کہ اس وقت حاضرین میں اشجع قبیلے کے کچھ افراد بھی موجود تھے، ان میں سے حضرت معقل بن سنانؓ کھڑے ہوئے اور بولے: ہم گواہی دیتے ہیں کہ، آپ نے اس بارے میں وہی فیصلہ دیا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے قبیلے کی ایک عورت کے بارے میں (اس طرح کی صورتِ حال میں) دیا تھا۔ اس عورت کا نام بروع بنت واشق تھا۔

راوی کہتے ہیں اس وقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو جتنا مسرور دیکھا گیا اس سے پہلے انہیں اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ پھر انہوں نے فرمایا: اے اللہ! اگر یہ ٹھیک ہے تو تیری عطا سے ہے، تو ایک ہے اور تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس واقعے کو ان الفاظ میں امام سیوطیؒ نے نقل کیا ہے۔ (صحیح ابن حبان، ج:۴، ص:۱۶۰)

ایک اعتراض اور اس کا جواب:

اعتراض: جب مرد نے عورت سے وطی ہی نہیں کی تھی تو پھر حق مہر کس چیز کا واجب ہو گیا؟ کیونکہ حق مہر اصل میں عورت کی شرمگاہ کو استعمال کرنے کا شرعی حکم ہے، اس لیے جب دخول سے قبل طلاق ہو جائے اور حق مہر مقرر نہ کیا گیا تو حق مہر کے وجوب کا کوئی بھی قائل نہیں، صرف دو تین کپڑے دینے پڑتے ہیں، جسے ''متعہ'' کہا جاتا ہے، بعینہٖ یہی صورت مرد کے فوت ہونے میں ہے؛ لیکن اس میں حق مہر واجب ہونے کا قول کہا جا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات غیر معقول ہے، اس لیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی غیر معقول بات کی اتباع میں احناف کا فتویٰ بھی غیر معقول ہوگا، ورنہ ان دونوں صورتوں میں فرق واضح کیا جائے؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول محض ان کا ہی قول نہیں کہ اسے غیر معقول کہا جائے؛ بلکہ ان کے قول کے پیچھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک ہے، جو بروع بنت واشق کے بارے میں آپ نے روایت کے ذیل میں ملاحظہ فرمایا، اور جس کی تحقیق ہونے پر امام شافعیؒ جیسے مجتہد نے اپنے سابق قول سے رجوع فرمالیا، لہٰذا اسے غیر معقول کہنا، نامعقول بات ہے۔

(تفصیل کے لئے دیکھیں ترمذی جلد:۱، صفحہ:۲۱۷)

رہا یہ کہ اُن دونوں صورتوں میں فرق کیا ہے، جس کی بنا پر مطلقہ کو تو متعہ ملتا ہے اور خاوند کے فوت ہونے پر حقِ مہر مل رہا ہے؟ اس فرق کو علامہ ابن قدامہؒ نے بیان کیا ہے، وہ یہ ہے کہ: موت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور طلاق لینا خاوند کا فعل ہوتا ہے، لہٰذا موت کو طلاق پر قیاس نہیں کریں گے؛ کیونکہ موت وہ ہے جس سے نکاح مکمل ہو جاتا ہے، اس لیے اس کی عدت بھی ہے اور میراث بھی واجب ہوتا ہے اور

حق مہر بھی کامل دینا پڑتا ہے؛ لیکن طلاق قبل الدخول کی صورت میں نہ عدت ہوتی ہے اور نہ ہی حق مہر دینا واجب ہوتا ہے، جب دخول نہ ہوا ہو۔ صرف متعہ دینا خاوند پر لازم ہوتا ہے، اس لیے اگر کسی عورت کا خاوند فوت ہو گیا اور حق مہر مقرر نہیں ہوا تھا اور نہ ہی وطی ہوئی تھی، تو اس صورت میں حق مہر کامل ادا کرنا پڑے گا، عدتِ وفات گذارنا پڑے گی، میراث کی حقدار ہوگی۔ اگر ایسی صورت میں طلاق واقع ہو تو نہ عدت، نہ حقِ مہر اور نہ ہی میراث۔ (المُغني لابن قُدامة، ج:۵، ص:۵۸۸)

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَ بِهٰذَا نَأْخُذُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ وَالعَامَةِ مِن فُقَهَائِنَا

ترجمہ: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ فرمان کا مطلب یہ ہے کہ "غیر مفروض لها المهر متوفى عنها زوجها" کو مہر ملنے کے سلسلے میں ہم نے اسی مذکورہ روایت کو اختیار کیا ہے۔ اور یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ہمارے اکثر فقہائے احناف کا مذہب ہے۔

(ب:۱۵) بَابُ المَرأَةِ تَتَزَوَّجُ فِي عِدَّتِهَا

دورانِ عدت عورت کا نکاح کرنے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا ابْنُ شِهَابٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، وَسُلَيْمَانُ بْنِ يَسَارٍ، أَنَّهُمَا حَدَّثَا، أَنَّ ابْنَةَ طَلْحَةِ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ كَانَتْ تَحْتَ رُشَيْدٍ الثَّقَفِيِّ، فَطَلَّقَهَا، فَنَكَحَتْ فِي عِدَّتِهَا أَبَا سَعِيدِ بْنَ مُنَبِّهٍ، أَوْ أَبَا الْجُلاسِ بْنَ مُنَيَّةَ فَضَرَبَهَا عُمَرُ، وَضَرَبَ زَوْجَهَا بِالْمِخْفَقَةِ ضَرَبَاتٍ،

وَفَرَّقَ بَيْنَهُمَا، وَقَالَ عُمَرُ: أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ فِي عِدَّتِهَا، وَإِنْ كَانَ زَوْجُهَا الَّذِي تَزَوَّجَهَا لَمْ يَدْخُلْ بِهَا فُرِّقَ بَيْنَهُمَا، وَاعْتَدَّتْ بَقِيَّةَ عِدَّتِهَا مِنَ الْأَوَّلِ، ثُمَّ كَانَ خَاطِبًا مِنَ الْخُطَّابِ، وَإِنْ كَانَ قَدْ دَخَلَ بِهَا فُرِّقَ بَيْنَهُمَا، ثُمَّ اعْتَدَّتْ بَقِيَّةَ عِدَّتِهَا مِنَ الْأَوَّلِ. ثُمَّ اعْتَدَّتْ عِدَّتِهَا مِنَ الْآخَرِ، ثُمَّ لَمْ يَنْكِحْهَا أَبَدًا.

قَالَ سَعِيدُ بْنُ الْمُسَيِّبِ: وَلَهَا مَهْرُهَا بِمَا اسْتَحَلَّ مِنْ فَرْجِهَا.

ترجمہ: سعید بن مسیبؒ اور سلیمان بن یسار بیان کرتے ہیں:

طلحہ بن عبید اللہ کی صاحبزادی جو رشید ثقفی کے نکاح میں تھیں، رشید نے اسے طلاق دیدی تو اس خاتون نے اپنی عدت کے دوران ابوسعید مُنَبّہ (راوی کو شک ہے شاید یہ الفاظ ہیں) أبو الجلاس بن منبة کے ساتھ شادی کر لی، تو حضرت عمرؓ نے اس خاتون کو سزا دلوائی اور اس کے شوہر کو بھی سزا دلوائی، انہیں کوڑے مارے گئے اور ان کے درمیان علیحدگی کرادی گئی۔ پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''جو بھی عورت اپنی عدت کے دوران نکاح کرے گی اور جس شخص کیساتھ اس نے نکاح کیا ہے وہ شخص اسکے ساتھ صحبت نہیں کرتا، تو ان دونوں کے درمیان علیحدگی کرادی جائے گی اور وہ عورت اپنے پہلے شوہر کی عدت کو پورا کرے گی اور پھر دوسرا شخص اس کے لیے نکاح کا پیغام بھیجے گا، جیسے دیگر لوگ بھیجیں گے۔ لیکن اگر اُس دوسرے شخص نے اس کے ساتھ صحبت کر لی ہوگی تو میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کرادی جائے گی اور وہ عورت اپنے پہلے شوہر سے باقی عدت کو پورا کرے گی، پھر اس کے بعد دوسرے شوہر سے عدت کو پورا کرے گی، پھر وہ اس شخص عورت کے ساتھ کبھی نکاح نہیں کر سکے گا۔ سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں: اس

عورت کو مہر ملے گا، کیونکہ اس شخص نے اس کی شرمگاہ کو استعمال کیا ہے۔

تشریح: اس باب کے تحت امام محمدؒ نے تین روایات ذکر فرمائیں جن میں سے پہلی روایت کی وضاحت قرآنِ کریم میں مذکور ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتَابُ اَجَلَهٗ﴾ اس میں اللہ نے یہ حکم دیا ہے کہ جب تک عورت کی عدت پوری نہیں ہوجاتی، کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ نکاح نہیں کرسکتا؛ البتہ عورت کی عدت کے دوران اسے نکاح کی پیشکش کی جاسکتی ہے، یا اس کے ساتھ نکاح کے ارادے کا اظہار کیا جاسکتا ہے، اس حکم کا تذکرہ بھی قرآن میں ہے: ﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ﴾ اور (عدت کے دوران) اگر تم ان عورتوں کو اشارہ کنایہ میں نکاح کا پیغام دو، یا (ان سے نکاح کا ارادہ) دل میں چھپائے رکھو تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ (البقرۃ:۲۳۵)

قاسم بن محمد نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آدمی ایک عورت کو اس کی عدت کے دوران یہ کہہ سکتا ہے کہ: تم میرے نزدیک بہت معزز ہو، یا مجھے تمہارے اندر دلچسپی ہے، یا اس جیسے دوسرے الفاظ استعمال کرسکتا ہے۔ جب کہ بعض دیگر محدثین نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالے سے یہ بات نقل کی ہے: کہ یہاں تعریض سے مراد یہ ہے کہ آدمی یہ کہے: میں شادی کرنا چاہتا ہوں، یا مجھے عورتیں اچھی لگتی ہیں وغیرہ۔ (تلخیص حاشیہ نمبر:۲،ص:۲۵۱)

عِدَّتِها مِن الأوَّل: پہلے کی عدت سے مراد یہ ہے کہ جب پہلے شوہر کی عدت کا کچھ حصہ باقی ہو۔ جہاں تک دوسرے شوہر کا تعلق ہے تو اس کے ساتھ تفریق ہونے کی صورت میں عدت لازم نہیں ہوگی، کیونکہ دوسرے شوہر نے اس

کے ساتھ دخول نہیں کیا ہے اور جس عورت کے ساتھ دخول نہ کیا گیا ہو، اس کی کوئی عدت نہیں ہوتی ہے۔

ثُمَّ کانَ خاطبًا: کی وضاحت کرتے ہوئے صاحب محشیؒ نے یہ کہا ہے کہ وہ دوسرا شوہر جس سے اس عورت کی تفریق کردی گئی تھی اب اگر وہ نکاح کا پیغام بھیجنا چاہتا ہے، تو وہ اس عورت کو نکاح کا پیغام بھیج کر نئے سرے سے عقدِ نکاح کرسکتا ہے اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ موجود ہے کہ ایسی صورتِ حالت میں وہ دوسرا شوہر جس کے ساتھ تفریق کردی گئی وہ اس حوالے سے اس عورت کا کسی دوسرے سے زیادہ حقدار شمار نہیں ہوگا؛ بلکہ وہ ایک عام پیغام دینے والے شخص کی مانند شمار ہوگا، اب اس عورت کی مرضی ہے کہ وہ جس کے ساتھ چاہے شادی کرلے۔ لیکن اگر عورت کی عدت کے دوران اس سے نکاح کرنے والا شخص اس کے ساتھ صحبت بھی کرلیتا ہے تو تفریق بھی ہوجائے گی، لیکن اب وہ شخص دوبارہ کبھی بھی اس عورت کے ساتھ شادی نہیں کرے گا۔

اخیر میں امام محمدؒ نے سعید بن مسیّبؒ کا قول نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس عورت کو مہر ملے گا، کیونکہ اس نے اس کی شرمگاہ سے فائدہ اُٹھایا ہے اور مہر شرمگاہ کا عوض ہی ہوتا ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: بَلَغَنَا أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِؓ رَجَعَ عَنْ هٰذَا الْقَوْلِ إِلَى قَوْلِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ.

ترجمہ: امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے بعد میں اس قول سے رجوع کرلیا تھا اور علی بن ابی طالبؓ کے قول کو اختیار کرلیا تھا۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ:
حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے اس قول (دورانِ عدت نکاح کرنے والے مرد اور عورت کے درمیان علیحدگی کرادی جائے گی، خواہ وطی کیا ہو یا نہ کیا ہو، اور اس عورت کو حق مہر بھی نہیں ملے گا۔ مزید یہ عورت اب کبھی بھی اس مرد کے لیے جائز نہ ہوگی) سے رجوع کرلیا تھا۔ اور حضرت علی بن ابی طالبؓ کے قول کی طرف رجوع فرمالیا تھا۔ مزید اس کی اور وضاحت اگلی روایت کے ضمن میں آ رہی ہے۔

أَخْبَرَنَا الْحَسَنُ بْنُ عُمَارَةَ، عَنِ الْحَكَمِ بْنِ عُيَيْنَةَ، عَنْ مُجَاهِدٍ، قَالَ: رَجَعَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فِي الَّتِي تَتَزَوَّجُ فِي عِدَّتِهَا إِلَى قَوْلِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، وَذَلِكَ أَنَّ عُمَرَ قَالَ: إِذَا دَخَلَ بِهَا فُرِّقَ بَيْنَهُمَا وَلَمْ يَجْتَمِعَا أَبَدًا، وَأَخَذَ صَدَاقَهَا، فَجَعَلَ فِي بَيْتِ الْمَالِ. فَقَالَ عَلِيٌّ كَرَّمَ اللَّهُ وَجْهَهُ: لَهَا صَدَاقُهَا بِمَا اسْتَحَلَّ مِنْ فَرْجِهَا، فَإِذَا انْقَضَتْ عِدَّتُهَا مِنَ الْأَوَّلِ تَزَوَّجَها الآخَرُ إِنْ شَاءَ، فَرَجَعَ عُمَرُؓ إِلَى قَوْلِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا.

ترجمہ: مجاہدؒ کہتے ہیں: حضرت عمر بن خطابؓ نے اس مسئلے کے بارے میں حضرت علی بن ابی طالبؓ کے قول کی طرف رجوع کرلیا تھا، جب کوئی عورت اپنی عدت کے دوران کسی شخص سے نکاح کرلیتی ہے (تو اس کا کیا حکم ہوگا؟) حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا تھا کہ: اگر اس کا شوہر اس کے ساتھ صحبت کرچکا ہو تو ان کے درمیان علیحدگی کرادی جائے گی، پھر وہ دونوں کبھی اکٹھا نہیں ہوسکیں گے۔ حضرت عمرؓ نے اس عورت کا مہر لے کر اسے بیت المال میں جمع کروادیا تھا؛ لیکن حضرت علیؓ نے یہ رائے دی تھی کہ عورت کو اس کا مہر ملے گا،

کیونکہ اس شخص نے اس کی شرمگاہ کو استعمال کیا ہے، پھر جب پہلے شوہر سے عدت پوری ہو جائے گی، تو دوسرا شخص اگر چاہے تو اس کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے قول کی طرف رجوع کر لیا تھا۔

تشریح: مذکورہ باب کی یہ دوسری روایت ہے۔ اور دوسری روایت بھی دراصل پہلی ہی روایت کا تتمہ ہے؛ لیکن یہاں پر مزید اور کچھ باتیں پہلی روایت کے تعلق سے ذکر کی جائیں گی، چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ: ہم حضرت علی المرتضیٰؓ کے قول پر عمل کرتے ہیں اور حضرت عمرؓ کے قول یا نظر سے جو اُمور سامنے آتے ہیں وہ چار ہیں، اسی کا تذکرہ دوسری روایت میں اجمالاً بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہیں:

(۱) دورانِ عدت نکاح کرنے والے کو سزا دی جائے گی۔

(۲) عورت دونوں خاوندوں کی الگ الگ عدت پوری کرے گی۔

(۳) اگر دوسرا خاوند وطی کر چکا ہے، تو پھر یہ عورت آئندہ کبھی بھی اس کے لئے جائز نہ ہوگی۔

(۴) اس عورت کا حق مہر عورت کے بجائے بیت المال میں جمع کرایا جائے گا۔

حضرت علی المرتضیٰؓ نے ان چاروں اُمور میں الگ نظریہ اپنایا اور جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا، تو انہوں نے اپنے پہلے نظریہ سے حضرت علی المرتضیٰؓ کے قول کی طرف رجوع کر لیا۔

حضرت عمرؓ نے مذکورہ اُمور کس بنیاد پر اپنائے؟

حضرت عمرؓ نے مذکورہ اُمور اپنے اجتہاد اور قیاس کی بنیاد پر ارشاد فرمائے تھے، جس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ: عدت کے دوران نکاح کرنا چونکہ غیر شرعی کام ہے اس لیے اس کی سزا یہی ہے کہ عورت کو حق مہر سے محروم رکھا جائے۔ اور اس حق مہر کو

صدقہ بنالیا جائے۔ اسکی ایک مثال صاحب ''احکام القرآن'' نے ج:۱،ص:۴۲۵ر پر پیش کی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکری کا گوشت تناول فرمانے لگے تو آپؐ نے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا: اسے مت کھاؤ، کیونکہ گوشت مجھ سے کہہ رہا ہے کہ: میں ایسی بکری کا گوشت ہوں جسے اس کے مالک کی اجازت کے بغیر ذبح کیا گیا ہے۔ آپ نے یہاں گوشت کوصدقہ کرنے کا حکم دیا۔

ان دونوں باتوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ پہلی بات میں مہر غیر شرعی ہے اور یہاں گوشت غیر شرعی ہے۔ حضرت عمرؓ نے ہمیشہ کے لئے دوسرے خاوند سے نکاح کرنے کو ممنوع اس لیے قرار دیا کہ ان دونوں میاں بیوی نے ایک غیر شرعی کام کیا اور پھر باہم صحبت کو قائم رکھا، اس لیے اس کی سزا یہی ہونی چاہیے کہ یہ دونوں آئندہ کبھی جمع نہ ہوسکیں۔ بہرحال جب حضرت عمرؓ نے حضرت علی المرتضیٰؓ کی مخالفت کو سنا تو اپنے قول سے ان کے قول کی طرف رجوع کرلیا۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا

ترجمہ: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ فرمان کا مطلب یہ ہے کہ عدت گذارنے کی حالت میں نکاح کرنے والی عورت کے نکاح کے فسخ اور اس کو مہر ملنے کے سلسلے میں ہم نے حضرت عمرؓ کے مرجوع الیہ قول اور حضرت علیؓ کے اسی فرمان کو ہم نے اپنا مسلک قرار دیا ہے۔ اور یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ اور اکثر علمائے احناف کا مذہب ہے۔

أَخْبَرَنَا يَزِيدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْهَادِ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ إِبْرَاهِيمَ، عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِي أُمَيَّةَ، أَنَّ امْرَأَةً هَلَكَ عَنْهَا زَوْجُهَا، فَاعْتَدَّتْ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا، ثُمَّ تَزَوَّجَتْ حِينَ حَلَّتْ فَمَكَثَتْ عِنْدَ زَوْجِهَا أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَنِصْفًا، ثُمَّ وَلَدَتْ وَلَدًا تَامًّا، فَجَاءَ زَوْجُهَا إِلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ: فَدَعَا عُمَرُ نِسَاءً مِنْ نِسَاءِ أَهْلِ الْجَاهِلِيَّةِ قُدَمَاءَ، فَسَأَلَهُنَّ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالَتْ امْرَأَةٌ مِنْهُنَّ: أَنَا أُخْبِرُكَ، أَمَّا هٰذِهِ الْمَرْأَةُ هَلَكَ زَوْجُهَا حِينَ حَمَلَتْ، فَأُهْرِيقَتِ الدِّمَاءُ فَحَشَفَ وَلَدُهَا فِي بَطْنِهَا، فَلَمَّا أَصَابَهَا زَوْجُهَا الَّذِي نَكَحَتْهُ، وَأَصَابَ الْوَلَدَ الْمَاءُ تَحَرَّكَ الْوَلَدُ فِي بَطْنِهَا، وَكَبِرَ فَصَدَّقَهَا عُمَرُ بِذٰلِكَ، وَفَرَّقَ بَيْنَهُمَا، وَقَالَ عُمَرُ: أَمَا إِنَّهُ لَمْ يَبْلُغْنِي عَنْهُمَا إِلَّا خَيْرًا، وَأَلْحَقَ الْوَلَدَ بِالْأَوَّلِ.

ترجمہ: عبداللہ بن ابواُمیہ بیان کرتے ہیں کہ: ایک عورت کا خاوند فوت ہوگیا، اس نے چار ماہ اور دس دن عدت پوری کی۔ عدت پوری ہونے کے بعد اس نے کہیں شادی کر لی۔ اس نئے خاوند کے پاس اسے ساڑھے چار ماہ ہی گزرے تھے کہ ایک مکمل بچے کو اس نے جنم دیا۔ اس کا خاوند حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس آیا (اور واقعہ بیان کرنے کے بعد اس کے بارے میں دریافت کیا)۔ حضرت عمرؓ نے زمانۂ جاہلیت کی پرانی عورتوں کو بلوایا اور ان سے اس بارے میں پوچھا، تو اُن میں سے ایک عورت نے کہا: میں آپ کو اس بارے میں بتاتی ہوں۔ اس عورت کا جس وقت خاوند فوت ہوا اس وقت یہ حاملہ تھی، پھر اس سے خون بہنے لگا، جس سے بچہ پیٹ میں خشک ہوگیا، پھر جب

اس کے اِس خاوند نے وطی کی، جس سے اس نے بعد میں نکاح کر لیا تھا، تو بچے کو تازگی مل گئی، بچہ اس کے پیٹ میں حرکت کرنے لگا اور بڑا ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے اس عورت کی بات کی تصدیق کی اور سائل اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کر دی۔ اور فرمایا: تم دونوں کی طرف سے مجھے بھلائی ہی پہنچی ہے (یعنی تم دونوں بے قصور ہو)۔ آپ نے نومولود بچہ پہلے خاوند کے ساتھ ملا دیا۔

تشریح: یہ روایت دراصل ایک واقعہ کی تحقیق کے ضمن میں ہے۔ اور وہ تحقیق بایں طور ہوئی کہ ایک عورت نے اپنی عدت پوری ہونے کے بعد دوسرے شخص سے شادی کر لی، شادی کئے ہوئے ابھی ساڑھے چار ماہ ہی گزرے تھے کہ اس نے ایک مکمل بچہ کو جنم دیا، تو اس کے شوہر نے سوچا کہ بچہ کی پیدائش تقریباً چھ ماہ میں ہوتی ہے اور اس عورت نے ساڑھے چار ماہ میں بچہ کو جنم دیا، تو آخر کار معاملہ کیا ہے؟

اس سلسلہ میں مسئلہ معلوم کرنے کے لئے اس کا شوہر حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس آیا، پھر حضرت عمرؓ نے پورا واقعہ سننے کے بعد تحقیق کے لیے زمانۂ جاہلیت کی ایک عورت کو بلایا اور اس سے اس بارے میں دریافت کیا، تو اس عورت نے کہا کہ: جس وقت اس کا شوہر فوت ہوا تھا، تو اس وقت یہ عورت حاملہ تھی، پھر جب اس عورت کا خون بہنے لگا تو بچہ سوکھ گیا، پھر جب اس دوسرے شوہر نے اس سے وطی کی تو بچہ حرکت کرنے لگا اور بڑا ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے اس عورت کی بات کو سچ مان کر دونوں میاں بیوی کے درمیان تفریق کر دی۔ اور کہا کہ: تم دونوں بے قصور ہو۔ اور آپؓ نے اس بچہ کو پہلے خاوند کے ساتھ لاحق کر دیا۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، اَلْوَلَدُ وَلَدُ الْأَوَّلِ، لِأَنَّهَا جَاءَ تْ بِهٖ عِنْدَ الْآخَرِ لِأَقَلَّ مِنْ سِتَّةِ أَشْهُرٍ، فَلَا تَلِدُ الْمَرْأَةُ وَلَدًا تَامًّا لِأَقَلَّ مِنْ سِتَّةِ

أَشْهُرٍ، فَهُوَ ابْنُ الأَوَّلِ، وَيُفَرَّقُ بَيْنَهُمَا وَبَيْنَ الآخَرِ، وَلَهَا الْمَهْرُ بِمَا اسْتَحَلَّ مِنْ فَرْجِهَا: الأَقَلُّ مِمَّا سُمِّيَ لَهَا وَمِنْ مَهْرِ مِثْلِهَا، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں: ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں کہ بچہ پہلے خاوند کا ہے، کیونکہ اس نے دوسرے خاوند کے یہاں ۶/ماہ سے کم عرصہ میں بچہ کو جنم دیا ہے۔ اور کوئی عورت چھ ماہ سے کم عرصہ میں بچہ جنے تو وہ پہلے خاوند کا ہوتا ہے۔ اور اس عورت اور اس کے نئے خاوند کے درمیان تفریق کروادی جائے گی اور عورت کو حق مہر ملے گا، کیونکہ اس نئے خاوند نے اس کی شرمگاہ سے نفع اٹھایا ہے؛ لیکن یہ حق مہر اس کے مہر مثلی اور مقرر شدہ حق مہر سے کم ہوگا۔ اور یہی قول امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہائے احناف کا ہے۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے اسی فیصلہ کو ہم نے اپنا مذہب قرار دیا ہے، یعنی عدت کے دوران اگر عورت نے نکاح کیا تو شوہر ثانی اور اس کے درمیان تفریق کردی جائے گی اور عورت کو استحلالِ فرج کی بنا پر مہر ملے گا، جس کی مقدار مقررہ مہر اور مہر مثل سے کم ہوگی۔ یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ اور اکثر علمائے احناف کا مذہب ہے۔

(ب:۱۶) بابُ العَزَل

عزل کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا سَالِمٌ أَبُو النَّضْرِ، عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّهُ كَانَ يَعْزِلُ.

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا سَالِمٌ أَبُو النَّضْرِ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَفْلَحَ مَوْلَى أَبِي أَيُّوبَ الأَنْصَارِيِّ، عَنْ أُمِّ وَلَدِ أَبِي أَيُّوبَ، أَنَّ أَبَا أَيُّوبَ كَانَ يَعْزِلُ.

ترجمہ: عامر بن سعد اپنے والد کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ وہ عزل کیا کرتے تھے۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے غلام عبدالرحمٰن بن افلح بیان کرتے ہیں: حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اُمّ ولد نے یہ بات بتائی کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ عزل کیا کرتے تھے۔

تشریح: ''عزل'' کا لغوی معنی: جدا کرنا، الگ کرنا ہے۔ جیسے: ''فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيضِ'' ہے۔ عزل کی اصطلاحی تعریف اس طرح ہے: جماع کرتے وقت جب انزال کا وقت قریب ہو تو مرد اپنے نطفہ کو عورت کی شرمگاہ سے باہر گرادے؛ تاکہ عورت کے رحم تک نطفہ نہ پہنچ سکے اور وہ عورت حاملہ نہ ہو جائے۔

باب میں مذکورہ دونوں روایتیں دو مشہور صحابی کی ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ صحابی عزل کیا کرتے تھے، لہٰذا حضرات صحابہ سے عزل کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ بعض صحابہ اور بعض سلف عزل کو ناجائز کہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ائمہ کرام کا اختلاف ملاحظہ ہو:

عزل اور اختلافِ ائمہ

جمہور کا مذہب: گذشتہ سطور میں جو نقل ہوا ہے وہ جمہور کا مذہب ہے۔ جمہور کے نزدیک فی نفسہٖ عزل جائز ہے۔

ابن حزم کا مذہب: ابن حزم کے نزدیک عزل حرام ہے۔

(فتح الباری، ج:۹، ص:۳۸۵)

ابن حزم کی دلیل: ابن حزم حضرت جذامہ بنت وہب اسدی کی روایت سے استدلال کرتے ہیں، جس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے عزل کے متعلق فرمایا: "ذٰلِكَ الوأدُ الخَفِيُّ" (یہ وأد خفي ہے، یعنی زندہ درگور کرنا ہے) تو اس حدیث سے ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ (صحیح مسلم، ج:۱، ص:۴٦٦)

جواب: بعض لوگوں نے حدیث باب کی بناء پر اس حدیث کو منسوخ قرار دیا ہے اور بعض نے اس کو کراہت تنزیہی پر محمول کیا ہے۔

(شرح الطیبی، ج:٦، ص:۲۸۲)

جمہور کی دلیل: حدیث باب ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عزل کرنا فی نفسہ جائز ہے۔

دوسری دلیل: حضرت جابرؓ کی روایت ہے: عَن جابرٍؓ قالَ: كُنَّا نعزِلُ علٰى عَهدِ النَّبيِّ ﷺ. کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں عزل کرتے تھے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ عزل جائز ہے۔ (بخاری، ج:۲، ص:۹۳۱)

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا ضَمْرَةُ بْنُ سَعِيدٍ الْمَازِنِيُّ، عَنِ الْحَجَّاجِ بْنِ عَمْرِو بْنِ غَزِيَّةَ، أَنَّهُ كَانَ جَالِسًا عِنْدَ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ، فَجَاءَهُ ابْنُ فَهْدٍ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْيَمَنِ، فَقَالَ: يَا أَبَا سَعِيدٍ، إِنَّ عِنْدِى جَوَارِيَ، لَيْسَ نِسَائِي اللاتِي كُنَّ بِأَعْجَبَ إِلَيَّ مِنْهُنَّ، وَلَيْسَ كُلُّهُنَّ يُعْجِبُنِي أَنْ تَحْمِلَ مِنِّي، أَفَأَعْزِلُ؟ قَالَ: قَالَ: أَفْتِهِ يَا حَجَّاجُ، قَالَ: قُلْتُ: غَفَرَ اللَّهُ لَكَ، إِنَّمَا نَجْلِسُ إِلَيْكَ لِنَتَعَلَّمَ مِنْكَ، قَالَ، أَفْتِهِ، قَالَ: قُلْتُ: هُوَ حَرْثُكَ إِنْ شِئْتَ عَطِشْتَهُ وَإِنْ شِئْتَ سَقَيْتَهُ، قَالَ: وَقَدْ كُنْتُ أَسْمَعُ ذَلِكَ مِنْ زَيْدٍ، فَقَالَ زَيْدٌ: صَدَقَ.

ترجمہ: حجاج بن عمرو کہتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ زید بن ثابتؓ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، تو ایک یمنی شخص ''ابن فہد'' نامی شخص کے پاس آیا اور عرض کرنے لگا: اے ابو سعید! میری بہت سی لونڈیاں ہیں، جو مجھے میری بیویوں سے زیادہ پسند ہیں؛ لیکن مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ وہ مجھ سے حاملہ ہو جائیں تو کیا میں عزل کرسکتا ہوں؟ راوی بیان کرتا ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے حجاج سے کہا: تم اس کے مسئلہ کا جواب دو۔ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے، ہم تو آپ کے پاس اس لیے بیٹھے ہیں؛ تاکہ کچھ مسائل سیکھیں۔ زید بن ثابتؓ نے فرمایا: وہ تمہاری کھیتی ہیں، تمہاری مرضی ہے انہیں سیراب کرو، یا خشک رہنے دو۔ اس نے کہا: میں یہی بات زید سے بھی سنا کرتا تھا۔ زید نے کہا: تم نے سچ کہا ہے۔

عزل کرنا مکروہ ہے

تشریح: مذکورہ روایت سے بھی عزل کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اکثر علماء عزل کے قائل ہیں۔ درِّ مختار نے بھی جائز لکھا ہے، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عزل کرنا مکروہ بھی نہ ہو۔ بعض محدثین اور فقہاءِ کرام نے اسے مکروہ لکھا ہے، چنانچہ صاحب ہدایہ نے جب عزل کے متعلق لکھا کہ: ''وکرہ العَزل'' کہ عزل اگرچہ مباح ہے؛ لیکن یہ ایک ناپسندیدہ عمل ہے، اس پر ہدایہ کے شارحین کفایہ، عنایہ اور فتح القدیر نے ضبط تولید کے متعلق لکھا ہے کہ آج کل اگر کوئی شخص ضبط تولید کے لیے حمل ٹھہرنے سے پہلے پہلے نطفہ کو کسی دوائی کے استعمال سے ضائع کرنا چاہتا ہے تو یہ جائز ہے۔ وہ حضرات لکھتے ہیں کہ چوں کہ آج کل اولاد کی تربیت تو ہوتی نہیں، اس لیے فساق و فجار اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے بڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟!۔ یہ ان حضرات کی ایک اچھی نیت

ہے۔ اسی طرح اگر عورت کمزور ہو، بیمار ہو، یا اولاد زیادہ ہو تو وہ بھی عذر کے طور پر دوائی استعمال کرسکتی ہے۔ (فتح القدیر، ج:۳، ص:۴۷۹)

لیکن آج کل جو ایک طوفانِ بدتمیزی اُٹھا ہے کہ: منصوبہ بندی کرو......!! بچے دو ہی اچھے......!! وقفہ ضروری ہے......!! تو ان لوگوں کی نیت کچھ اور ہوتی ہے جس میں اسلام اور مسلمانوں کی عداوت پوشیدہ ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے رازق ہونے پر عدمِ اعتماد ہوتا ہے، اس نظریہ سے کوئی دوائی استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا۔ علماء بہتر فتویٰ دے سکتے ہیں۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ لا نَرَى بِالْعَزْلِ بَأْسًا عَنِ الأَمَةِ، وَأَمَّا الْحُرَّةُ، فَلا يَنْبَغِي أَنْ يَعْزِلَ عَنْهَا إِلا بِإِذْنِهَا، وَإِذَا كَانَتِ الأَمَةُ زَوْجَةَ الرَّجُلِ، فَلا يَنْبَغِي أَنْ يَعْزِلَ عَنْهَا إِلا بِإِذْنِ مَوْلاهَا، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللَّهُ.

ترجمه: امام محمدؒ فرماتے ہیں: ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ لونڈی سے عزل کرنے میں کوئی حرج نہیں؛ لیکن آزاد عورت سے عزل اس کی اجازت کے بغیر نہ کرنا چاہئے۔ اور اگر لونڈی بھی کسی آدمی کی زوجہ ہو تو اس کے مولیٰ کی اجازت سے عزل کرنا چاہئے۔ یہی امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔

باندی سے عزل کرنا کیسا ہے؟

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ: اسی کو ہم اپنے مسلک کا ماٴخذ قرار دیتے ہیں کہ: اگر باندی سے عزل کیا جائے، تو اس سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ آقا اس کی اجازت کے بغیر عزل کرسکتا ہے؛ مگر آزاد عورت

سے عزل کے جواز میں اس کی اجازت ضروری ہے؛ کیونکہ تکمیل شہوت میں عورت کے لیے مرد کے پانی کی اَشد ضرورت ہوتی ہے، تو یہ ہے اس کا حق ہے، اگر وہ اجازت نہ دے تو ناجائز ہے۔ بہرحال اگر اجازت ہو بھی جائے تو عزل صرف مباح کے درجہ میں ہے۔ یہی جمہور کا مذہب ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے آزاد عورت سے بغیر اس کی اجازت کے عزل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (ابن ماجہ، ص:۳۸۶)

لیکن اگر باندی کسی غیر کی زوجیت میں ہو، تو پھر عزل کے جواز کے لئے اس کے مولیٰ کی اجازت ضروری ہے۔ اور یہی امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا ابْنُ شِهَابٍ، عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، أَنَّ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، قَالَ: مَا بَالُ رِجَالٍ يَعْزِلُونَ عَنْ وَلَائِدِهِمْ؟ لا تَأْتِينِي وَلِيدَةٌ فَيَعْتَرِفُ سَيِّدُهَا أَنَّهُ قَدْ أَلَمَّ بِهَا إِلا أَلْحَقْتُ بِهِ وَلَدَهَا فَاعْتَزِلُوا بَعْدُ، أَوِ اتْرُكُوا.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اپنی لونڈیوں سے عزل کرتے ہیں؛ تاکہ ان کے یہاں بچہ پیدا نہ ہو۔ اگر کسی لونڈی کے آقا نے میرے سامنے اس بات سے جماع کا اقرار کیا تو میں بچہ اس کے سپرد کر دوں گا، بعد میں خواہ عزل کریں یا نہ کریں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول

تشریح: ذکر کردہ روایت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ہے، چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ فرماتے تھے کہ: لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ بچہ پیدا نہ ہونے کے

لیے اپنی باندیوں سے عزل کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی آقا میرے سامنے اس بات کا اقرار کرے کہ میں نے اپنی لونڈی سے جماع کیا ہے، تو میں بچہ اس کے سپرد کردوں گا۔ اس کے بعد وہ عزل کرے یا نہ کرے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: إِنَّمَا صَنَعَ هَذَا عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَلَى التَّهْدِيدِ لِلنَّاسِ أَنْ يُضَيِّعُوا، وَلائِدَهُمْ، وَهُمْ يَطَئُونَهُنَّ، قَدْ بَلَغَنَا أَنَّ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ وَطِئَ جَارِيَةً لَهُ، فَجَاءَتْ بِوَلَدٍ، فَنَفَاهُ، وَأَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَطِئَ جَارِيَةً لَهُ فَحَمَلَتْ، فَقَالَ: اللَّهُمَّ لا تُلْحِقْ بِآلِ عُمَرَ مَنْ لَيْسَ مِنْهُمْ، فَجَاءَتْ بِغُلامٍ أَسْوَدَ، فَأَقَرَّتْ أَنَّهُ مِنَ الرَّاعِي، فَانْتَفَى مِنْهُ عُمَرُ، وَكَانَ أَبُو حَنِيفَةَ، يَقُولُ: إِذَا حَصَّنَهَا وَلَمْ يَدَعْهَا تَخْرُجُ، فَجَاءَتْ بِوَلَدٍ لَمْ يَسَعْهُ فِيمَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ رَبِّهِ عَزَّوَجَلَّ أَنْ يَنْتَفِيَ مِنْهُ، فَبِهَذَا نَأْخُذُ.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لیے یہ کہا تھا کہ: وہ اُن سے جماع کر کے نطفہ ضائع نہ کریں۔ اور بے شک ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے اپنی لونڈی سے جماع کیا تو اس نے بچہ جن دیا، تو انہوں نے اسے اپنا بیٹا ماننے سے انکار کر دیا۔ اور یہ بات بھی پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنی لونڈی سے وطی کی جس سے وہ حاملہ ہوگئی اور آپ نے دعا مانگی: اے اللہ! جو عمر کی اولاد میں سے نہیں اسے اس کی اولاد میں نہ ملا۔ آپ کی اس لونڈی نے سیاہ رنگ کا بچہ جنا اور اقرار کیا کہ یہ ایک چرواہے کا نطفہ ہے، پس حضرت عمرؓ نے اس کا انکار کر دیا۔

اور حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے تھے کہ جب مولیٰ اپنی لونڈی کو اندر پردے میں پابند رکھتا ہے اور اسے باہر جانے نہیں دیتا، پھر اسی حالت میں ان کے ہاں کوئی بچہ جنم لیتا ہے، تو پھر اس کے اور اس کے رب کے درمیان اس کی گنجائش نہیں کہ وہ مولیٰ اس بچے کا انکار کرے، پس اسی پر ہمارا عمل ہے۔

ایک تعارض اور اس کا جواب

تشریح: یہاں سے حضرت امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ مذکورہ بالا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فرمان: "مَا بَالُ رِجَالٍ یَعْزِلُونَ" سے پیدا ہونے والے تعارض کو دور فرما رہے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے اس فرمان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنی باندی سے عزل کرنا ان کے نزدیک ناجائز ہے، یا یہ کہ باندی جو بھی بچہ جنے وہ اس کے آقا ہی کا شمار ہوگا، چاہے آقا دعویٰ کرے یا نہ کرے؛ بلکہ مقصود اس فرمان کا لوگوں کو یہ تنبیہ کرنا ہے کہ وہ اپنی باندی کو جس سے وطی کرتے ہیں، ایسے ہی ضائع و برباد نہ کریں۔

اور اس بات کی دلیل کہ حضرت عمرؓ کا مقصد محض تنبیہ کرنا ہے، نہ کہ یہ اُن کا مسلک ہے، مندرجہ ذیل حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عمرؓ کا خود کا عمل ہے کہ انہوں نے اپنی باندی سے جس سے وطی کی تھی، اس سے پیدا ہونے والے بچے کی خود سے نفی فرمائی۔

اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ جب آقا باندی کو گھر میں رکھے اور باندی کو باہر نکلنے کی اجازت نہ دیتا ہو، تو اب اگر وہ کوئی بچہ جنتی ہے، تو آقا کو "فیما بینہ وبین اللہ" اس سے بچہ کی نفی

کرنا جائز نہیں ہوگا۔ امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اگر یہ مطلب ہے تو ہم اس مطلب کو بھی اختیار کرتے ہیں۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، حدَّثنا نَافِعٌ، عَنْ صَفِيَّةَ بِنْتِ أَبِي عُبَيْدٍ، قَالَتْ: قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ: مَا بَالُ رِجَالٍ يَطَئُونَ، وَلائِدَهُمْ ثُمَّ يَدَعُونَهُنَّ فَيَخْرُجْنَ؟ وَاللَّهِ لا تَأْتِينِي وَلِيدَةٌ فَيَعْتَرِفُ سَيِّدُهَا أَنْ قَدْ وَطِئَهَا إِلا أَلْحَقْتُ بِهِ وَلَدَهَا فَأَرْسِلُوهُنَّ بَعْدُ، أَوْ أَمْسِكُوهُنَّ.

ترجمہ: صفیہ بنت ابوعبیدؓ بیان کرتی ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ اپنی لونڈیوں سے جماع کرتے ہیں پھر انہیں باہر جانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ خدا کی قسم! وہ جب بھی کسی بچہ کو جنم دیں گی پھر ان کا آقا اعتراض کرے گا کہ اس نے ان سے وطی کی تھیں، تو میں اس بچہ کو آقا کے سپرد کردوں گا، اس کے بعد آقا لونڈیوں کو باہر جانے کی اجازت دیں یا گھر میں بند رکھیں۔

تشریح: یہ روایت بھی حضرت عمر فاروقؓ کی ہے، چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ اس بات کو پسند نہ کرتے کہ مولیٰ اپنی لونڈی سے ہم بستری کرے اور پھر اسے باہر جانے کی ممانعت بھی نہ کرے، کیونکہ اصل تو یہ ہے کہ ایسی لونڈی کو گھر میں چہار دیواری کے اندر رکھا جائے۔ اور اگر لونڈی باہر پھرنے والی ہے تو مولیٰ باوجود وطی کے ہونے والی اولاد کا انکار کرسکتا ہے، اسی لئے آپ نے فرمایا کہ: اگر مولیٰ اقرار کرتا ہے کہ میں نے لونڈی سے وطی کی تھی، تو پھر ہونے والا بچہ اسی کا ہوگا اور وہ لونڈی اس کی اُمّ ولد ہوجائے گی، وہ تسلیم کرے یا نہ کرے۔

اپنی لونڈیوں سے عزل کرنے کے دو (۲) ہی سبب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اس کا حسن و جمال کم ہو جائے گا، اگر بچہ پیدا ہو گیا۔ یا پھر وہ اُمّ ولد بن جانے کی وجہ سے بک نہ سکے گی۔ اس لیے حضرت عمر فاروقؓ نے اس مسئلہ کو بند کرنے کے لئے تہدیداً فرمایا کہ: اگر وطی کے اقرار کے بعد بچہ پیدا ہوا، تو میں اس کو اس کے آقا کے ساتھ ملا دوں گا۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو یہ پسند نہ تھا۔

والله اعلم بالصواب

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆

☆

☆

☆☆☆

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

﴿كِتَابُ الطَّلاق﴾

(طلاق کا بیان)

طلاق کے لغوی معنی: ''کسی چیز کو چھوڑنے اور ترک کردینے'' کے ہیں۔ اور اصطلاحی معنی: ''رَفعُ القَيدِ الثَّابتِ شَرعًا بِالنِكَاحِ'' اس تعلق اور وابستگی کو رفع کردینا جس کا ثبوت شرعاً نکاح کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ بندوں کے بشری تقاضوں اور دینی ودنیاوی مصلحتوں کے پیش نظر جیسے نکاح کو اللہ نے مشروع فرمایا ہے ایسے ہی طلاق کو بھی بندوں کی بعض مصلحتوں کی وجہ سے مشروع فرمایا ہے، کیونکہ بعض مرتبہ مزاج میں عدمِ موافقت، بددینی اور سوءِ مزاجی کی وجہ سے اس کی ضرورت پڑتی ہے؛ لیکن طلاق اپنے مباح ہونے کے باوجود مباح میں سب سے زیادہ مبغوض ہے، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أبغَضُ الحَلاَلِ إلَى اللّٰهِ الطَّلاَقُ. کہ اللہ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے بری چیز طلاق ہے۔ (ابوداؤد، ج:۱،ص:۲۹٦)

ایک دوسری حدیث میں ہے: تَزَوَّجُوا، لاَ تُطَلِّقُوا، فإنَّ الطلاقَ يَهْتَزُّ لهُ عَرشُ الرَّحمٰن. یعنی نکاح کرو اور طلاق مت دو، اس لیے کہ طلاق سے رحمٰن کا عرش کانپنے لگتا ہے۔ (بدائع الصنائع، ج:۳،ص:۱۵۱)

شریعت میں طلاق کے مبغوض ہونے کی وجہ

۱- نفس کا بگاڑ: کچھ لوگ شرمگاہ کی شہوت کے غلام ہوتے ہیں۔ وہ نکاح سے نظامِ خانہ داری قائم کرنے کا ارادہ نہیں کرتے، نہ معاشی معاملات میں

معاونت کا قصد کرتے ہیں، نہ شرمگاہ کی حفاظت اُن کے پیش نظر ہوتی ہے۔ اُن کا مطمحِ نظر بس عورتوں سے لطف اندوز ہونا اور نیا ذائقہ چکھنا ہوتا ہے، چنانچہ وہ بکثرت نکاح کرتے ہیں اور طلاق دیتے ہیں، ایسے نکاح اور زنا میں نفس کے بگاڑ کے اعتبار سے کچھ فرق نہیں، صرف ظاہرداری کا فرق ہے کہ رسم نکاح ادا ہوگئی اور ملکی نظام سے معاملہ ہم آہنگ ہوگیا۔ اسی صورت کے بارے میں حدیث شریف میں ہے: "إِنَّ اللّٰهَ لاَ يُحِبُّ الذوَّاقِيْنَ وَ الذَّوَّاقَاتِ". اللہ تعالیٰ چکھنے والے مردوں اور چکھنے والی عورتوں کو پسند نہیں کرتے۔

۲- معاشرتی بگاڑ: نکاح کا مقصد پاکیزگی کے ساتھ شادمانی کی زندگی بسر کرنا ہے اور یہ مقصد اس وقت حاصل ہوتا ہے، جب میاں بیوی دائمی رفاقت ومعاونت کے لئے آمادہ ہوں اور اپنے آپ کو اس کا خوگر بنائیں۔ اور جب طلاق کا رواج چل پڑتا ہے تو یہ بات باقی نہیں رہتی، زوجین کے ذہنوں میں چند روز رفاقت کا تصور ہوتا ہے، جس سے یہ معاشرتی بگاڑ پیدا ہوتا ہے کہ معمولی باتیں بھی رنجش کا سبب بن جاتی ہیں اور دونوں جدائی کی طرف چل پڑتے ہیں۔ پس کہاں تو نکاح میں یہ ضروری تھا کہ دونوں ناگواریوں کو جھیلیں اور تعلقات کو خوشگوار رکھنے کی کوشش کریں۔ اور کہاں یہ زود رنجیاں اور رسّہ تڑانے کی فکر۔

۳- بے حیائی کا فروغ: اگر عورتیں اس چیز کی عادی بن جائیں گی کہ وہ ذائقہ چکھ کر چل دیں اور لوگ اس کو برا نہ سمجھیں اور نہ اس پر افسوس کریں، نہ نکیر، تو بے حیائی کو فروغ ملے گا، اور کوئی دوسرے کے گھر کی بربادی کو اپنے گھر کی بربادی نہیں سمجھے گا۔ ہر ایک اس فکر میں رہے گا کہ جدائی ہوئی تو فلاں سے نکاح کروں گا۔ اور اس میں جو مفاسد ہیں وہ ظاہر ہیں۔ (مستفاد از: رحمۃ اللہ الواسعہ، ج:۵، ص:۱۳۸)

(ب:۱۷) بابُ طلاق السُّنَّةِ

طلاقِ مسنون کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ دِينَارٍ، قَالَ: سَمِعْتُ ابْنَ عُمَرَ، يَقْرَأُ: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِقُبُلِ عِدَّتِهِنَّ﴾.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن دینارؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرؓ کو یہ پڑھتے ہوئے سنا کہ: اے ایمان والو! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت سے کچھ وقت پہلے طلاق دو۔

طلاق کا ثبوت

تشریح: ماقبل میں طلاق کی لغوی اور اصطلاحی تعریف ذکر کی تھی۔ اب یہاں پر قرآنِ کریم کی ایک آیت پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ طلاق دینا قرآن سے ثابت ہے، چنانچہ آیت ذکر کی: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ﴾ طَلَّقْتُمْ جمع کا صیغہ یا تو تعظیماً استعمال کیا گیا ہے، یا اُمت بھی اس میں شامل ہے۔ تقدیری عبارت ہے: "يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ وَ أُمَّتُهُ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ". اور یہ بھی احتمال ہے کہ "قُلْ" محذوف مانا جائے، تقدیری عبارت ہوگی: "يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأُمَّتِكَ إِذَا طَلَّقْتُمْ". (فتح الباری، ج:۹، ص:۴۳۴)

فَطَلِّقُوهُنَّ لِقُبُلِ عِدَّتِهِنَّ: یہاں عدت سے مراد طہر ہے۔ اسی کی طرف حدیثِ باب میں اشارہ ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ عدت کی دو قسمیں ہیں: (۱) عِدَّةُ الطَّلَاقِ، اس کو "عدة النساء" بھی کہتے ہیں، اس کا تعلق عورتوں سے

ہے۔اس کا ذکر قرآن مجید میں یوں ہے: ﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوْءٍ﴾. (۲)عِدَّةُ التَّطلِيق، اس کا مطلب ہے کہ طلاق دینے کا وقت مقرر ہے۔اسی کا ذکر قرآن مجید میں یوں ہے: ﴿فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾ یعنی عورتوں کو ان کی پاکی کی حالت میں طلاق دو۔

(فیض الباری، ج:۴،ص:۳۰۹،فیض مشکوٰۃ، ج:۱،ص:۱۸۶)

قَالَ مُحَمَّدٌ: طَلاقُ السُّنَّةِ أَنْ يُطَلِّقَهَا لِقُبُلِ عِدَّتِهَا طَاهِرًا مِنْ غَيْرِ جِمَاعٍ، حِينَ تَطْهُرُ مِنْ حَيْضِهَا قَبْلَ أَنْ يُجَامِعَهَا، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ: ''طلاقِ سنت'' یہ ہے کہ مرد اپنی بیوی کے پاکیزگی کے دنوں میں عدت سے کچھ پہلے طلاق دے، جس پاکیزگی کے دوران اس نے وطی نہ کی ہو۔یہی قول امام ابوحنیفہؒ اور ہمارے عام فقہائے کرامؒ کا ہے۔

طلاقِ سنت کی تعریف

تشریح: مذکورہ عبارت میں حضرت امام محمدؒ نے ''طلاقِ سنت'' کی تعریف ذکر کی ہے۔طلاقِ سنت کی تعریف یہ ہے کہ شوہر اپنی منکوحہ مدخول بہا کو ایسے طہر میں طلاق دے جس میں اس کے ساتھ صحبت نہ کی ہو، یعنی جب عورت حیض سے پاک ہوتی ہے تو اس کے ساتھ صحبت کرنے سے پہلے اسے طلاق دی جائے۔امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہائے کرام اسی بات کے قائل ہیں۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، أَنَّهُ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ وَهِيَ حَائِضٌ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَسَأَلَ عُمَرُ

عَنْ ذَلِكَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا، ثُمَّ يُمْسِكْهَا حَتَّى تَطْهُرَ ثُمَّ تَحِيضَ، ثُمَّ تَطْهُرَ، ثُمَّ إِنْ شَاءَ أَمْسَكَهَا بَعْدُ، وَإِنْ شَاءَ طَلَّقَهَا قَبْلَ أَنْ يَمَسَّهَا فَتِلْكَ الْعِدَّةُ الَّتِي أَمَرَ اللَّهُ أَنْ تُطَلَّقَ لَهَا النِّسَاءُ، قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ.

ترجمہ: نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اپنی اہلیہ کو حالت حیض میں طلاق دی، تو حضرت عمرؓ نے اس سلسلے میں آپ ﷺ سے دریافت کیا، تو آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ: عبداللہ کو حکم دو کہ وہ اس عورت سے رجوع کرلے (یعنی مثلاً یوں کہے کہ: میں نے اس کو اپنے نکاح میں واپس لے لیا) اور پھر اس کو اپنے پاس رکھے، یہاں تک کہ وہ پاک ہوجائے۔ اور پھر جب وہ حائضہ ہو اور اس کے بعد پاک ہوجائے، پھر اگر عبداللہ چاہے تو اسے اپنے ساتھ رکھے۔ اور اگر چاہے تو اس کے ساتھ صحبت کرنے سے پہلے اسے طلاق دیدے، پس یہی وہ عدت ہے جس کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ اس میں عورتوں کو طلاق دی جائے۔
امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ: ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔

تشریح: مذکورہ روایت میں ایک صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے۔ جس کی تشریح ترجمہ سے واضح ہے۔ البتہ مذکورہ روایت سے چند باتیں خاص طور پر معلوم ہوتی ہیں:

(۱) طلاق دینے کا وقت طہر ہے، حالت حیض میں طلاق دینا گناہ ہے، لیکن اگر کسی شخص نے حالت حیض میں طلاق دی تو وہ واقع ہوجائے گی۔ اگر شوہر رجوع کرے گا تو اب اس کو صرف دو طلاقوں کا اختیار رہے گا۔

(۲) اگر کسی نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دی ہے، تو اس کو رجوع کر لینا چاہئے اور پھر اگر طلاق دینے ہی میں مصلحت سمجھ رہا ہے تو طہر میں طلاق دے۔
(۳) طلاق دینے کی نوبت آئے تو ایک طلاق دینا چاہیے اور ایسے طہر میں طلاق دینی چاہئے جس میں بیوی سے صحبت نہ کی ہو۔ (از خود)

امرأتہٗ: اس عورت کا نام علامہ نوویؒ نے تہذیب میں آمنہ بنت غفار لکھا ہے۔ بعض نے آمنہ بنت عمار۔ اور مسند احمد کی روایت میں نوار آیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ ان روایات میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ آمنہ نام اور نوار لقب ہو۔
(فتح الباری، ج:۹، ص:۴۳۵)

قَولُہ: مُرْہُ فَلیُراجِعْھَا: اگر کسی نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی، تو اس طلاق سے رجوع کے متعلق ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام مالکؒ اور داؤد ظاہریؒ کے نزدیک رجوع کرنا واجب ہے۔ اور حنفیہ کے نزدیک بھی یہی مختار ہے۔ اور امام شافعیؒ کے نزدیک رجوع کرنا مستحب ہے۔ (البحر الرائق، ج:۳، ص:۲۴۲)

رجعت کے وجوب کی دلیلیں

(۱) حدیث میں امر کا صیغہ استعمال فرمایا ہے: فَقالَ رسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہِ وسلَّم: مُرْہُ فلیُراجِعْھَا. اور امر وجوب کے لیے آتا ہے، اس لیے رجعت کرنا واجب ہوگا۔

(۲) تیسری دلیل یہ ہے کہ حیض کی حالت میں طلاق دینے سے عدت لمبی ہوگی جو عورت کے لیے ضرر ہے۔ اور دوسرے کے ضرر کو دور کرنا واجب ہے، اس لیے رجعت کر کے ضرر کو دور کرنا واجب ہوگا۔ (اثمار الہدایہ، ج:۴، ص:۲۸۹)

ثُمَّ تَحِیضَ، ثُمَّ تَطْھُرَ: مطلب یہ ہے کہ جس حیض میں طلاق دی تھی، اس کے

متصل طہر میں طلاق نہ دے؛ بلکہ اس کے بعد حیض آئے گا، پھر دوسرا طہر آئے گا، اسی دوسرے طہر میں وہ طلاق دے سکتا ہے، جس حیض میں طلاق دی ہے اس کے متصل طہر میں طلاق شافعیہ اور حنفیہ دونوں کے اصح قول کے مطابق جائز نہیں؛ بلکہ اگلے طہر کا انتظار کیا جائے گا اور یہ انتظار واجب ہے۔ امام احمدؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے؛ البتہ اگر طہر ثانی تک طلاق کو مؤخر کیا جائے تو مستحب ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے "المُحَرَّر" میں قولِ اوّل کو اختیار کیا ہے۔ طہر اوّل میں طلاق دینے کو انہوں نے بدعت کہا ہے۔ (فتح الباری، ج:۹، ص:۴۳۸)

طلاق کی اقسام

طلاق کی تین قسمیں ہیں:

اوّل : طلاقِ احسن

دوم : طلاقِ حسن

سوم : طلاقِ بدعی۔

(۱) طلاقِ احسن: یہ ہے کہ ایک عدد طلاق ایسے طہر میں دی جائے جس میں جماع نہ کیا ہو، پھر تین ماہ عدت گزر جانے تک رجوع اور جماع سے اجتناب کرے، عدت گذرنے پر عورت بائنہ ہو جائے گی۔ یہ احسن اس لئے ہے کہ شوہر کو ہر وقت رجوع کا اختیار رہے گا، سوچنے کا طویل موقع ملے گا۔ اور طلاق کے مکروہ الفاظ بھی کم سے کم استعمال ہوتے ہیں۔

(۲) طلاق حسن: اس کو کہتے ہیں کہ شوہر نے طہر میں اپنی بیوی کو ایک طلاق دیدی، دوسرے طہر میں دوسری طلاق دیدی۔ اور تیسرے طہر میں تیسری طلاق دیدی، اس طرح عورت پر تین طلاقیں واقع ہو گئیں۔

(۳) طلاقِ بدعی: یہ ہے کہ ایک طہر میں تین طلاقیں ایک مجلس میں دے دی، یا الگ الگ اوقات میں دی، یا حالت حیض میں بیوی کو طلاق دیدی، یہ طلاقِ بدعی ہے۔ اس طرح بدعی طلاق دینے سے آدمی گنہگار ہوجائے گا، مگر طلاق پڑجائے گی۔

(ب:۱۸) بَابُ: طَلاقِ الْحُرَّةِ تَحْتَ الْعَبْدِ

غلام کی آزاد بیوی کو طلاق دینے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، حَدَّثَنَا الزُّهْرِيُّ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، أَنَّ نُفَيْعًا مُكَاتَبَ أُمِّ سَلَمَةَ كَانَتْ تَحْتَهُ امْرَأَةٌ حُرَّةٌ، فَطَلَّقَهَا تَطْلِيقَتَيْنِ، فَاسْتَفْتَى عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ: فَقَالَ: حَرُمَتْ عَلَيْكَ.

ترجمہ: سعید بن مسیبؒ بیان کرتے ہیں کہ سیدہ اُمّ سلمہؓ کے مکاتب غلام نفیع کی بیوی ایک آزاد عورت تھی، اس غلام نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیدیں، پھر اس نے حضرت عثمان غنیؓ سے مسئلہ دریافت کیا، تو انہوں نے فرمایا: تمہاری بیوی تمہارے لیے حرام ہوگئی ہے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، حَدَّثَنَا أَبُو الزِّنَادِ، عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ، أَنَّ نُفَيْعًا كَانَ عَبْدًا لِأُمِّ سَلَمَةَ، أَوْ مُكَاتَبًا، وَكَانَتْ تَحْتَهُ امْرَأَةٌ حُرَّةٌ، فَطَلَّقَهَا تَطْلِيقَتَيْنِ، فَأَمَرَهُ أَزْوَاجُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَأْتِيَ عُثْمَانَ فَيَسْأَلَهُ عَنْ ذَلِكَ، فَلَقِيَهُ عِنْدَ الدَّرَجِ وَهُوَ آخِذٌ بِيَدِ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ، فَسَأَلَهُ فَابْتَدَرَاهُ جَمِيعًا، فَقَالَا: حَرُمَتْ عَلَيْكَ، حَرُمَتْ عَلَيْكَ.

ترجمہ: سلیمان بن یسارؒ بیان کرتے ہیں کہ نفیع نامی صاحب سیدہ اُمّ

سلمہؓ کے غلام تھے (راوی کو شک ہے، شاید یہ الفاظ ہیں) مکاتب غلام تھے، ان کی بیوی ایک آزاد عورت تھی، اس غلام نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیدیں، تو نبی اکرمؐ کی ازواج نے اس غلام کو یہ ہدایت کی کہ وہ حضرت عثمانؓ کے پاس جا کر ان سے مسئلہ دریافت کریں، تو وہ غلام حضرت عثمانؓ سے ''درج'' کے پاس ملا، اس وقت حضرت عثمان غنیؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کا ہاتھ تھام رکھا تھا، تو ان دونوں حضرات نے جلدی سے جواب دیا کہ وہ عورت تمہارے لیے حرام ہو چکی ہے، تمہارے لیے حرام ہو چکی ہے۔

طلاق کا اعتبار کس کی حالت کو دیکھ کر کیا جائے گا؟

تشریح: مذکورہ روایت میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ طلاق کا اختیار مرد کی حالت کو دیکھ کر کیا جائے گا، یا عورت کی حالت کو دیکھ کر؟ تو اس سلسلے میں تفصیل یہ ہے کہ اس مسئلہ میں حضراتِ صحابہ کرامؓ کے درمیان ہی اختلاف پایا جاتا ہے۔

چنانچہ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: طلاق کا اختیار مرد کی حالت کو دیکھ کر اور عدت کا اعتبار عورت کی حالت کو دیکھ کر کیا جائے گا، یعنی اگر مرد آزاد ہے تو وہ تین طلاق دینے کا اختیار رکھتا ہے، اس کی بیوی خواہ آزاد ہو یا باندی، اور عدت عورت کے اعتبار سے ہوگی، یعنی اگر عورت مطلقہ باندی ہے تو اس کی عدت دو حیض ہوگی، اس کا خاوند خواہ آزاد ہو، یا غلام۔ اور اگر عورت آزاد ہے اس کی عدت تین حیض ہوگی، اس کا خاوند خواہ آزاد ہو یا غلام۔ امام محمدؒ نے مذکورہ باب میں تین روایات ذکر فرمائی ہیں اور یہ تینوں روایات ان حضرات کے مسلک کے مطابق ہیں جن کے یہاں طلاق اور عدت دونوں کا اعتبار مرد کی حالت کو دیکھ کر کیا جائے گا۔

فقہائے کرام کا اختلاف

جمہور کا مذہب: جمہور اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک طلاق کا مدار مردوں پر ہے۔ مرد اگر آزاد ہے تو اس کی بیوی تین سے کم میں مغلظہ نہ ہوگی۔ اور اگر غلام ہے تو دو میں مغلظہ ہو جائے گی۔

حنفیہ کا مذہب: حنفیہ کے نزدیک طلاق کے عدد میں عورتوں کا اعتبار ہے، یعنی باندی کی دو طلاقیں ہیں، اس کا شوہر آزاد ہو یا غلام۔ اور آزاد عورت کی تین طلاقیں ہیں، اس کا شوہر آزاد ہو یا غلام، لہٰذا باندی دو طلاقوں سے مغلظہ ہو جائے گی اور آزاد تین طلاقوں سے۔

جمہور کی دلیل: حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے ہے: "الطَّلاقُ بالرِّجَالِ، والعِدَّةُ بالنِّسَاءِ". (الدرایہ، ج:۲، ص:۷۰) طلاق مردوں کے ساتھ ہے اور عدت عورتوں کے ساتھ ہے۔ اس حدیث میں طلاق اور عدت کے درمیان مقابلہ کیا گیا ہے، لہٰذا مقابلہ کو ثابت کرنے کے لیے طلاق میں مردوں کے حال کا اعتبار ہوگا۔

دلیل کا جواب: صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ: "الطَّلاقُ بالرِّجال" کے معنی ہیں اِیقَاعُ الطَّلاقِ بالرِّجال، یعنی طلاق واقع کرنا مردوں کے اختیار میں ہے۔ اس تاویل کے بعد یہ حدیث شوافع کا مستدل نہیں بن سکتی، نیز یہ روایت مرفوع نہیں؛ بلکہ موقوف ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ: لَمْ أَجِدْهُ مرفُوعًا. (الدِّرَايَة في تَخرِيج أحَادِيثِ الهِدَايَة: ۲/ ۷۰) اور شوافع کے نزدیک حدیث موقوف قابل استدلال نہیں ہوتی ہے۔

حنفیہ کی دلیل: عَنْ عَائشةؓ عَنِ النبيِّ صَلَّى اللّٰهُ عليهِ وسلَّم قالَ: طلاقُ الأمَةِ تَطلِيقَتَانِ، وعِدَّتُها حيضَتَانِ. (ترمذی، ج:۱، ص:۱۴۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: باندی کی دو طلاقیں ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عددِ طلاق میں عورتوں کا اعتبار ہے نہ کہ مردوں کا۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: إِذَا طَلَّقَ الْعَبْدُ امْرَأَتَهُ اثْنَتَيْنِ فَقَدْ حَرُمَتْ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ، حُرَّةً كَانَتْ، أَوْ أَمَةً، وَعِدَّةُ الْحُرَّةِ ثَلاثَةُ قُرُوءٍ، وَعِدَّةُ الأَمَةِ حَيْضَتَانِ.

ترجمہ: نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ جب کوئی غلام اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیدیتا ہے تو وہ عورت (اس کے لیے) حرام ہو جائے گی، خواہ وہ عورت آزاد ہو، یا لونڈی ہو، البتہ آزاد عورت کی عدت تین حیض ہوگی اور لونڈی کی عدت دو حیض ہوگی۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

تشریح: اس عبارت میں صاحب کتاب نے ایک **اعتراض** کو ذکر کیا ہے۔ اور وہ اعتراض یہ ہے کہ بعض حضرات نے باب کی تینوں روایات کو سامنے رکھ کر یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر طلاق کا اعتبار مرد کی حالت پر نہیں ہے تو پھر مذکورہ تینوں روایات کا مطلب کیا ہے؟ کیوں کہ اُن میں تو طلاق کا اعتبار مرد کی حالت پر کیا گیا ہے؟

جواب: مذکورہ اعتراض کے صاحب مبسوط نے دو جواب دیئے ہیں:

(۱) پہلا جواب یہ ہے کہ جن روایات سے یہ نظر آتا ہے کہ طلاق کا اعتبار مرد

کی حالت پر ہوگا، تو اس مفہوم کے الفاظ حضرت زید بن ثابت کا اپنا کلام ہے، ان کا مرفوعاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہونا ثابت نہیں۔

(۲) دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ طلاق کا اعتبار مرد کی حالت سے مراد یہ ہے کہ طلاق دینا یا نہ دینا مرد کا کام ہے، عورت کا نہیں۔ اور وہ روایات کہ جن میں ہے کہ غلام دو طلاقیں دے گا، تو اس کا یہ مفہوم نہیں کہ غلام تیسری طلاق نہیں دے سکتا، یا اس روایت کا معنی یہ ہے کہ غلام صرف دو طلاقیں دے سکتا ہے، جب اس کی بیوی لونڈی ہو۔ (المَبسُوط، ج:۴، ص:۴۰، مطبوعہ بیروت)

قَالَ مُحَمَّدٌ: قَدِ اخْتَلَفَ النَّاسُ فِي هَذَا، فَأَمَّا مَا عَلَيْهِ فُقَهَاؤُنَا فَإِنَّهُمْ يَقُولُونَ: الطَّلاقُ بِالنِّسَاءِ وَالْعِدَّةُ بِهِنَّ لأَنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ قَالَ: فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ، فَإِنَّمَا الطَّلاقُ لِلْعِدَّةِ فَإِذَا كَانَتِ الْحُرَّةَ وَزَوْجُهَا عَبْدٌ فَعِدَّتُهَا ثَلاثَةُ قُرُوءٍ وَطَلاقُهَا ثَلاثَةُ تَطْلِيقَاتٍ لِلْعِدَّةِ كَمَا قَالَ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى، وَإِذَا كَانَ الْحُرُّ تَحْتَهُ الأَمَةُ فَعِدَّتُهَا حَيْضَتَانِ، وَطَلاقُهَا لِلْعِدَّةِ تَطْلِيقَتَانِ، كَمَا قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ.

قَالَ مُحَمَّدٌ: أَخْبَرَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ يَزِيدَ الْمَكِّيُّ، قَالَ: سَمِعْتُ عَطَاءَ بْنَ أَبِي رَبَاحٍ، يَقُولُ: قَالَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ: الطَّلاقُ بِالنِّسَاءِ وَالْعِدَّةُ بِهِنَّ، وَهُوَ قَوْلُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ، وَأَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں لوگوں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کے فقہاء جس بات کے قائل ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ طلاق میں عورتوں کا اعتبار کیا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''تم عورتوں کو ان کی عدت کے لیے طلاق دو''۔ تو طلاق یقیناً عدت کے لیے ہوتی ہے، لہٰذا جب کوئی عورت آزاد ہے اور اس کا خاوند غلام ہو تو اس کی عدت تین حیض ہوگی اور اس کی طلاق تین طلاقیں ہوں گی عدت کے لیے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

عطاء بن ابی رباح فرماتے ہیں کہ حضرت علی بن ابو طالبؓ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے: طلاق میں عورت کا اعتبار کیا جاتا ہے اور عدت میں بھی انہیں کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں صحابۂ کرام کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے؛ البتہ جس بات کے قائل ہمارے یہاں کے فقہائے کرام ہیں وہ یہ ہے کہ طلاق اور عدت دونوں میں عورت کا لحاظ کیا جائے گا، اس لیے کہ اللہ کا فرمان ہے کہ ''تم ان کو طلاق دو ان کی عدت کے حساب سے''، تو جب طلاق عدت کے حساب سے ہوگی تو چونکہ اس آزاد عورت کی عدت جس کا شوہر غلام ہو تین حیض ہے، تو عدت کے حساب سے اس کی طلاق بھی تین ہوگی اور اس باندی کی عدت جس کا شوہر آزاد ہوتا ہے دو حیض ہے، تو عدت کے لحاظ سے اس کی طلاق بھی دو ہوں گی، اللہ کے مذکورہ فرمان کے مطابق اور یہی مذہب حضرت علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ہمارے اکثر فقہائے کرام کا ہے۔

......☆☆☆......

(ب:۱۹) بَابُ مَا يُكره للمُطلّقة المَبتُوبة والمُتوفّٰى عنها من المَبيتِ فى غير بيتها

مطلقہ اور بیوہ کا کسی دوسرے گھر میں عدت گذارنے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، حَدَّثَنَا نَافِعٌ، أَنَّ ابْنَ عُمَرَ، كَانَ يَقُولُ: لا تَبِيتُ الْمَبْتُوتَةُ، وَلا الْمُتَوَفَّى عَنْهَا إِلا فِي بَيْتِ زَوْجِهَا.

ترجمہ: نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ مطلقہ اور بیوہ عورت صرف اپنے شوہر کے گھر اپنی عدت پوری کرے۔

تشریح: روایت مذکورہ میں ''طلاقِ بتہ'' یا ''طلاقِ مبتوتہ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو اسی طلاق پر بولا جاتا ہے جس کے بعد رجوع نہ ہو سکے، لہٰذا یہ لفظ بائنہ اور مغلظہ دونوں کو شامل ہے۔

لا تَبِيتُ الْمَبْتُوتَةُ: یہاں سے فرمارہے ہیں کہ جو عورت عدت گذار رہی ہو طلاقِ رجعی کی عدت ہو، یا طلاقِ بائنہ کی۔ اور چاہے اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہو، ان تمام عورتوں کے لیے حکم یہ ہے کہ اس گھر میں عدت گذارنا ضروری ہے، جس میں طلاق واقع ہوئی ہے، یا وفات ہوئی ہے۔

دلیل یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا: ''لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ'' معتدہ عورت کو اپنے گھروں سے نہ نکالو۔ اور عورت کا بیت وہ کہلائے گا جس میں وہ رہتی تھی۔

البتہ عدتِ وفات والی عورت روزی روٹی کمانے کے لیے نکل سکتی ہے، لیکن سونے کا انتظام اس گھر میں کرنا چاہئے جس میں عورت عدت گذار رہی ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، أَمَّا الْمُتَوَفّٰى عَنْهَا فَإِنَّهَا تَخْرُجُ بِالنَّهَارِ فِي حَوَائِجِهَا، وَلا تَبِيتُ إِلا فِي بَيْتِهَا، وَأَمَّا الْمُطَلَّقَةُ مَبْتُوتَةً كَانَتْ، أَوْ غَيْرَ مَبْتُوتَةٍ، فَلا تَخْرُجُ لَيْلًا، وَلا نَهَارًا مَا دَامَتْ فِي عِدَّتِهَا، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اسی پر ہمارا عمل ہے کہ بیوہ عورت (عدت کے ایام میں) اپنی ضروریات کے سلسلے میں باہر جا سکتی ہے؛ لیکن رات صرف اپنے گھر میں بسر کرے گی۔ اور مطلقہ عورت خواہ مبتوتہ ہو، یا غیر مبتوتہ، تو وہ عورت عدت کے دوران نہ دن کو گھر سے نکلے گی اور نہ رات کو۔ یہی حضرت امام ابو حنیفہؒ اور ہمارے عام فقہائے کرام کا قول ہے۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ متوفی عنہا زوجہا (بیوہ) عورت عدت کے دوران اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے باہر نکل سکتی ہے؛ البتہ وہ رات اپنے گھر میں ہی بسر کرے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیوہ ہونے کی وجہ سے اس کے گھر کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا؛ اس لیے وہ باہر نکلنے کی محتاج ہوگی؛ تاکہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکے، اس لیے اسے دن میں باہر نکلنے کی اجازت دی جائے گی۔ شرح وقایہ کے متن میں یہ عبارت مذکور ہے: وَتَخرُجُ مُعتدَّةُ المَوتِ فی الملوین) یعنی وہ متوفی عنہا زوجہا دن اور رات کے اوقات میں اپنے گھر سے باہر نکل سکتی ہے، کیونکہ اس کا نفقہ اس کے اپنے ذمہ میں ہے، تو نکلنے کی طرف محتاج ہوگئی۔ ہاں! اس پر لازم ہے کہ رات گذارنے کے لئے اسی مکان میں آئے جہاں عدت گذارنے کے لیے بیٹھی ہے۔ اب رہ گیا مطلقہ

عورت کا مسئلہ تو اس کے نکلنے یا نہ نکلنے میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔

فقہائے کرام کا اختلاف

جمہور کا مذہب: جمہور کے نزدیک مطلقہ معتدہ بھی دن کے وقت باہر نکل سکتی ہے۔

حنفیہ کا مذہب: حنفیہ کے نزدیک مطلقہ معتدہ کسی سخت مجبوری کے بغیر گھر سے باہر نہیں جاسکتی۔

جمہور کی دلیل: حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میری خالہ کو طلاق ہوگئی، انھوں نے ارادہ کیا کہ (گھر سے باہر جاکر) کھجوریں توڑ لاؤں تو ایک شخص نے انہیں گھر سے باہر نکلنے سے منع کیا، وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور یہ واقعہ بیان کیا، تو آپؐ نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جاؤ اور اپنے درخت سے کھجوریں توڑ لاؤ، کیونکہ شاید تم یہ کھجوریں اللہ کی راہ میں دو، یا ان کے ذریعہ احسان کرو۔ (صحیح مسلم، ج:۱، ص:۴۸۶)

معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجوریں توڑنے اور باغ میں جانے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔

حنفیہ کی دلیل: ائمہ احناف نے قرآنِ کریم کی آیت کے عموم سے استدلال کیا ہے۔ آیت یہ ہے: ﴿لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ﴾ اس مطلق آیت کو حضرت جابرؓ کی خبر واحد سے مقید نہیں کیا جاسکتا ہے، لہٰذا بغیر کسی ضرورت کے مطلقہ عورت عدت کے اندر گھر سے باہر نہیں جاسکتی ہے۔ اور اگر ضرورت پڑ جائے تو پھر جانا اور نکل کر رات کو واپس آنا جائز ہے۔

احناف نے مجبوری میں نکلنے کے جواز کے لیے حضرت جابرؓ کی زیر بحث حدیث سے استدلال کیا ہے (جسے جمہور نے اپنی دلیل بنایا ہے) کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کی اجازت کو "ولَعلَّكِ أن تصدقِي وتفعَلِي مَعرُوفًا" کے ساتھ مقید فرمایا ہے، تو یہ ایک ضرورت اور حاجت کی طرف اشارہ ہے کہ اگر صاحب نصاب ہوگئی تو زکوٰۃ ادا کردوں گی اور اگر زکوٰۃ نہیں تو نفلی صدقات میں سے کسی کے ساتھ بھلائی کردوں گی۔ معلوم ہوا کہ کسی دینی اور دنیوی حاجت وضرورت کے لیے نکلنا جائز ہے، ورنہ جائز نہیں ہے۔ امام طحاویؒ نے حضرت جابر کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے کہ نکلنا جائز نہیں۔ معلوم ہوا کہ جمہور نے جس حدیث کو اپنی دلیل میں پیش کیا ہے وہ حدیث منسوخ ہے۔

......☆☆☆......

(ب:۲۰) بَابُ الرَّجُلِ يَأْذَنُ لِعَبْدِهٖ فِى التَّزْوِيجِ هَلْ يَجُوزُ طَلَاقُ الْمَوْلٰى عَلَيْهِ؟

مولیٰ جب اپنے غلام کو نکاح کی اجازت دیتا ہے تو کیا وہ طلاق بھی دے سکتا ہے؟ اس کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: مَنْ أَذِنَ لِعَبْدِهِ فِي أَنْ يَنْكِحَ فَإِنَّهُ لا يَجُوزُ لامْرَأَتِهِ طَلاقٌ إِلا أَنْ يُطَلِّقَهَا الْعَبْدُ، فَأَمَّا أَنْ يَأْخُذَ الرَّجُلُ أَمَةَ غُلامِهِ، أَوْ أَمَةَ وَلِيدَتِهِ، فَلا جُنَاحَ عَلَيْهِ.

ترجمه: نافع رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ

نے یہ بات بیان کی کہ جس شخص نے اپنے غلام کو شادی کرنے کی اجازت دی تو اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ غلام کی بیوی کو طلاق دے، اس کو طلاق صرف اس کا خاوند ہی دے سکتا ہے۔ ہاں! اگر مولیٰ اپنے غلام کی بیوی (لونڈی) لے لیتا ہے تو اب اس پر کوئی حرج نہیں ہے۔

تشریح: مذکورہ روایت میں مسئلہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب کوئی آقا اپنے غلام کو شادی کرنے کی اجازت دیتا ہے تو اب اس آقا کو اس بات کا اختیار نہیں ہے کہ وہ غلام کی بیوی کو طلاق دے، کیونکہ نکاح کی ملکیت شوہر کا حق ہے، لہٰذا طلاق بھی صرف شوہر ہی دے سکتا ہے، نہ کہ کوئی دوسرا، یعنی جس کو نکاح کی ملکیت حاصل نہیں ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ اور یہی حضرت امام ابوحنیفہ اور ہمارے عام فقہائے کرام کا مذہب ہے۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر آقا اپنے غلام کی بیوی کو طلاق دے دے تو یہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اور یہی ہمارے امام ابوحنیفہ اور اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نکاح کی ملکیت شوہر کا حق ہے، لہٰذا یہ ساقط بھی شوہر (غلام) کی طرف سے ہوگی آقا کی طرف سے نہیں۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، أَنَّ عَبْدًا لِبَعْضِ ثَقِيفٍ جَاءَ إِلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِؓ، فَقَالَ: أَنَّ سَيِّدِي أَنْكَحَنِي جَارِيَتَهُ، فُلَانَةً، وَكَانَ عُمَرُ يَعْرِفُ الْجَارِيَةَ، وَهُوَ يَطَؤُهَا فَأَرْسَلَ عُمَرُ إِلَى الرَّجُلِ، فَقَالَ: مَا فَعَلَتْ جَارِيَتُكَ؟ قَالَ: هِيَ عِنْدِي، قَالَ: هَلْ تَطَؤُهَا؟ فَأَشَارَ إِلَى بَعْضِ مَنْ كَانَ عِنْدَهُ، فَقَالَ: لَا، فَقَالَ عُمَرُ: أَمَا وَاللّٰهِ لَوِ اعْتَرَفْتَ لَجَعَلْتُكَ نَكَالًا.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ بنی ثقیف قبیلہ سے تعلق رکھنے والا ایک غلام حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اس نے عرض کیا کہ: میرے مولیٰ نے اپنی فلاں باندی کا مجھ سے نکاح کر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ اس باندی کو جانتے تھے۔ غلام نے کہا: نکاح کر دینے کے بعد بھی مولیٰ اس سے ہم بستری کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک آدمی بھیج کر اسے بلوایا اور پوچھا کہ: تمہاری فلاں باندی کہاں ہے؟ کہنے لگا: وہ میرے پاس ہے۔ پوچھا: کیا تو اس سے ہم بستری کرتا ہے؟ حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھے لوگوں میں سے کسی نے اشارہ کر دیا، تو اس مولیٰ نے کہا: نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: خدا کی قسم! اگر یہ شخص ہم بستری کا اعتراف کر لیتا تو میں اسے ضرور سزا دیتا۔

تشریح: مذکورہ روایت میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ: حضرت عمرؓ کے پاس ایک شخص کی شکایت کی گئی کہ وہ اپنی باندی کا نکاح کر دینے کے بعد بھی اس سے وطی کرتا ہے، آپ نے اسے سزا دینے کا اظہار فرمایا۔ اس واقعہ سے چند مسائل نکلتے ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) آقا جب اپنی باندی کا کسی کے ساتھ نکاح کر دیتا ہے، تو اب آقا کے لیے اس

سے وطی کرنا جائز نہیں۔ہاں! اس منکوحہ باندی سے آقا خدمت کرا سکتا ہے۔

(۲) آقا نے اگر اپنی باندی کا اپنے ہی غلام سے عقد کر دیا اور اس غلام کی بھی اپنی باندی ہے۔اس کی صورت یوں بنے گی کہ مولیٰ نے ایک غلام کو کاروبار کی اجازت دے رکھی ہے، اس عبد ماذون نے کوئی باندی اپنے لئے خرید لی، اس خریدی ہوئی غلام کی باندی سے غلام کا آقا اگر وطی کرتا ہے تو اس کی گنجائش ہے، لیکن غلام کے عقد میں دی گئی اپنی باندی سے آقا وطی نہیں کر سکتا۔

(۳) آقا نے جس باندی کا نکاح کر دیا اس باندی کی اپنی بھی باندی ہے، تو آقا اپنی باندی کی باندی کو استعمال کر سکتا ہے۔

اعتراض: حضرت عمر بن خطابؓ نے جس شخص مذکور کو بلوایا اور الزام کی تصدیق چاہی تو حاضرین میں سے کسی نے اشارہ کر کے اسے اقرار سے بچا لیا تو وہ سزا سے بھی بچ گیا۔اس پر اگر کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ مجرم حقیقی کو اقرارِ جرم سے باز رکھنا اچھی بات نہیں ہے، لہٰذا صحابۂ کرامؓ نے ایسا کیوں کیا؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ حدود و تعزیرات میں برے عمل پر پردہ ڈالنا اور انکار کرنا اقرار سے افضل ہے، کیونکہ وہ شخص دنیا میں ذلت سے بچ جائے گا اور اس پر کوئی شہادت بھی موجود نہیں ہوئی، بایں وجہ اللہ تعالیٰ سے اس کے لئے مغفرت کی اُمید ہے۔

فائدہ: بعض احادیث میں مذکور ہے کہ قیامت کے دن ایک آدمی اللہ کے حضور میں پیش کیا جائے گا، جو نیکیوں سے خالی ہوگا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اس کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دے کر اسے جنت میں داخل کر دو۔فرشتے عرض کریں گے: باری تعالیٰ! اس کا نامہ اعمال تو برائیوں سے سیاہ ہے۔ارشاد ہوگا: ٹھیک کہتے

ہو، لیکن اس کا ایک طریقہ اور عمل یہ تھا کہ لوگوں کے عیب دیکھتا تو چشم پوشی کرتا تھا؛ تاکہ وہ ذلیل اور رسوانہ ہو جائے۔ جب اس نے میرے بندے کو رسوانہ کیا تو آج میں بھی اسے رسوانہ کروں گا۔

معلوم ہوا کہ عیوب کی پردہ پوشی مستحسن ہے اور اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، کیونکہ وہ خود بھی ستار العیوب ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، لا يَنْبَغِي إِذَا زَوَّجَ الرَّجُلُ جَارِيَتَهُ عَبْدَهُ أَنْ يَطَأَهَا لأَنَّ الطَّلاقَ وَالْفُرْقَةَ بِيَدِ الْعَبْدِ إِذَا زَوَّجَهُ مَوْلاهُ، وَلَيْسَ لِمَوْلاهُ أَنْ يُفَرِّقَ بَيْنَهُمَا بَعْدَ أَنْ زَوَّجَهَا فَإِنْ وَطِئَهَا يُنْدَمُ إِلَيْهِ فِي ذَلِكَ، فَإِنْ عَادَ أَدَّبَهُ الإِمَامُ عَلَى قَدْرِ مَا يَرَى مِنَ الْحَبْسِ وَالضَّرْبِ، وَلا يَبْلُغَ بِذَلِكَ أَرْبَعِينَ سَوْطًا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنی باندی کا اپنے غلام سے نکاح کر دیتا ہے تو اب اسے اس باندی سے وطی نہیں کرنا چاہئے؛ کیونکہ طلاق اور جدائی کا اختیار غلام کو مل چکا ہے، جب کہ اسکے آقا نے اس کا نکاح کر دیا۔ اور اب آقا کو یہ اختیار نہیں رہا کہ ان دونوں میاں بیوی کے درمیان تفریق کرے۔ اور اگر آقا نکاح کر دینے کے بعد بھی اپنی باندی سے مباشرت کرتا ہے تو اسے ندامت دلائی جائے۔ اور اگر پھر بھی باز نہ آئے تو امام اور قاضی اپنی صوابدید کے مطابق اسے پابند کرے، چاہے قید کرے یا کوڑے مارے لیکن یہ سزا چالیس کوڑوں سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے قولِ مذکور کا مطلب یہ ہے کہ اگر آقا نے اپنے غلام کا نکاح اپنی باندی سے کیا تو آقا کے لئے اس باندی سے وطی کرنا

جائز نہیں ہوگا اس لئے کہ آقا کے غلام کے ساتھ اپنے اس باندی کی شادی کر دینے کی وجہ سے طلاق اور جدائیگی کا اختیار غلام کے ہاتھ میں جا چکا ہے، اور شادی کر دینے کے بعد ان دونوں کے درمیان تفریق کر دینا آقا کے اختیار میں نہیں رہا، اس لیے اگر آقا وطی کرے گا تو اس کو اس پر ملامت کی جائے گی، لیکن اگر بار بار ایسا ہی کرے تو حاکم وقت اس کو جو مناسب ہو- قید یا کوڑوں کی- سزا دے گا؛ تاہم اس کی سزا چالیس کوڑوں سے کم ہی ہوگی۔

(ب:۲۱) بَابُ: الْمَرْأَةِ تَخْتَلِعُ مِنْ زَوْجِهَا بِأَكْثَرَ مِمَّا أَعْطَاهَا أَوْ أَقَلَّ

عورت کا اپنے خاوند سے حق مہر سے زیادہ یا کم رقم پر خلع کرنے کا بیان

خلع کی لغوی تحقیق اور مناسبت

تشریح: اس باب کے اندر خلع کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اولاً خلع کی لغوی اور اصطلاحی تعریف اور کچھ مزید تفصیلات ملاحظہ فرمائیں:

خلع کے لغوی معنی: باب فَتَحَ، يَفْتَحُ سے خَلع جب خاء کے فتحہ کے ساتھ آجائے تو یہ لغت میں کسی چیز کے نکالنے، کھولنے، زائل کرنے اور کھینچنے میں استعمال کیا جاتا ہے، خاص طور پر بدن سے کپڑے اُتارنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور جب خاء کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہو تو یہ ازالۂ زوجیت کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہی خلع ہے۔

اور مناسبت یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار

دیا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾. اور خلع کے ذریعہ ایک دوسرے سے علیحدگی، لباس اُتار دینے کے مرادف ہے، یعنی جب میاں بیوی نے خلع کا عمل کیا تو گویا دونوں نے اپنے اپنے بدن سے کپڑے اُتار لئے۔

(ارشاد الساری، ج:۱۲، ص:۴۰)

اصطلاحی تعریف: علامہ عینیؒ نے اپنے شیخ کے حوالے سے خلع کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ سے کی ہے: "هُوَ فِرَاقُ الرَّجُل اِمرأتَـهُ علىٰ عِوَضٍ يحصلُ له". بعضوں نے تعریف کی ہے: "هُو مُفارقةُ الرَّجُل اِمرأتَه مالٌ". بعضوں نے فرمایا: "هُو اِزَالَةُ الزَّوجِيَّة بِمَا يُعطِيهِ مِن المَالِ".

مذکورہ تمام تعریفوں کا خلاصہ یہ ہے کہ شوہر بیوی کو کسی چیز کے عوض چھوڑ دے اور اپنی زوجیت سے اس کو خارج کردے، یہ اصطلاحِ شرع میں خلع کہلاتا ہے۔

اسلام سہولت اور رحمت کا دین اور شفقت کا قانون ہے، کبھی بیوی اچھی نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے شوہر کی زندگی تکلیف سہنے کا مجموعہ بن جاتی ہے، تو اسلام نے شوہر کو بہتر طریقے سے طلاق دینے کا اختیار دیا ہے۔ کبھی شوہر اچھا نہیں ہوتا اور عورت اس کے مظالم کی چکی میں پستی رہتی ہے، تو اسلام نے اس عورت کو جان چھڑانے کے لئے رضاکارانہ طور پر خلع کرانے یعنی کچھ مقدار مال کے عوض طلاق لینے کا حق دیا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ طلاق میں شوہر آزاد ہے، بیوی کی مرضی پر طلاق موقوف نہیں ہے، لیکن خلع میں شوہر کی مرضی کو باقی رکھا گیا ہے؛ تاکہ گھریلو قیادت اور رجال کی سیادت مفلوج ہوکر نہ رہ جائے۔ ان سہولتوں کے باوجود اسلام نے ایذا رسانی اور فساد کی بنیاد پر طلاق دینے یا خلع لینے کی شدید مذمت کی ہے؛ تاکہ مجبوری کی ایک سہولت کے لئے کوئی شخص ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔

خلع کے باب میں چار الفاظ قریب المُستَعمَل ہیں:

(۱) خلع (۲) طلاق علی مال (۳) فدیہ (۴) مباراۃ۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں، علامہ ابن رشدؒ نے بدایۃ المجتہد میں اور علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں ان کے درمیان یہ فرق کیا ہے کہ کل مہر کو بدل مقرر کر لینا ''خلع'' ہے۔ جزء مہر کو بدل مقرر کر لینا ''فدیہ'' ہے۔ عورت کا شوہر کے ذمہ سے ہر ایسے حق کو ساقط کر دینا جو نکاح کے تعلق سے ہو ''مباراۃ'' ہے۔ اور مہر سے قطع نظر مال کی کوئی مقدار مقرر کر کے طلاق دینا طلاق علی المال ہے۔

خلع کا طریقہ

اگر میاں بیوی کے درمیان اختلاف اُٹھا ہے اور شوہر بیوی کو طلاق نہیں دیتا اور عورت اپنی جان چھڑانے کے لئے شوہر سے کہتی ہے کہ: تم اتنا روپیہ لے لو اور میری جان چھوڑ دو، یا مہر کا پیسہ اپنے پاس روک لو اور میری جان چھوڑ دو۔ شوہر جواب میں کہتا ہے کہ: ہاں! اس رقم کے عوض میں تیری جان چھوڑتا ہوں، یہ فدیہ نقد اور خلع ہے، اس میں شرط یہ ہے کہ طلاق کا لفظ استعمال نہ ہو، اگر طلاق کا لفظ استعمال ہو گیا تو طلاق بالمال کہلائے گی۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، أَنَّ مَوْلَاةً لِصَفِيَّةَ اخْتَلَعَتْ مِنْ زَوْجِهَا بِكُلِّ شَيْءٍ لَهَا، فَلَمْ يُنْكِرْهُ ابْنُ عُمَرَؓ.

ترجمہ: نافع کا بیان ہے کہ حضرت صفیہؓ کی آزاد کردہ باندی نے اپنی تمام اشیاء کے عوض اپنے خاوند سے خلع کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اسے ناپسند کیا۔

تشریح: صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ اگر زوجین آپس میں جھگڑا کرنے لگیں اور یہ محسوس کریں کہ اب حقوقِ زوجیت ادا نہیں کرسکیں گے، تو اس بارے میں کوئی حرج نہیں کہ عورت اپنی جان کا اپنے شوہر کو فدیہ دے دے اور شوہر اس مال کے بدلے اس کو بذریعہ خلع طلاق دے دے، خلع کرتے ہی طلاقِ بائنہ ہوجائے گی، الگ سے طلاق دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر ماہیت خلع میں علماء کا اختلاف ہے، یعنی خلع فسخ ہے، یا طلاق ہے؟

فقہائے کرام کا اختلاف

امام احمد اور امام شافعی کا مذہب: امام احمد بن حنبلؒ اور امام شافعیؒ کے مشہور قول کے مطابق خلع کرنے سے نکاح فسخ ہوجائے گا اور میاں بیوی کے درمیان جدائی ہوجائے گی۔

امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا مذہب: امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک خلع کے عمل سے عورت پر ایک طلاقِ بائن واقع ہوجائیگی۔ خلاصہ یہ ہے کہ امام احمد وشافعی کے نزدیک خلع فسخ نکاح ہے اور امام مالک وابوحنیفہ کے نزدیک طلاقِ بائن ہے۔

امام احمدؒ کی دلیل: ﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ...... إلٰی ...... فَإِنْ طَلَّقَهَا﴾ **الآية.** والی آیت ہے۔ طرزِ استدلال اس طرح ہے کہ آیت میں پہلے دو طلاق کا ذکر ہے اور پھر "فَإِنْ طَلَّقَهَا" سے تیسری اور آخری طلاق کو بیان کیا گیا ہے، اب اگر بیچ میں "فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ" کی فدیہ والی خلع کی صورت کو بھی طلاقِ واحد شمار کیا جائے تو اسلام میں تین کے بجائے طلاق چار ہوجائے گی اور یہ باطل ہے، لہٰذا خلع

کو طلاق میں شمار کرنا بھی باطل ہے۔

دوسری دلیل: حضرت ثابت بن قیسؓ کی بیوی کا قصہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عدت کو صرف ایک حیض قرار دیا "فَجعلَ عِدَّتَها حیضةً". ابوداؤد شریف کی اس روایت سے معلوم ہوا کہ خلع کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت کی بیوی کی عدت ایک حیض قرار دیا اور طلاق میں ایک حیض نہیں؛ بلکہ تین حیض عدت کے لیے ضروری ہیں۔ معلوم ہوا خلع طلاق نہیں؛ بلکہ فسخ نکاح ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

جوابات: پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہاں خلع الگ طلاق نہیں ہے؛ بلکہ قرآن نے ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ﴾ کی دو صورتیں بیان کی ہیں، ایک طلاق بلا عوض ہے جس کا ذکر ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ﴾ میں ہے اور ایک طلاق بالعوض ہے، جس کو خلع کہتے ہیں، یہ الگ طلاق کا ذکر نہیں؛ بلکہ ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ﴾ کے ضمن میں ایک قسم کی طلاق کا ذکر ہے۔ یہ دو طلاقیں ہوئیں اور ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا﴾ میں تیسری طلاق کو بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا جواب: جہاں حدیث میں "حیضة" کا لفظ آیا ہے تو یہ جنس کے لئے ہے، جو قلیل وکثیر پر بولی جاتی ہے، لہٰذا اس سے تین حیض کی نفی نہیں ہوتی۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ ایک حیض کا جو ذکر حدیث میں آیا ہے یہ وہ حیض ہے جس کے گذارنے کیلئے عورت سے کہا گیا ہے کہ وہ شوہر کے گھر میں کم از کم اس کو گذار لے، اس کے علاوہ دو حیض گذارنے کیلئے اپنے گھر جائے۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل: حنفیہ نے حضرت ثابت بن قیسؓ کی بیوی کے واقعہ سے استدلال کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابتؓ سے فرمایا:

"اقبلِ الحديقَةَ وطلِّقها تطليقةً" (کہ یہ باغ جو تیری بیوی نے دیا ہے اسے قبول کرو اور بیوی کو ایک طلاق دے دو)۔ (بخاری، ج:۲، ص:۷۹۴)

مذکورہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلع کو طلاق کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ اگر خلع فسخ نکاح ہوتا تو طلاق دینے کی ضرورت کیا تھی؟۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: مَا اخْتَلَعَتْ بِهِ الْمَرْأَةُ مِنْ زَوْجِهَا فَهُوَ جَائِزٌ فِي الْقَضَاءِ، وَمَا نُحِبُّ لَهُ أَنْ يَأْخُذَ أَكْثَرَ مِمَّا أَعْطَاهَا، وَإِنْ جَاءَ النُّشُوزُ مِنْ قِبَلِهَا، فَأَمَّا إِذَا جَاءَ النُّشُوزُ مِنْ قِبَلِهِ لَمْ نُحِبَّ لَهُ أَنْ يَأْخُذَ مِنْهَا قَلِيلًا وَلَا كَثِيرًا، وَإِنْ أَخَذَ فَهُوَ جَائِزٌ فِي الْقَضَاءِ، وَهُوَ مَكْرُوهٌ لَهُ فِيمَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ اللَّهِ تَعَالَى، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللَّهُ.

ترجمہ: امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ عورت جس مقدار مال کے عوض خلع کرلے جائز ہے، لیکن ہم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ جتنا مہر شوہر نے دیا ہے اس مقدار سے زائد بیوی سے خلع کے عوض وصول کرے، خواہ دونوں کے درمیان ناچاقی (نااتفاقی) عورت کی طرف سے ہوئی ہو۔ اور اگر اختلاف کا باعث مرد ہو تو، ہم کسی قسم کے مال وصول کرنے کو پسند نہیں کرتے، خواہ مال قلیل ہو یا کثیر، لیکن فتویٰ کے مطابق جائز ہے۔ ہاں! وہ اختلاف (جو مرد کی طرف سے ہوا) بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ناپسندیدہ ہے۔ اور یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ عورت اپنے شوہر سے جتنی بھی رقم دے کر خلع حاصل کرلے وہ قضاءً جائز ہوگا، چاہے وہ رقم شوہر کی طرف سے مہر میں دی گئی رقم سے کم ہو یا زیادہ۔ شوہر کے لئے

مہر میں دی گئی رقم سے زیادہ وصول کرنا مکروہ ہے۔

وَإِنْ جَاءَ النُّشُوزُ مِنْ قِبَلِهَا: اگر نافرمانی عورت کی طرف سے ہو تو، مقدارِ مہر تک لینا شوہر کے لئے بلا کراہت جائز ہے؛ مگر مقدارِ مہر سے زائد لینا مبسوط کی روایت کے مطابق مکروہ ہے۔ اور جامع صغیر کی روایت کے مطابق بلا کراہت جائز ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ مقدارِ مہر سے زیادہ اگر لے ہی لیا تو قضاءً جائز ہے، کیونکہ اللہ کا فرمان مطلقاً ہے: "فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ". یہ آیت اپنے اطلاق کی وجہ سے قلیل اور کثیر، مہر اور غیر مہر سب کو شامل ہے۔

إِذَا جَاءَ النُّشُوزُ مِنْ قِبَلِهٖ: اگر نافرمانی کا اظہار شوہر کی جانب سے ہو تو، شوہر کے لئے بدلِ خلع کے طور پر عورت سے کچھ لینا مکروہ ہے، کیونکہ ارشادِ باری ہے: ﴿وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَأْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا﴾ (اور اگر تم نے ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنے کا ارادہ کیا، حالانکہ تم نے ایک کو ڈھیر بھر دے رکھا ہے، تو تم اس میں سے کچھ مت لو)۔

اس آیت میں عورت سے عوض لینے کی کراہت پر صراحت ہے، اس لیے عوض لینا مکروہ ہوگا، لیکن اگر اس نے وہ رقم لی تو یہ قضاءً جائز ہوگی؛ تاہم اللہ اور اس شخص کے درمیان ایسا کرنا مکروہ ہوگا۔ اور یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔

(ب: ۲۲) بَابُ الْخُلْعِ كَمْ يَكُوْنُ مِنَ الطَّلَاقِ

خلع سے کتنی طلاقیں ہوتی ہیں؟

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جُمْهَانَ مَوْلَى الْأَسْلَمِيِّينَ، عَنْ أُمِّ بَكْرٍ الْأَسْلَمِيَّةِ، أَنَّهَا اخْتَلَعَتْ مِنْ زَوْجِهَا عَبْدِ

اللَّهِ بْنِ أَسِيدٍ، ثُمَّ أَتَيَا عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَؓ فِي ذَلِكَ، فَقَالَ: هِيَ تَطْلِيقَةٌ إلا أَنْ تَكُونَ سَمَّتْ شَيْئًا فَهُوَ عَلَى مَا سَمَّتْ.

ترجمہ: حضرت اُمّ بکر اسلمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنے شوہر عبداللہ بن اسدؓ سے خلع کیا، پھر وہ دونوں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے؛ تاکہ اس سلسلے میں دریافت کریں۔ حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا: ایسے ایک طلاق ہوگئی، مگر جب کہ عورت تعداد کا ذکر کرے تو اتنی ہی ہوں گی جتنی وہ ذکر کرے۔

تشریح: مذکورہ باب میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے اس کی تفصیل مع اختلافِ ائمہ کے باب نمبر:۲۱ میں گذر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

مزید تفصیل یہ ہے کہ خلع سے جو طلاق واقع ہوتی ہے وہ طلاقِ بائنہ ہوتی ہے، جس کا ثبوت کتب احادیث میں موجود ہے، لیکن کچھ حضرات اس سے واقع ہونے والی طلاق کو ''طلاقِ رجعی'' قرار دیتے ہیں، جس کی بناء پر فقہائے کرام نے ایک اصول ذکر فرمایا ہے: كُلُّ طلاقٍ أخذَ عليه جعل فهو بائنٌ، لا يملك الرجعَةَ". (کتاب الآثار، ص:۱۰۶) کہ ہر وہ طلاق جس کا کچھ معاوضہ لیا جائے وہ بائنہ ہوتی ہے اور اس میں رجوع کا اختیار نہیں رہتا۔

لہٰذا مذکورہ اصول کے پیش نظر خلع سے جو طلاق ہوتی ہے وہ طلاقِ بائنہ ہوتی ہے۔ ہاں! جب شوہر تین کا ذکر کردے تو پھر تین ہی طلاق واقع ہوں گی۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ، الْخُلْعُ تَطْلِيقَةٌ بَائِنَةٌ إِلا أَنْ يَكُونَ سَمَّى ثَلاثًا، أَوْ نَوَاهَا فَيَكُونُ ثَلاثًا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہمارا یہ عمل ہے کہ خلع ایک طلاقِ بائن ہے، لیکن اگر تین طلاقوں کا نام لیا، یا تین کی نیت کی تو تین ہی واقع ہوگی۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ خلع ایک طلاقِ بائنہ ہوتی ہے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے خلع کو ایک طلاقِ بائنہ قرار دیا ہے، لیکن اگر شوہر تین متعین کردے، یا تین کی نیت کرلے تو یہ خلع تین طلاق شمار ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ لفظ خلع طلاق کے الفاظِ کنائی میں سے ہے اور الفاظِ کنائی میں بولنے والے کی نیت کا لحاظ کیا جاتا ہے، اس لیے اس کی جو مراد ہوگی اسی کا اعتبار کیا جائے گا، جیسا کہ ''المبسوط'' میں یہ الفاظ ذکر کیے گئے ہیں: ''لأنّه بمنزلةِ ألفاظِ الكِناية'' کہ لفظ خلع الفاظِ کنایہ کی طرح ہے۔

(ب: ۲۳) بَابُ الرَّجُل يقُولُ إذا نكحت فُلانةَ فهِيَ طالقٌ

طلاق کو نکاح کے ساتھ معلق کرنے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخبَرَنَا مُجَبِّرٌ، عَنْ عَبْدِ اللّهِ بْنِ عُمَرَ، أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: إِذَا قَالَ الرَّجُلُ: إِذَا نَكَحْتُ، فُلَانَةً فَهِيَ طَالِقٌ، فَهِيَ طَالِقٌ، فَهِيَ كَذَلِكَ إِذَا نَكَحَهَا، وَإِذَا كَانَ طَلَّقَهَا وَاحِدَةً، أَوِ اثْنَتَيْنِ، أَوْ ثَلَاثًا فَهُوَ كَمَا قَالَ.

ترجمہ: مُجَبّرؒ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ جب کسی شخص نے کہا: جب میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو اسے طلاق، تو جب وہ شخص نکاح کرے گا تو طلاق واقع ہوجائے گی۔ اگر اس نے ایک کی نیت کی تو ایک، اگر دو کی نیت کی تو دو، اور اگر تین کی نیت کی تو تین

طلاقیں واقع ہوں گی۔

شرط کے ساتھ معلق کرنے کا بیان

تشریح: ایک تو صورت یہ ہے کہ نکاح سے پہلے ہی طلاق دے، تو اس سے طلاق نہیں ہوگی، مثلاً کوئی شخص غیر منکوحہ کو "انت طالق" کہے، تو اس پر طلاق واقع نہ ہوگی، خواہ بعد میں وہ عورت اس کی منکوحہ بن جائے، البتہ اگر طلاق کی نسبت ملک کی جانب کی گئی ہو، جیسے إنْ نکحتُكِ فأنتِ طالقٌ. تو اس کے بارے میں اختلاف ہے اور اس بارے میں تین مذاہب ہیں:

(۱) حنفیہ کے نزدیک نکاح کی شرط پر طلاق معلق کرنا درست ہے۔

(۲) شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک طلاق قبل النکاح معتبر نہیں ہے۔ وہ دلیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: لَا طلاقَ إلَّا بعدَ النِكاحِ، ولا عِتقَ قبلَ المِلكِ. یعنی طلاق صرف نکاح کے بعد ہے اور ملکیت سے قبل غلام یا لونڈی کو آزاد کرنا نہیں ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ج:۵، ص:۱۰۲) لہٰذا آپؐ کے ارشاد کے پیش نظر نکاح سے قبل طلاق اور ملک سے قبل عتاق لغو ہے، کیونکہ ابھی عورت نکاح میں آئی نہیں تو اس کو طلاق دینے کا معاملہ ہی غلط ہے، لہٰذا طلاق قبل النکاح معتبر نہیں ہے۔

(۳) مالکیہ کے نزدیک اس میں تفصیل ہے کہ اگر تعلیق میں عموم ہو، یعنی تعلیق ایسی ہو جس کے بعد کسی بھی عورت سے نکاح کا امکان ہی باقی نہ رہے، جیسے کُلَّما نَکحتُ امرَأةً فهيَ طالقٌ، تو ایسی تعلیق باطل ہے۔ ہاں! اگر کسی قسم کی تخصیص ہو مثلاً کسی خاص عورت کو خطاب کر کے کہے: إنْ نکحتُ

فلانةً، یا کسی شہر یا قبیلہ کا نام لے کر کہے: إنْ نکحتُ مِن بلدةِ کذا، أو مِن قبیلة کَذا کہ فلاں شہر یا قبیلہ کی عورت سے نکاح کروں تو اس کو طلاق ہے، یا زمانہ کے لحاظ سے تخصیص کرلے، مثلاً یوں کہے کہ: اگر آج نکاح کروں تو طلاق ہے، تو ایسی تعلیق درست ہوجاتی ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ.

ترجمہ: امام محمدؒ کہتے ہیں کہ ہمارا بھی یہی مسلک ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ کا بھی یہی قول ہے۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں کہ اگر مرد طلاق کو ہونے والے نکاح کے ساتھ تعلق کردے تو نکاح کے ہونے کے ساتھ ہی طلاق واقع ہوجائے گی۔ اور یہی حضرت امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ سُلَيْمٍ الزُّرَقِيِّ، عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ، أَنَّ رَجُلا سَأَلَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، فَقَالَ: إِنِّي قُلْتُ: إِنْ تَزَوَّجْتُ فُلانَـةً فَهِيَ عَلَيَّ كَظَهْـرِ أُمِّي، قَالَ: إِنْ تَزَوَّجْتَهَا فَلا تَقْرَبْهَا حَتَّى تُكَفِّرَ.

ترجمہ: قاسم بن محمد کا بیان ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر فاروقؓ سے سوال کیا کہ اگر میں کہوں: ''اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو وہ مجھ پر میری ماں کی طرح ہے''، تو اس کا کیا حکم ہے؟ آپؓ نے فرمایا: جب تم اس سے نکاح کرلو تو کفارہ ادا کرنے سے قبل اس کے قریب نہ جانا۔

ظہار کا بیان اور حکم

تشریح: اگر کسی مرد نے "إنْ تزوَّجتُ فلانةً فهيَّ عليَّ كَظَهرِ أمِّي" کہا، تو وہ مظاہر ہو گیا۔ اور ظہار کا حکم یہ ہے کہ اس کی وجہ سے مرد پر اپنی بیوی کے ساتھ جماع حرام ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ کفارہ ادا کر لے، پھر جب ظہار کی وجہ سے وطی کرنا حرام ہوا تو کیا وہ تمام چیزیں بھی حرام ہو جائیں گی جو صحبت پر اُبھارنے والی ہیں؟ اس میں اختلاف ہے، حنفیہ کے نزدیک دواعی الی الوطی، جیسے عورت کو چھونا، اس کا بوسہ لینا وغیرہ وغیرہ سب حرام ہیں؛ تاکہ یہ چیزیں اس کو وطی میں مبتلا نہ کردیں۔ یہی مذہب امام مالکؒ کا ہے۔ اور شافعی اور حنابلہ کی اس میں دونوں روایتیں ہیں، حرمت اور عدم حرمت۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ يَكُونُ مُظَاهِرًا مِنْهَا إِذَا تَزَوَّجَهَا فَلا يَقْرَبُهَا حَتَّى يُكَفِّرَ.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہمارا یہی مسلک ہے اور یہی امام ابوحنیفہؒ کا بھی قول ہے کہ جب وہ شخص فلاں عورت سے ظہار کرنے کے بعد نکاح کرے گا تو کفارہ ادا کرنے سے قبل اس کے قریب نہیں جائے گا۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم بھی ظہار کے واقع ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں۔ اور یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ اگر میں نے فلاں سے نکاح کیا تو وہ مجھ پر میرے ماں کی نسبت کی مانند ہے، تو ایسا شخص ظہار کرنے والا شمار ہوگا، لہٰذا اگر وہ اس سے نکاح کرے گا تو اس کے لیے اس سے جماع کرنا جائز نہیں ہوگا جب تک کہ کفارہ ادا نہ کردے۔

(ب:۲۴) بَابُ المَرء يُطلِّقُها زوجُها تطليقةً أو تطليقتين فتزوّج زوجًا، ثمَّ يتزوَّجُها الأوَّل

دو یا تین طلاقوں کے وقوع کے بعد دوسرے خاوند سے نکاح کے بعد پہلے خاوند سے نکاح کرنے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا الزُّهْرِيُّ، عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ، وَسَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّهُ اسْتَفْتَى عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فِي رَجُلٍ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ تَطْلِيقَةً أَوْ تَطْلِيقَتَيْنِ، وَتَرَكَهَا حَتَّى تَحِلَّ، ثُمَّ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ، فَيَمُوتَ أَوْ يُطَلِّقَهَا فَيَتَزَوَّجُهَا زَوْجُهَا الأَوَّلُ عَلَى كَمْ هِيَ؟ قَالَ عُمَرُ: هِيَ عَلَى مَا بَقِيَ مِنْ طَلَاقِهَا.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں یہ بات منقول ہے کہ انہوں نے حضرت عمر بن خطابؓ سے ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا جو اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دے کر چھوڑ دیتا ہے، یہاں تک کہ اس کی عدت ختم ہو جاتی ہے، پھر وہ عورت کسی دوسرے شخص کے ساتھ شادی کر لیتی ہے، پھر وہ دوسرا شخص فوت ہو جاتا ہے، یا اسے طلاق دیدیتا ہے تو کیا پہلے والا شوہر اس کے ساتھ دوبارہ شادی کر سکتا ہے؟ اگر (ہاں) تو پھر اسے کتنی طلاقوں کا حق حاصل ہوگا؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: جتنی طلاقیں باقی رہ گئی تھیں (صرف اُن کا حق حاصل ہوگا)۔

شوہر اوّل بعد میں کتنی طلاق کا مالک ہوگا؟

تشریح: مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی عورت اپنے خاوند سے طلاق لے کر

عدت گذار لیتی ہے اور پھر کسی اور شخص سے عقد کرنے کے بعد وہاں سے بھی فارغ ہو جاتی ہے اور فراغت کے بعد پھر پہلے خاوند کے ساتھ سلسلۂ زوجیت میں منسلک ہو جائے تو اب اس عورت کو موجودہ خاوند طلاق دینا چاہے تو اسے کتنی طلاقیں دینے کا اختیار ہے؟ اس کی چند صورتیں بنتی ہیں:

(۱) پہلے خاوند نے تین طلاقیں دے کر فارغ کیا تھا۔

(۲) پہلے خاوند نے ایک طلاق دی تھی۔

(۳) ہر ماہ ایک طلاق دے دیا کرتا تھا۔

(۴) صرف دو طلاقیں بیک وقت دیں، یا دو ماہ میں ایک ایک طلاق دی۔

ان مختلف صورتوں میں پہلی صورت میں تمام حضرات کا اتفاق ہے کہ جب مطلقہ عورت پہلے خاوند کے پاس آئے گی تو اب مستقل تین طلاقوں کی حقدار بن کر آئے گی۔ لیکن بقیہ صورتوں میں اختلاف ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر شوہر نے اپنی بیوی کو تین سے کم دو یا ایک طلاق دی اور وہ عورت عدت گذار کر دوسرے شوہر سے نکاح کرلے، پھر دوسرا شوہر بھی اس کو صحبت کے بعد طلاق دے دے اور عدت گذرنے کے بعد پہلا شوہر پھر اس سے نکاح کرلے، تو اس صورت میں امام محمدؒ، امام شافعیؒ کے نزدیک پہلا شوہر اس کو مابقیہ دو، یا ایک طلاق دینے کا حقدار ہوگا۔ دو طلاق دے دینے کے بعد عورت مغلظہ ہو جائے گی۔ اور شیخین کے نزدیک پہلا شوہر تین طلاق دینے کا حقدار ہوگا۔ اور پہلے جو ایک یا دو طلاق دے چکا ہے وہ بیکار ہو جائیں گی، ان کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، کیوں کہ دوسرا شوہر اس عورت کو پہلے شوہر کے لیے حل جدید کے ساتھ حلال کرنے والا ہوگا اور اس سے پہلے کی تمام طلاقیں کالعدم اور ختم ہو جائیں گی، شیخین کا مذہب ہی راجح ہے۔ (نور الانوار، ص: ۲۰)

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، فَأَمَّا أَبُو حَنِيفَةَ، فَقَالَ: إِذَا عَادَتْ إِلَى الْأَوَّلِ بَعْدَ مَا دَخَلَ بِهَا الْآخَرُ عَادَتْ عَلَى طَلَاقٍ جَدِيدٍ ثَلَاثِ تَطْلِيقَاتٍ مُسْتَقْبَلَاتٍ، وَفِي أَصْلِ ابْنِ الصَّوَّافِ، وَهُوَ قَوْلُ ابْنِ عَبَّاسٍ وَابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمْ.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اسی پر ہمارا عمل ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی عورت دوسرے خاوند سے ہم بستری کر لینے کے بعد فارغ ہو کر پہلے خاوند کے عقد میں آجاتی ہے تو وہ طلاقِ جدید کے ساتھ آتی ہے، یعنی تین مستقل طلاقوں کی وہ حقدار بن کر آتی ہے۔ ابن صواف کی ''اصل'' میں ہے کہ یہی حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں، جب کہ امام ابوحنیفہؒ اس بات کے قائل ہیں کہ جب وہ عورت دوسرے شوہر سے صحبت کرنے کے بعد پہلے شوہر کے نکاح میں دوبارہ آئے گی تو پہلے شوہر کو ازسرنو تین طلاقوں کا حق حاصل ہوگا۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ابن صواف نے کتاب الاصل میں یہ بات تحریر کی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرؓ کا بھی یہی مذہب ہے۔

(ب:۲۵) بَابُ الرَّجُلِ يَجْعَلُ أَمْرَ امْرَأَتِهِ بِيَدِهَا أَوْ غَيْرِهَا

شوہر کا اپنی بیوی یا دوسرے شخص کو طلاق کا اختیار دینے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا سَعِيدُ بْنُ سُلَيْمَانَ بْنِ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ، عَنْ

خَارِجَةَ بْنِ زَيْدٍ، عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ، أَنَّهُ كَانَ جَالِسًا عِنْدَهُ، فَأَتَاهُ بَعْضُ بَنِي أَبِي عَتِيقٍ وَعَيْنَاهُ تَدْمَعَانِ، فَقَالَ لَهُ: مَا شَأْنُكَ؟، فَقَالَ: مَلَّكْتُ امْرَأَتِي أَمْرَهَا بِيَدِهَا فَفَارَقَتْنِي، فَقَالَ لَهُ: مَا حَمَلَكَ عَلَى ذَلِكَ؟، قَالَ: الْقَدَرُ، قَالَ لَهُ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ: اِرْتَجِعْهَا إِنْ شِئْتَ، فَإِنَّمَا هِيَ وَاحِدَةٌ وَأَنْتَ أَمْلَكُ بِهَا.

ترجمہ: خارجہ بن زید بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اسی دوران بنو عتیق سے تعلق رکھنے والا ایک شخص ان کے پاس آیا، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ حضرت زید نے اس سے دریافت کیا: تمہارا کیا معاملہ ہے؟ وہ بولا: میں نے اپنی بیوی کا معاملہ اس کے سپرد کر دیا، تو اس نے مجھ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ حضرت زید نے اس سے فرمایا: تم اگر چاہو تو اس عورت سے رجوع کر سکتے ہو، کیونکہ ابھی صرف ایک طلاق ہوئی ہے اور تم اس سے زیادہ کے مالک ہو۔

طلاق کا اختیار سپرد کرنا کیسا ہے؟

تشریح: صاحب کتاب فرما رہے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق کا اختیار سپرد کرتا ہے، تو سپرد کرنا کیسا ہے؟ اور عورت اگر اس کو اپنے اوپر لازم کر لے تو کتنی طلاق واقع ہوگی؟ اس سلسلے میں مختلف آثار منقول ہیں، جن کا تذکرہ ہم آنے والی سطروں میں کریں گے۔

اگر مرد نے اپنی بیوی کو یہ اختیار دیا اور عورت نے اسے استعمال کیا، تو احناف کے یہاں از روئے شرع اس سے ایک طلاقِ بائنہ ہو جائے گی۔ یہی حضرت علی

مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں اس سے ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگی۔ حضرت زید بن ثابتؓ اس طریقہ سے تین طلاق واقع ہونے کے قائل ہیں۔ زید بن ثابتؓ نے اس لفظ کو اس معنی پر محمول فرمایا کہ عورت جو کچھ چاہے نیت کر سکتی ہے۔ لیکن ہم احناف نے اس لفظ کو حضرت علی مرتضیٰ کے قول کے مطابق لیا ہے، کیونکہ عورت کا اپنے آپ کو اختیار کرنا اس وقت متحقق ہوتا ہے جب خاوند کی ملکیت اس سے زائل ہو جائے اور وہ خود اپنے نفس کی مالک بن جائے۔ اور ایسی حالت طلاقِ بائنہ چاہتی ہے، لہٰذا یہی مراد ہوگی۔

ان تمام تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر مرد اپنا اختیارِ طلاق اپنی بیوی کے سپرد کر دیتا ہے تو یہ سپردگی درست ہے۔ اب ہم موطا امام محمد کی روایات (آثار) کے متعلق مختصر انداز میں ذکر کریں گے:

باب کی پہلی روایت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پوتے محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا واقعہ ذکر فرمایا ہے، جس میں خاوند نے اپنی بیوی کو اس کے معاملے کا مالک بنا دیا تھا، پھر اس کی بیوی نے علیحدگی اختیار کر لی، چنانچہ بیوی کی جدائی سے غمگین ہو کر جناب محمد بن عبدالرحمٰنؓ حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس حاضر ہوئے، انہوں نے اس صورت میں فرمایا کہ: طلاقِ رجعی ہوئی ہے، تم اسے واپس لا سکتے ہو۔

تو معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت زید بن ثابتؓ کا یہ فیصلہ دراصل حضرت عمر اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی پیروی میں ہے۔ ہم احناف ان کے قول کے بجائے حضرت علیؓ کے قول پر عمل کرتے ہیں۔ آپ کا صورتِ مذکورہ میں فتویٰ ''طلاقِ بائنہ'' کا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس روایت کے آخر میں امام محمدؒ نے اپنا مسلک یوں بیان کیا کہ: زوج جو نیت کرے گا وہی ہوگا۔ اگر شوہر نے ایک طلاق

کی نیت کی تھی، تو لفظ کنایہ ہونے کی وجہ سے ایک بائنہ طلاق ہوگی۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: هَذَا عِنْدَنَا عَلَى مَا نَوَى الزَّوْجُ فَإِنْ نَوَى وَاحِدَةً فَوَاحِدَةٌ بَائِنَةٌ، وَهُوَ خَاطِبٌ مِنَ الْخُطَّابِ، وَإِنْ نَوَى ثَلاثًا فَثَلاثٌ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا , وَقَالَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ، وَعَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا: الْقَضَاءُ مَا قَضَتْ.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں ہمارے نزدیک یہاں شوہر کی نیت کا اعتبار ہوگا۔ اگر اس نے ایک کی نیت کی ہوگی، تو ایک بائنہ طلاق ہوگی۔ اور پھر اس کے بعد وہ شخص دیگر لوگوں کی طرح نکاح کا پیغام بھیج سکتا ہے۔ لیکن اگر اس نے تین طلاقوں کی نیت کی ہو، تو تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ اس بات کے قائل ہیں کہ اس صورت میں عورت کے فیصلے کا اعتبار کیا جائے گا۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ امام محمدؒ کے نزدیک شوہر کی نیت کا اعتبار ہوگا، اگر اس نے ایک کی نیت کی ہوگی تو ایک طلاقِ بائنہ واقع ہو جائے گی اور اس کے بعد وہ شخص دیگر لوگوں کی طرح اس مطلقہ کو نکاح کا پیغام بھیج سکتا ہے۔ اور اگر اس نے تین طلاقوں کی نیت کی ہو، تو تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ امام ابو حنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔ حضرت عثمان حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: اس صورت میں عورت کے فیصلے کا اعتبار کیا جائے گا۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ الْقَاسِمِ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، " أَنَّهَا خَطَبَتْ عَلَى عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي

بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قُرَيْبَةَ بِنْتِ أَبِي أُمَيَّةَ، فَزَوَّجَتْهُ ثُمَّ إِنَّهُمْ عَتَبُوا عَلَى عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ، وَقَالُوا: مَا زَوَّجْنَا إِلا عَائِشَةَ، فَأَرْسَلَتْ إِلَى عَبْدِ الرَّحْمَنِ فَذَكَرَتْ لَهُ ذَلِكَ، فَجَعَلَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ أَمْرَ قُرَيْبَةَ بِيَدِهَا، فَاخْتَارَتْهُ، وَقَالَتْ: مَا كُنْتُ لِأَخْتَارَ عَلَيْكَ أَحَدًا، فَقَرَّتْ تَحْتَهُ، فَلَمْ يَكُنْ ذَلِكَ طَلاقًا.

ترجمه: سیدہ عائشہ صدیقہؓ کے بارے میں یہ بات منقول ہے کہ انہوں نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ کے لئے قُرَیْبَہ بنت ابوامیہ کا رشتہ مانگا، تو قریبہ کی ان کے ساتھ شادی ہوگئی۔ پھر اُن کے رشتہ دار عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ سے ناراض ہوگئے اور بولے ہم نے تو سیدہ عائشہؓ کے کہنے پر شادی کی تھی، تو سیدہ عائشہؓ نے عبدالرحمٰن کو پیغام بھیجا اور ان کے سامنے اس بات کا تذکرہ کیا تو عبدالرحمٰن نے ''قریبہ'' کا معاملہ ان کے اختیار میں دے دیا۔ ''قریبہ'' نے عبدالرحمٰن کو اختیار کیا اور بولی: مجھے آپ کے علاوہ کسی اور کو اختیار نہیں کرنا۔ تو سیدہ عائشہؓ نے قریبہ کو عبدالرحمٰن کی بیوی رہنے دیا۔ اور یہ چیز طلاق شمار نہیں ہوئی۔

تشریح: اس روایت میں صرف اختیار سپرد کرنے کا معاملہ ہے، یعنی خاوند اپنی بیوی کو طلاق کا اختیار دے سکتا ہے، جیسا کی سیدہ عائشہؓ نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن کو کہا کہ تمہاری بیوی ''قریبہ'' کے ورثاء چونکہ ناراض ہوگئے ہیں، لہٰذا تو ''قریبہ'' کو اختیار دے دے۔ آپ نے اسے اختیار دے دیا۔ اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے ''قریبہ'' نے جدائی کے بجائے اسی عقد کو برقرار رکھنے کا اظہار کیا۔

اس روایت سے صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ، مرد اگر بیوی کو اختیار سپرد کرتا

ہے تو اس کا ایسا کرنا درست ہے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ الْقَاسِمِ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ، أَنَّهَا زَوَّجَتْ حَفْصَةَ بِنْتَ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ الْمُنْذِرِ بْنِ الزُّبَيْرِ، وَعَبْدُ الرَّحْمَنِ غَائِبٌ بِالشَّامِ، فَلَمَّا قَدِمَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ، قَالَ: وَمِثْلِي يُصْنَعُ بِهِ هَذَا، وَيُفْتَاتُ عَلَيْهِ بِبَنَاتِهِ؟ فَكَلَّمَتْ عَائِشَةُ الْمُنْذِرَ بْنَ الزُّبَيْرِ، فَقَالَ: فَإِنَّ ذَلِكَ فِي يَدِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، فَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ: مَا لِي رَغْبَةٌ عَنْهُ وَلَكِنَّ مِثْلِي لَيْسَ يُفْتَاتُ عَلَيْهِ بِبَنَاتِهِ، وَمَا كُنْتُ لأَرُدَّ أَمْرًا قَضَيْتِهِ، فَقَرَّت امْرَأَتُهُ تَحْتَهُ وَلَمْ يَكُنْ ذَلِكَ طَلاقًا.

ترجمہ: سیدہ عائشہؓ کے بارے میں یہ بات منقول ہے کہ انہوں نے حفصہ بنت عبدالرحمٰنؓ کی شادی منذر بن زبیر سے کردی۔ عبدالرحمٰن بن ابوبکر آئے تو بولے: میرے جیسے شخص کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا کہ اپنی بیٹیوں کے معاملے میں اُسے نظر انداز کردیا گیا ہے۔ تو سیدہ عائشہؓ نے اس حوالے سے منذر بن زبیر کے ساتھ بات کی، تو وہ بولے اب اس معاملے کا اختیار عبدالرحمٰن کو ہے۔ تو حضرت عبدالرحمٰنؓ بولے: مجھے منذر سے کوئی اختلاف نہیں ہے؛ لیکن میرے جیسے شخص کو اس کی بیٹیوں کے معاملے میں نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔

بہرحال آپ نے جو فیصلہ کیا تھا میں اس کو کالعدم قرار نہیں دیتا۔ تو سیدہ عائشہؓ نے منذر کی بیوی کو اس کی بیوی رہنے دیا۔ اور یہ چیز (یعنی دوسرے شخص کو طلاق کا اختیار دینا) طلاق شمار نہیں ہوئی۔

تشریح: اس روایت میں بھی اختیار سپرد کرنے اور واپس لینے کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔ جب اُمّ المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنی بھتیجی کی شادی ان کے والد عبدالرحمٰن کی عدمِ موجودگی میں منذر نامی شخص سے کردی۔ جب عبدالرحمٰنؓ واپس آئے اور انہیں اس شادی کا پتہ چلا تو ناراض ہوئے۔ جس پر سیدہ عائشہؓ نے منذر کو بلا کر فرمایا کہ: تو اپنی بیوی حفصہ کو اختیار دے دے۔ بہر حال اختیار واپس ہوا اور طلاق نہ ہوئی۔

جس سے معلوم ہوا کہ اختیار سپرد کرنا درست ہے، اس کا انکار درست نہیں ہے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: إِذَا مَلَّكَ الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ أَمْرَهَا فَالْقَضَاءُ مَا قَضَتْ إِلا أَنْ يُنْكِرَ عَلَيْهَا، فَيَقُولُ: لَمْ أُرِدْ إِلا تَطْلِيقَةً وَاحِدَةً فَيُحلَفُ عَلَى ذَلِكَ، وَيَكُونُ أَمْلَكَ بِهَا فِي عِدَّتِهَا.

ترجمہ: نافعؒ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں کہ: جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اس کے معاملے کا مالک بنا دیتا ہے تو فیصلہ عورت کے بیان کے مطابق ہوگا؛ البتہ اگر مرد عورت کا انکار کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ: میں نے صرف ایک طلاق مراد لی تھی، تو اس بارے میں اس سے حلف لیا جائے گا۔ اور وہ عورت کی عدت کے دوران اس سے رجوع کرنے کا مالک ہوگا۔

اختیار کے مسئلہ میں کس کا قول مانا جائے گا؟

تشریح: اس روایت میں مذکورہ مسئلہ کا ایک اور پہلو بیان ہوا ہے کہ اختیار کے معاملے میں عورت کا قول معتبر ہوگا۔ یہ قول حضرت ابن عمرؓ کا ہے۔ یہ اس

صورت میں ہے کہ اگر مرد کہے کہ میں نے اس کی نیت نہیں کی، تو پھر زوج کی بات قسم کے ساتھ تسلیم کر لی جائے گی۔ اور وہ عورت کی عدت کے دوران اس سے رجوع کرنے کا مالک ہوگا۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، أَنَّهُ قَالَ: إِذَا مَلَّكَ الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ أَمْرَهَا فَلَمْ تُفَارِقْهُ وَقَرَّتْ عِنْدَهُ فَلَيْسَ ذَلِكَ بِطَلَاقٍ.

ترجمہ: سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں کہ: جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اس کے معاملے کا مالک بنا دے اور وہ عورت اس سے علیحدگی اختیار نہ کرے؛ بلکہ اس کے پاس ہی رہے، تو یہ چیز طلاق شمار نہیں ہوگی۔

تشریح: اس آخری روایت میں اختیار سپرد کرنے کے بعد اسی مجلس میں عورت اختیار استعمال نہیں کرتی، خاموش بیٹھی رہتی ہے، اس صورت میں بھی طلاق نہ ہوگی، کیونکہ عورت نے طلاق کا اختیار کیا ہی نہیں، بغیر اختیار کئے طلاق کیوں کر ہوسکتی ہے؟

دراصل اس صورت میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ اختیار سپرد کرنے سے ہی طلاق ہو جائے گی؛ خواہ عورت استعمال بھی نہ کرے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں ارشاد فرمایا کہ: عورت نے جب اپنے نفس کو اختیار کیا ہی نہیں تو طلاق واقع نہ ہوگی۔

تفویض طلاق کا خلاصہ

(۱) مرد اگر بیوی کو ''اختیار'' دے دیتا ہے اور لفظ ''طلاق'' ساتھ نہیں بولتا، اور سپرد

کرتے وقت نیت طلاق بھی تھی، تو ایک بائنہ طلاق واقع ہوگی۔ اب اگر مرد اس عورت کو رکھنا چاہتا ہے تو نکاح کرکے رکھے گا۔

(۲) اختیار کے ساتھ اگر لفظ "طلاق" بھی ذکر کردیا گیا، تو اس سے طلاقِ رجعی واقع ہوگی۔ اور اگر اس صورت میں مرد نے تین طلاقوں کی نیت بصورت آزاد عورت کی تو تین ہی طلاق واقع ہوجائیں گی۔

(۳) اختیار مجلس تک محدود رہے۔

(۴) اختیار کے یوں استعمال کرنے سے کہ: "میں خاوند کے پاس رہنا چاہتی ہوں" قطعاً طلاق نہ ہوگی۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، إِذَا اخْتَارَتْ زَوْجَهَا فَلَيْسَ ذٰلِكَ بِطَلَاقٍ وَإِنِ اخْتَارَتْ نَفْسَهَا فَهُوَ عَلَى مَا نَوَى الزَّوْجُ، فَإِنْ نَوَى وَاحِدَةً فَهِيَ وَاحِدَةٌ بَائِنَةٌ، وَإِنْ نَوَى ثَلَاثًا فَثَلَاثٌ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ (رَحِمَهُ اللّٰهُ تعالٰى) وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ: اسی پر ہمارا عمل ہے کہ جب عورت اپنے شوہر کو اختیار کرلے تو یہ چیز طلاق شمار نہیں ہوگی؛ لیکن اگر وہ عورت اپنی ذات کو اختیار کرلے تو شوہر نے جو نیت کی تھی اس کے مطابق حکم ہوگا۔ اگر شوہر نے ایک طلاق کی نیت کی تھی تو ایک بائنہ طلاق ہوگی۔ اگر تین کی نیت کی تھی تو تین طلاقیں واقع ہوں گی۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اگر عورت اپنے شوہر کے ساتھ رہنے کو اختیار کرے تو طلاق نہیں ہوگی۔ اور اگر اس سے جدائیگی کو اختیار

کرے تو یہ شوہر کی نیت کے لحاظ سے ایک یا تین ہوں گی۔ اگر اس نے ایک طلاق کی نیت کی تھی تو ایک طلاقِ بائنہ شمار ہوگی۔ اور اگر تین طلاق کی نیت کی تھی، تو تین شمار ہوگی۔ یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء کا قول ہے۔

……☆☆☆……

(ب:۲۶) بَابُ الرَّجُلِ يَكُونُ تحتَه أَمَةٌ فَيُطلِّقُهَا ثُمَّ يَشتَرِيهَا

بیوی باندی ہونے کی صورت میں خاوند کا اسے طلاق دینے اور پھر خرید لینے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا الزُّهْرِيُّ، عَنْ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمَنِ، عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ، أَنَّهُ سُئِلَ عَنْ رَجُلٍ كَانَتْ تَحْتَهُ وَلِيدَةٌ، فَأَبَتَّ طَلَاقَهَا، ثُمَّ اشْتَرَاهَا، أَيَحِلُّ أَنْ يَمَسَّهَا؟ فَقَالَ: لَا يَحِلُّ لَهُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ.

ترجمہ: حضرت زید بن ثابتؓ کے بارے میں یہ بات منقول ہے کہ: اُن سے ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ، جس کی بیوی ایک باندی تھی، اس نے بیوی کو ''طلاقِ بتہ'' دے دی، پھر بعد میں اس بیوی کو خرید لیا، تو کیا اب یہ بات اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس عورت کے ساتھ صحبت کرے؟ انہوں نے فرمایا: اس شخص کے لیے اس عورت کے ساتھ صحبت کرنا اس وقت تک جائز نہیں ہوگا، جب تک وہ عورت دوسرے شخص کے ساتھ شادی کرنے کے بعد (طلاق نہیں لے لیتی، یا بیوہ نہیں ہو جاتی)۔

تشریح: باندی سے نکاح کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ یہ باندی

اپنے خاوند کی مملوکہ نہ تھی؛ بلکہ کسی اور کی تھی اور اس نکاح کرنے والے کی بیوی ہے، کیونکہ باندی ہو تو اس کے ساتھ وطی نکاح کیے بغیر بھی کرنا جائز ہے۔ دوسرے کی باندی اور اپنی بیوی کو اگر مرد طلاق دے کر بالکل فارغ کر دیتا ہے، ایسا کہ رجوع کا کوئی طریقہ باقی نہ رہے، پھر اسی باندی کو اس کا خاوند اس کے مولیٰ سے خرید لیتا ہے، اب یہ اس کی بیوی نہیں؛ بلکہ مملوکہ باندی بن گئی۔

اس صورت میں وہم پڑ سکتا ہے کہ اب یہی مرد اپنی اس باندی کے ساتھ عام باندیوں کی طرح وطی کرے تو کوئی حرج نہیں۔ اس وہم کے پیش نظر مسئلہ مذکورہ کی صراحت حضرت زید بن ثابتؓ نے فرمائی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مرد نے جب اس لونڈی کو بیوی کی صورت میں طلاق دے کر بالکل فارغ کر دیا تھا، اور جس عورت کو مرد بالکل فارغ کر دے اس سے اگر دوبارہ تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے، تو قرآنِ کریم کے حکم "حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ" کے مطابق پہلے وہ کسی اور مرد سے نکاح کرے، پھر وہاں سے فارغ ہو کر اس پہلے خاوند کے لئے حلال ہو سکتی ہے۔

"حلالہ" کے بغیر وہ حرمت جو مکمل طلاق کی صورت میں تھی، ختم نہیں ہوگی؛ بلکہ یہ بدستور قائم رہے گی۔ قرآنِ کریم نے اس بارے میں باندی یا آزاد عورت کے مابین فرق نہیں کیا، لہٰذا اب مولیٰ بن جانے کی صورت میں اس مرد کو اپنی مطلقہ بیوی سے، جو اَب اس کی باندی بن چکی ہے وطی کرنا حلال نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور دیگر احناف کا مسلک قرآنِ کریم کی مذکورہ آیت کے عین مطابق ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق ہم فتویٰ دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے نکاح میں کوئی باندی تھی اور اس کو طلاقِ مغلظہ یعنی تین طلاقیں دیدی، پھر اس کو خریدا تو اس باندی سے اس کے لیے صحبت کرنا جائز نہیں ہوگا، جب تک وہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح کے بعد مطلقہ یا بیوہ نہ ہو جائے۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

(ب:٢٧) بَابُ الأَمَةِ تَكُونُ تَحتَ العَبدِ فتُعتَقُ

غلام کی منکوحہ باندی کو آزادی مل جانے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، أَنَّهُ كَانَ " يَقُولُ فِي الأَمَةِ تَحْتَ الْعَبْدِ فَتُعْتَقُ: أَنَّ الْخِيَارَ لَهَا مَا لَمْ يَمَسَّهَا.

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا ابْنُ شِهَابٍ، عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ، أَنَّ زَبْرَاءَ مَوْلَاةً لِبَنِي عَدِيِّ بْنِ كَعْبٍ أَخْبَرَتْهُ، أَنَّهَا كَانَتْ تَحْتَ عَبْدٍ، وَكَانَتْ أَمَةً فَأُعْتِقَتْ، فَأَرْسَلَتْ إِلَيْهَا حَفْصَةُ، وَقَالَتْ: إِنِّي مُخْبِرَتُكِ خَبَرًا، وَمَا أُحِبُّ أَنْ تَصْنَعِي شَيْئًا، إِنَّ أَمْرَكِ بِيَدِكِ مَا لَمْ يَمَسَّكِ، فَإِذَا مَسَّكِ فَلَيْسَ لَكِ مِنْ أَمْرِكِ شَيْءٌ، قَالَتْ: وَفَارَقْتُهُ.

ترجمہ: نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایسی باندی کے بارے میں جو کسی غلام کی بیوی ہو، یہ فرماتے ہیں کہ: اگر وہ آزاد ہو جائے، تو اس عورت کو اختیار ہوگا، جب تک کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ صحبت نہیں کرتا۔

عروہ بن زبیرؓ بیان کرتے ہیں: بنوعدی بن کعب کی کنیز "زہرہ" نے یہ

بات انہیں بتائی ہے کہ وہ ایک غلام کی بیوی تھی، اور پہلے کنیز تھی، پھر اسے آزاد کردیا گیا، تو سیدہ حفصہؓ نے اسے پیغام بھیجا اور بولیں: میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتی ہوں، ویسے میری خواہش یہ نہیں ہے کہ تم کچھ کرو (لیکن شرعی مسئلہ یہ ہے) کہ تمہارا معاملہ تمہارے اختیار میں ہے، جب تک تمہارا شوہر تمہارے ساتھ صحبت نہیں کرتا، جب وہ تمہارے ساتھ صحبت کرلے گا، تو پھر تمہارا یہ اختیار ختم ہو جائے گا۔ وہ خاتون بیان کرتی ہیں کہ: میں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔

تشریح: مذکورہ آثار میں دو مسئلے ایسے مذکور ہیں جن میں احناف اور دوسرے ائمہ کا اختلاف ہے:

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ جب کسی باندی کو آزادی ملتی ہے اور وہ کسی کے عقد زوجیت میں ہو، تو اسے موجودہ نکاح کے باقی رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار ہے۔ لیکن یہ اختیار کیا خاوند کے غلام یا آزاد ہونے کی صورت میں دونوں وقت موجود ہے، یا صرف اس وقت جب کہ خاوند غلام ہو؟

احناف کے نزدیک دونوں صورتوں میں آزاد ہونے والی باندی کو اختیار ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ: اگر صورتِ مذکورہ میں آزاد شدہ باندی کو جو اختیار ملتا ہے تو وہ اختیار طلاق ہے یا نہیں؟

ہم احناف کا مسلک یہ ہے کہ یہ اختیار "طلاق" نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ اختیار طلاق ہوتا، تو پھر اس کے بعد اختیار کا کوئی معنیٰ نہیں بنتا، جب کہ مسلک احناف کی تائید میں طحاوی شریف میں یہ بات مذکور ہے کہ: جب حضرت بریرہؓ کو آزادی ملی تو ان کا خاوند آزاد تھا۔ (مزید تفصیل کے لیے طحاوی شریف، ج:۳، ص:۸۲)

چونکہ اس باب کا اہم اختلافی مسئلہ بھی یہی ہے کہ جب باندی کو آزادی ملے اور اس کا خاوند بھی آزاد ہو، تو کیا اب آزاد ہونے والی باندی کو آزادی سے قبل کا نکاح باقی رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار ہے؟ ہم احناف اسی کے قائل ہیں۔ اور شافعی اور کچھ دیگر حضرات اس صورت میں اختیار دینے کے قائل نہیں ہیں۔ اور اس اختلاف کی اصل وجہ حضرت بریرہؓ کی آزادی کے وقت ان کے خاوند حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کی حیثیت کے بارے میں روایات مختلف ہیں، بعض میں مذکور ہے کہ وہ اس وقت آزاد تھے۔ اور کچھ ان کی غلامی کی نشاندہی کرتے ہیں۔

علامہ عینیؒ ''عمدۃ القاری'' میں اس بحث کے تحت لکھتے ہیں کہ:

ایک گروہ نے استدلال کیا کہ حضرت مغیثؓ اس وقت آزاد تھے، جب ان کی بیوی حضرت بریرہؓ کو آزادی ملی۔ ان کا استدلال وہ حدیث ہے جسے امام ترمذیؒ نے بیان کیا اور اسے ''حَسَنٌ صَحِيحٌ'' فرمایا۔ امام ترمذیؒ نے حدیث مذکور ''أبوابُ الرضاع'' میں ''وہ باندی کہ جس کا خاوند ہو اور وہ آزاد کر دی جائے'' کے تحت ذکر فرمائی ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں، آپ فرماتی ہیں کہ: حضرت بریرہؓ کا خاوند اس وقت آزاد تھا جب خود بریرہؓ کو آزاد کر دیا گیا اور انہیں آزادی ملنے پر اختیار دیا گیا۔ ابن ماجہ نے بھی ''بَابُ الطَّلاق'' میں انہیں آزاد ہی بتایا ہے۔

اور تمام علماء کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ حریت غلامی کے بعد آتی ہے، اس کا الٹ نہیں، یعنی حریت اور آزادی پہلے ہو اور رِقیت اور غلامی بعد میں آئے۔ اور ہم احناف نے جو طریقہ اور مسلک اپنایا ہے، اس نے غلامی کو پہلے اور آزادی کو بعد میں رکھا، لہٰذا اس طریقہ سے ثابت ہوا کہ حضرت مغیثؓ اس وقت آزاد تھے، جب

ان کی بیوی کو اختیار دیا گیا۔ اور اختیار سے قبل کی زندگی ان کی غلامی کی زندگی تھی۔

(عمدۃ القاری، ج:۲۰،ص:۲٦٧، بَابُ خِيَارِ الأَمَةِ)

قَالَ مُحَمَّدٌ: إِذَا عَلِمَتْ أَنَّ لَهَا خِيَارًا، فَأَمْرُهَا بِيَدِهَا مَا دَامَتْ فِي مَجْلِسِهَا مَا لَمْ تَقُمْ مِنْهُ، أَوْ تَأْخُذْ فِي عَمَلٍ آخَرَ، أَوْ يَمَسَّهَا، فَإِذَا كَانَ شَيْءٌ مِنْ هَذَا بَطَلَ خِيَارُهَا، فَأَمَّا إِنْ مَسَّهَا وَلَمْ تَعْلَمْ بِالْعِتْقِ، أَوْ عَلِمَتْ بِهِ وَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ لَهَا الْخِيَارَ فَإِنَّ ذَالِكَ لا يُبْطِلُ خِيَارَهَا، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ جب باندی کو اس بات کا پتہ چلے کہ اسے اس بات کا اختیار حاصل ہے، تو جب تک وہ اس محفل میں بیٹھی ہوئی ہے اور وہاں سے کھڑی نہیں ہوتی، یا کسی اور کام میں مشغول نہیں ہو جاتی، یا اس کا شوہر اس کے ساتھ صحبت نہیں کر لیتا، تو اس وقت تک اس کنیز کا اختیار اس کے پاس رہے گا۔ لیکن جب وہ ان میں سے کسی کام کا ارتکاب کر لیتی ہے تو اس کا اختیار ختم ہو جائے گا۔ لیکن اگر اس کنیز کا شوہر اس کے ساتھ صحبت کر لیتا ہے اور کنیز کو اپنے آزاد ہونے کا پتہ نہیں چلتا، یا اپنے آزاد ہونے کا پتہ چلتا ہے؛ لیکن اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ اسے اختیار بھی حاصل ہو گیا، تو یہ چیز اس کے اختیار کو ختم نہیں کرے گی۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ وہ باندی جو غلام کی زوجیت میں تھیں اور آزاد ہو جائے، تو اسے اس بات کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ سابقہ نکاح کو باقی رکھتے ہوئے غلام کی زوجیت میں رہے، یا فسخ کر کے اس کی زوجیت سے نکل جائے، لہٰذا باندی کو جب اس بات کا پتہ چلے

کہ اسے یہ اختیار حاصل ہے، تو جب تک وہ محفل میں یا مجلس میں بیٹھی ہوئی ہے اور وہاں سے کھڑی نہیں ہوتی، یا کسی اور کام میں نہیں لگ جاتی، یا اس کا شوہر اسکے ساتھ صحبت نہیں کر لیتا، اس وقت تک اس کنیز کا اختیار اس کے پاس رہے گا۔ لیکن جب وہ ان میں سے کسی ایک کام کا ارتکاب کر لے گی، تو اس کا اختیار ختم ہو جائے گا۔

لیکن اگر اس کنیز کا شوہر اس کے ساتھ صحبت کر لیتا ہے اور کنیز کو اپنے آزاد ہونے کا علم نہیں ہوا، یا آزاد ہونے کا علم ہو چکا تھا؛ لیکن اس بات کا علم نہیں تھا کہ اسے یہ اختیار حاصل ہے، تو یہ چیز اس کے اختیار کو ختم نہیں کرے گی۔ یہی حضرت امام ابو حنیفہؒ اور اکثر فقہاء کا قول ہے۔

(ب:۲۸) بَابُ طلاقِ المَرِيضِ

بیمار شوہر کے طلاق دینے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا الزُّهْرِيُّ، عَنْ طَلْحَةَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَوْفٍ، طَلَّقَ امْرَأَتَهُ وَهُوَ مَرِيضٌ فَوَرَّثَهَا عُثْمَانُ مِنْهُ بَعْدَ مَا انْقَضَتْ عِدَّتُهَا.

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ الْفَضْلِ، عَنِ الْأَعْرَجِ، عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ، أَنَّهُ وُرِّثَ نِسَاءَ ابْنِ مُكْمِلٍ مِنْهُ، كَانَ طَلَّقَ نِسَائَهُ وَهُوَ مَرِيضٌ

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے بارے میں یہ بات منقول ہے کہ انہوں نے بیماری کے عالم میں اپنی اہلیہ کو طلاق دے دی تو حضرت عثمان غنیؓ نے اس خاتون کو اس کی عدت گذر جانے کے بعد حضرت عبدالرحمٰن کا وارث قرار دیا۔ حضرت عثمان غنیؓ کے بارے میں یہ بات منقول ہے کہ انہوں نے ابن مکمل کی بیوی کو ان کا وارث قرار دیا تھا۔ ابن مکمل نے بیماری کے دوران

اپنی بیوی کو طلاق دیدی تھی۔

بیمار کا طلاق دینا کیسا ہے؟

تشریح: یہاں مریض سے مراد وہ شخص ہے، جس کی نسبت غالب گمان ہو کہ اس مرض سے ہلاک ہو جائے گا، مرض نے اسے اتنا لاغر کر دیا ہو کہ گھر سے باہر کام کے لیے نہیں جا سکتا، یا تاجر اپنی دوکان تک نہیں جا سکتا۔ اور یہ اکثر کے لحاظ سے ہے؛ ورنہ اصل کام یہ ہے کہ اس مرض میں غالب گمان ہی موت ہے۔ اگر ابتداءً یہ شدت نہ ہوتی ہو، باہر جا سکتا ہو، مثلاً ہیضہ وغیرہ امراضِ مہلکہ میں بعض لوگ گھر سے باہر کے کام بھی کر لیتے ہیں؛ مگر ایسے امراض میں غالب گمان ہلاکت ہے۔ (فتح القدیر)

فتح القدیر کی مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ یہاں مریض سے مراد ہر وہ شخص ہے جس کی موت غالباً ہونے والی ہو، خواہ کسی بیماری سے، یا کسی دوسرے سبب سے۔

ایسا شخص اگر اپنی بیوی کو طلاق دیدیتا ہے، تو مؤطا کی روایت کے مطابق اگر اس مریض کی بیوی ابھی عدت گذار رہی تھی کہ مریض کا انتقال ہو گیا، تو بیوی کو اس کی وراثت ملے گی۔ اور اگر بیوی کی عدت گزر چکی تھی، بعد میں مریض کا انتقال ہوتا ہے، تو اس صورت میں عورت وراثت کی حقدار نہ ہوگی۔ اس کی تائید ایک اثر سے ہوتی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ: جب کوئی شخص حالت مرض میں اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے، وہ عورت جب تک عدت میں ہے اس کی وارث ہوگی اور وہ مرد اس کا وارث نہ ہوگا۔ (مصنف عبدالرزاق، ج:۷، ص:۶۴)

مذکورہ آثار میں دو مسئلے بیان ہوئے ہیں: ایک یہ کہ اگر کوئی شخص مرض الموت میں اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے، وہ طلاق بتہ ہو یا مغلظہ ہو، طلاق کی عدت

ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ خاوند کا انتقال ہو گیا، تو اس صورت میں عورت اس کی وارث قرار پائے گی۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ: اگر عورت کو کسی قسم کی طلاق مرض الموت میں دی گئی اور خاوند کے مرنے سے قبل اس کی عدت گذر چکی تھی، بعد میں خاوند کا انتقال ہوا، تو اس صورت میں یہ عورت وارث نہیں بنے گی، کیونکہ عدت ختم ہونے سے اس عورت کا مرد سے تعلق بالکل منقطع ہو گیا ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: يَرِثْنَهُ مَا دُمْنَ فِي الْعِدَّةِ فَإِذَا انْقَضَتِ الْعِدَّةُ قَبْلَ أَنْ يَمُوتَ، فَلا مِيرَاثَ لَهُنَّ. وَكَذَلِكَ ذَكَرَ هُشَيْمُ بْنُ بَشِيرٍ، عَنِ الْمُغِيرَةِ الضَّبِّيِّ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ النَّخَعِيِّ، عَنْ شُرَيْحٍ، أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَتَبَ إِلَيْهِ، فِي رَجُلٍ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ ثَلاثًا وَهُوَ مَرِيضٌ: أَنْ وَرِّثْهَا مَا دَامَتْ فِي عِدَّتِهَا، فَإِذَا انْقَضَتِ الْعِدَّةُ، فَلا مِيرَاثَ لَهَا، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں وہ خواتین مرحوم کی وارث اس وقت تک ہوں گی جب تک وہ عدت گذار رہی ہوں، لیکن جب ان کی عدت مرحوم کے فوت ہو جانے سے پہلے ختم ہو جاتی ہے تو پھر ان عورتوں کو وراثت میں حصہ نہیں ملے گا۔ — ابراہیم نخعیؒ نے قاضی شریحؒ کے حوالے سے یہ بات نقل کی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے انہیں خط میں لکھا تھا ایسے شخص کے بارے میں جو اپنی بیوی کو تین طلاق دیدیتا ہے، جب کہ وہ مریض ہو (یہ لکھا تھا) کہ جب تک اس عورت کی عدت باقی ہے وہ اس عورت کو اس شخص کا وارث قرار دیں؛ لیکن اگر اس عورت کی عدت گزر چکی ہو، تو پھر اس کو میراث نہیں ملے گی۔ امام ابو حنیفہؒ اور

اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اگر شوہر نے بیوی کو مرض الموت کی حالت میں طلاق دے دی، تو اگر عدت کے دوران شوہر کی وفات ہو جائے تو یہ بیوی اس کی وارث ہوگی۔ لیکن اگر شوہر کی وفات سے پہلے عدت پوری ہو جائے، تو ان کو میراث نہیں ملے گی۔ وجہ یہ ہے کہ مرض الموت کی وجہ سے بیوی کا حق شوہر کے مال سے متعلق ہو چکا ہے اور شوہر کے طلاق دینے کی وجہ سے اس کا وہ حق ختم ہو رہا ہے، اس لیے بیوی کو نقصان سے بچانے کے لئے پہلی صورت میں وراثت ملے گی، اور یہ ممکن بھی ہے، اس لیے کہ من وجہٍ عدت کی وجہ سے نکاح باقی ہے۔ دوسری صورت میں چونکہ نکاح بالکلیہ ختم ہو چکا ہے، اس لیے میراث کے ملنے کی کوئی صورت نہیں ہے، چنانچہ حضرت عمر بن خطاب ؓ نے قاضی شریح کے پاس ایک ایسے شخص کے سلسلے میں جس نے مرض الموت کی حالت میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی تھیں، یہ تحریر کیا تھا کہ جب تک بیوی اس کی عدت میں ہے تو وہ اس بیوی کو میراث دیں، لیکن اگر عدت پوری ہو جائے، تو اس کے لئے کوئی میراث نہیں ہے۔ یہی حضرت امام ابو حنیفہ اور اکثر فقہاء کا قول ہے۔

(ب:۲۹) بَابُ الْمَرْأَةِ الَّتِى تُطَلَّقُ أَوْ يَمُوتُ عَنْهَا زَوْجُهَا وَهِىَ حَامِلٌ

حاملہ کی عدت کا بیان، خواہ وہ مطلقہ ہو، یا اسکا خاوند انتقال کر گیا ہو

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا الزُّهْرِيُّ، أَنَّ ابْنَ عُمَرَ سُئِلَ عَنِ امْرَأَةٍ يُتَوَفَّى عَنْهَا زَوْجُهَا؟ قَالَ: إِذَا وَضَعَتْ فَقَدْ حَلَّتْ، قَالَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ

كَانَ عِنْدَهُ: أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ: لَوْ وَضَعَتْ مَا فِي بَطْنِهَا وَهُوَ عَلَى سَرِيرِهِ لَمْ يُدْفَنْ بَعْدُ حَلَّتْ.

ترجمہ: زہریؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایسی خاتون کے بارے میں دریافت کیا گیا جو بیوہ ہو جاتی ہے، تو انہوں نے فرمایا کہ: جب وہ بچے کو جنم دے گی، اس وقت اس کی عدت پوری ہو گی۔ تو اس کے پاس ایک انصاری نے کہا کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے تو یہ فرمایا ہے کہ: اگر وہ عورت اپنے پیٹ میں موجود بچے کو جنم دے اور اس وقت اس کے شوہر کی میت تختے پر پڑی ہوئی ہو، اس کو دفن نہ کیا گیا ہو، تو اس وقت اس کی عدت پوری ہو جائے گی۔

تشریح: إذا وضعَتْ إلخ. فرما رہے ہیں کہ عورت چاہے آزاد ہو، یا باندی ہو، اگر شوہر کی موت کے وقت وہ حاملہ ہو، تو اس کی عدت وضعِ حمل ہے، جیسے ہی بچہ جنے گی، مدت پوری ہو جائے گی؛ کیونکہ آیت میں ہے: ﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ یعنی حمل والیوں کی عدت یہ ہے کہ بچہ جن دے۔ اور اگر مطلقہ باندی ہو، تو اس کی عدت دو حیض ہو گی؛ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "طَلَاقُ الأَمَةِ تَطْلِيقَتَان، وعِدَّتُها حَيضَتَان" کہ باندی کو دو طلاقیں دی جائیں گی اور اس کی عدت بھی دو حیض ہو گی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ غلام ہونا نعمت کو نصف کر دیتا ہے۔ اور چونکہ حیض کے اجزا نہیں کیے جا سکتے، اس لیے یہ مکمل ہو گا اور دو حیض شمار ہوں گے۔

حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے الفاظ میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے "اگر میں استطاعت رکھتا تو اس (لونڈی) کی عدت کو ڈیڑھ حیض مقرر کرتا"۔

اگر باندی ایسی ہو کہ اس کو کم عمری، یا بڑی عمر کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو، تو ایسی

صورت میں اس کی عدت ڈیڑھ ماہ ہوگی؛ کیونکہ اس وقت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اس لیے باندی ہونے پر عمل کرتے ہوئے اسے نصف قرار دینا ممکن ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: إِذَا وَضَعَتْ مَا فِي بَطْنِهَا حَلَّتْ، قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ فِي الطَّلَاقِ وَالْمَوْتِ جَمِيعًا، تَنْقَضِي عِدَّتُهَا بِالْوِلَادَةِ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتوی دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: جب وہ عورت اپنے پیٹ میں موجود بچے کو جنم دے گی، تو اس کی عدت پوری ہو جائے گی۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ طلاق اور بیوگی دونوں صورتوں میں ہم اس روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں کہ بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی اس عورت کی عدت پوری ہو جائے گی۔ اور حضرت امام ابوحنیفہ کا قول بھی یہی ہے۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ طلاق اور بیوگی دونوں صورتوں میں ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں کہ اس کی عدت بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی پوری ہو جائے گی۔ اور یہی حضرت امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔

طلاق کے مسئلہ میں تو سب کا اتفاق ہے کہ وضع حمل کے ساتھ ہی اس کی عدت پوری ہو جائے گی۔ حاملہ بیوہ کے سلسلے میں اگرچہ کچھ لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ اور وہ اختلاف یہ ہے کہ اس کی عدت وضع حمل اور چار ماہ دس دن میں سے آخر الاجلین ہوگی، (یعنی اس کی عدت کی مدت جو بعد میں ختم ہوگی وہی ہوگی)۔ مگر

اس اختلاف کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اس لیے کہ سلف وخلف میں سے تمام جمہور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ بیوہ حاملہ کی عدت کی مدت وضع حمل ہے۔ اور آخر الاجلین کی جو بات حضرت ابن عباسؓ سے سند منقطع کے ساتھ روایت کی جاتی ہے، تو حضرت ابن عباسؓ نے بھی خود قصۂ سبیعہ کے سلسلے میں حدیث اُمّ سلمہؓ کی طرف رجوع فرمالیا تھا۔ وہ قصہ یہ ہے کہ سبیعہ بنت حارث اسلمیہ کے شوہر کی وفات ہوگئی تھی، شوہر کی وفات کے ۲۵؍دن بعد ان کا وضع حمل ہوا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی عدت کے پورا ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیوہ عورت کی عدت وضع حمل ہے، نہ کہ آخر الاجلین۔

(ب: ۳۰) بَابُ الإِیلاءِ

ایلاء کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا الزُّهْرِيُّ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، قَالَ: إِذَا آلَى الرَّجُلُ مِنِ امْرَأَتِهِ، ثُمَّ فَاءَ قَبْلَ أَنْ تَمْضِيَ أَرْبَعَةُ أَشْهُرٍ، فَهِيَ امْرَأَتُهُ لَمْ يَذْهَبْ مِنْ طَلَاقِهَا شَيْءٌ، فَإِنْ مَضَتِ الْأَرْبَعَةُ الْأَشْهُرُ قَبْلَ أَنْ يَفِيءَ، فَهِيَ تَطْلِيقَةٌ وَهُوَ أَمْلَكُ بِالرَّجْعَةِ مَا لَمْ تَنْقَضِ عِدَّتُهَا، قَالَ: وَكَانَ مَرْوَانُ يَقْضِي بِهِ.

ترجمہ: سعید بن میسبؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کے ساتھ ایلاء کرلیا، پھر اس نے چار ماہ گذرنے سے پہلے اس عورت کے ساتھ رجوع کرلیا، تو وہ عورت اس کی بیوی شمار ہوگی اور کوئی طلاق واقع نہ ہوگی۔ لیکن اگر چار ماہ گذر جاتے ہیں اور وہ شخص اس سے رجوع نہیں کرتا، تو

ایک طلاق ہو جائے گی؛ تاہم اس شخص کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہوگا، جب تک اس عورت کی عدت نہیں گذر جاتی۔ راوی کہتے ہیں کہ مروان اسی قول کے مطابق فیصلہ دیا کرتا تھا۔

ایلاء کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

تشریح: لغت میں ''ایلاء'' کے معنی: حلف اُٹھانے اور قسم کھانے کے آتے ہیں۔

شرعی اصطلاح میں: "مَنعُ النَّفس عَن قربَان المَنكُوحةِ أربعةَ أشهُرٍ فَصاعدًا، منعًا مُؤكّدًا باليقِينِ". یعنی چار ماہ، یا اس سے زیادہ مدت کے لیے بیوی کے پاس جانے سے قسم کھا کر رُک جانا ''ایلاء'' کہلاتا ہے۔

ایلاء کی صورت یہ ہے کہ کسی آدمی نے اپنی بیوی سے کہا: (۱) خدا کی قسم! تیرے قریب نہیں آؤں گا۔ اس صورت میں بالاتفاق ایلاء کرنے والا ہوگا۔ (۲) واضح انداز میں کہا کہ: چار ماہ تک تیرے قریب نہیں آؤں گا۔ اس صورت میں ہمارے نزدیک ایلاء کرنے والا ہوگا۔

اب جب اس شخص نے ایلاء کرلیا، تو ایلاء کے بعد چار ماہ تک بیوی سے نہیں ملا تو چار ماہ گذرتے ہی خود ایلاء سے طلاقِ بائنہ واقع ہو جائے گی، اب وہ مطلقہ کی عدت گذار کر جدا ہو جائے۔ پھر اس بارے میں اختلاف ہے کہ چار ماہ گذرتے ہی خود تفریق ہو جائے گی، یا قضاءِ قاضی کی ضرورت پڑے گی؟

فقہائے کرام کا اختلاف

ائمہ ثلاثہ کا مذہب: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک چار ماہ گذرنے پر خود بخود طلاق واقع نہیں ہوتی؛ بلکہ مدت پوری ہونے پر قاضی شوہر کو بلا کر رجوع کا حکم

دے گا، اگر اس نے رجوع کرلیا، تو ٹھیک؛ ورنہ اس کو طلاق دینے کا حکم دے گا۔

حنفیہ کا مذہب: حنفیہ کے نزدیک چار ماہ گذرتے ہی خود بخود طلاق بائن واقع ہوجائے گی۔ اور تفریق کے لیے قضاءِ قاضی کی ضرورت نہ ہوگی۔

ائمہ ثلاثہ کی دلیل: ﴿لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَحِیْمٌ وَاِنْ عَزَمُوْا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾ سے ہے کہ اس میں چار ماہ گذرنے کے بعد عزمِ طلاق کا ذکر کیا گیا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ محض عدت گذر جانے سے طلاق واقع نہیں ہوتی؛ بلکہ عزمِ طلاق ضروری ہے۔

دلیل کا جواب: جہاں تک آیت قرآنی سے استدلال کا تعلق ہے، اس کی تفصیل حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ منقول ہے: انقضاءُ الأربعةِ عَزِیمةُ الطَّلاق، والفَيءُ الجماعُ. (مصنف عبدالرزاق، ج:۶، ص:۴۵۴) چار ماہ گذرنے سے خود بخود طلاق بائن واقع ہوجائے گی۔ (درسِ ترمذی، ج:۳، ص:۵۲۲)

حنفیہ کی دلیل: حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کے آثار ہیں، جو اس بات پر متفق ہیں کہ چار ماہ گذرنے سے خود بخود طلاقِ بائن واقع ہو جائے گی۔ (درس ترمذی، ج:۳، ص:۵۲۲)

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: أَيُّمَا رَجُلٍ آلَى مِنِ امْرَأَتِهِ فَإِذَا مَضَتِ الأَرْبَعَةُ الأَشْهُرُ وُقِفَ حَتَّى يُطَلِّقَ، أَوْ يَفِيءَ، وَلَا يَقَعُ عَلَيْهَا طَلَاقٌ، وَإِنْ مَضَتِ الأَرْبَعَةُ الأَشْهُرُ حَتَّى يُوقَفَ.

ترجمہ: نافعؒ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ جو شخص اپنی بیوی کے ساتھ ایلاء کر لیتا ہے اور پھر چار ماہ گذر جاتے ہیں تو معاملہ موقوف ہوگا، یہاں تک کہ وہ شخص طلاق دیدے گا یا رجوع کرے گا، لیکن اس عورت پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ لیکن اگر چار ماہ گذر جاتے ہیں، تو پھر اسے مجبور کیا جائے گا (کہ عورت کو طلاق دے)

ایلاء کا وقت گذرتے ہی تفریق ہو جائیگی یا قضاء قاضی کی ضرورت پڑیگی؟

تشریح: اس روایت کی تشریح یہ ہے کہ چار ماہ گذر جانے پر خاوند کو عدالت میں لا کھڑا کیا جائے گا؛ تاکہ وہ طلاق دے، یا پھر رجوع کرے، گویا اس تشریح کے مطابق چار ماہ گذرنے پر کچھ بھی نہیں ہوا، طلاق یا رجوع حاکم کے کہنے پر ہوگا۔ یہی عبداللہ بن عمرؓ ہیں جن کے بارے میں آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ آپ چار ماہ گذر جانے پر طلاقِ بائنہ واقع ہو جانے کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں مزید تشریح پہلی روایت کے ضمن میں آچکی ہے، وہاں دیکھ لیا جائے۔ مذکورہ روایت پر ایک اعتراض ہوتا ہے۔

اعتراض یہ ہے کہ باب کی دونوں روایات مسلک احناف کے خلاف ہیں۔ اختلاف یہ ہے کہ روایت میں ایلاء کی صورت میں چار ماہ گذرنے پر ایک رجعی طلاق ہوتی ہے، جب کہ اس دوران رجوع نہ کیا ہو۔ اور احناف کا مسلک پڑھ چکے ہیں کہ صورتِ مذکورہ میں ایک طلاقِ بائنہ واقع ہوتی ہے۔ اس کے دو جواب دیے گئے ہیں:

پہلا جواب: علامہ عینیؒ نے ہدایہ کی شرح میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے: وَ يَرُدُّ قولَهم ظَاهرُ القُرآن. أي حيثُ لمْ يَجعلِ التربُّصَ

أكثرَ مِن أربَعَةِ أشهُرٍ وعَشْرًا ...... إليٰ في مُدَّة الإيلاء. (البناية، ج: ٤، ص: ٤٣٤) یعنی ان حضرات کے قول کو قرآنِ کریم کا ظاہر رد کرتا ہے، یعنی چار ماہ اور دس دن سے زیادہ ٹھہرنا (عدت گذارنا) وفات شوہر کی صورت میں جائز نہیں کیا گیا اور طلاق کی عدت میں تین حیض سے زائد عدت نہیں کی گئی، تو ایلاء کی عدت بھی زائد نہیں ہونی چاہیے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ عدتِ وفات اور عدتِ طلاق کی طرح ایلاء کا بھی وقت پورا کا پورا مراد لیا جائے، جو قرآنِ کریم نے ذکر کیا ہے۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ اس روایت کے راوی صرف حضرت سعید بن مسیبؒ ہی نہیں ہیں؛ بلکہ ان کے علاوہ حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن بھی ہیں، یہی ابوبکر بن عبدالرحمٰن ہیں کہ ان سے ایک اور روایت مروی ہے، جس میں موجود ہے کہ صورتِ مذکورہ میں مرد کو رجوع کا حق حاصل نہیں ہے۔ ابن منذر نے ''الاشراق'' میں لکھا ہے کہ یہی قول حضرت ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ کا ہے۔ اور حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت علی المرتضیٰؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی مروی ہے۔ (جوہر النقی، حاشیہ بیہقی، ج: ۷، ص: ۳۸۰)

قَالَ مُحَمَّدٌ: بَلَغَنَا، عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، وَعُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ، وَعَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ، وَزَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ، أَنَّهُمْ قَالُوا: إِذَا آلَى الرَّجُلُ مِنِ امْرَأَتِهِ فَمَضَتْ أَرْبَعَةُ أَشْهُرٍ قَبْلَ أَنْ يَفِيءَ فَقَدْ بَانَتْ بِتَطْلِيقَةٍ بَائِنَةٍ، وَهُوَ خَاطِبٌ مِنَ الْخُطَّابِ وَكَانُوا لا يَرَوْنَ أَنْ يُوقَفَ بَعْدَ الأَرْبَعَةِ، وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فِي تَفْسِيرِ هَذِهِ الآيَةِ: ﴿لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَاءُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾، ﴿وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾. قَالَ: الْفَيْءُ:

الْجِمَاعُ فِی الْأَرْبَعَةِ الْأَشْهُرِ، وَعَزِيمَةُ الطَّلَاقِ: انْقِضَاءُ الْأَرْبَعَةِ الْأَشْهُرِ، فَإِذَا مَضَتْ بَانَتْ بِتَطْلِيقَةٍ، وَلا يُوقَفُ بَعْدَهَا، وَكَانَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَبَّاسٍ أَعْلَمَ بِتَفْسِيرِ الْقُرْآنِ مِنْ غَيْرِهِ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت زید بن ثابتؓ کے بارے میں یہ روایات ہم تک پہنچی ہیں، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ ایلاء کرلے اور اس کے رجوع کرنے سے پہلے چار ماہ گذر جائیں، تو ایک بائنہ طلاق واقع ہوجائے گی اور وہ شخص دیگر لوگوں کی طرح اپنا رشتہ بھیج سکے گا۔ یہ حضرات اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ چار مہینے گذرنے کے بعد اس شخص کو مجبور کیا جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ قرآن کی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: — ''وہ لوگ جو اپنی بیویوں کے ساتھ ایلاء کرتے ہیں، وہ چار ماہ انتظار کریں، اگر وہ رجوع کرلیتے ہیں، تو بے شک اللہ تعالیٰ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اگر وہ طلاق کا ارادہ کرلیتے ہیں، تو بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا اور علم رکھنے والا ہے''۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں ''الفیء'' سے مراد چار ماہ کے اندر صحبت کرنا ہے۔ اور طلاق کے عزم سے مراد، چار ماہ گذر جانا ہے، جب یہ گذر جائیں تو ایک طلاقِ بائنہ ہوجائے گی، لیکن اس کے بعد اسے موقوف نہیں رکھا جائے گا۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ کسی دوسرے شخص کے مقابلے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ قرآن کی تفسیر کے بہت بڑے عالم ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب، عثمان غنی اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم یہ تمام حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ ایلاء کرلے اور اس کے رجوع کرنے سے پہلے چار ماہ گذر جائیں، تو معاملے کو قاضی کے پاس لے جانے تک التوا میں ڈالے بغیر اسے ایک طلاقِ بائنہ پڑ جائے گی، اب اُس کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ عدت کے دوران خصوصیت کے ساتھ، اور عدت کے گذر جانے کے بعد دوسرے لوگوں کی طرح اگر چاہے تو اسے نکاح کا پیغام دے کر عقدِ جدید کے ساتھ اس سے نکاح کرسکتا ہے۔

چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت میں "وَ اِنْ عَزَمُوْا الطَّلَاقَ" سے مدت ایلاء چار ماہ کا گذر جانا مراد لیا ہے۔ یعنی اگر یہ مدت گذر گئی تو یہ اس کی طرف سے ایک طلاقِ بائنہ شمار کرلی جائے گی اور اس کے بعد کسی طرح کا کوئی توقف نہیں کیا جائے گا۔ امام صاحبؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

(ب:٣١) بَابُ الرجُلِ يُطلِّقُ إِمرأَتَه ثلاثًا قبلَ أن يَدخُلَ بِها

وطی سے قبل مرد کا اپنی بیوی کو طلاق دینے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا الزُّهْرِيُّ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ ثَوْبَانَ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ إِيَاسِ بْنِ بُكَيْرٍ، قَالَ: طَلَّقَ رَجُلٌ امْرَأَتَهُ ثَلاثًا قَبْلَ أَنْ يَدْخُلَ بِهَا، ثُمَّ بَدَا لَهُ أَنْ يَنْكِحَهَا فَجَاءَ يَسْتَفْتِي، قَالَ: فَذَهَبْتُ مَعَهُ، فَسَأَلَ أَبَا هُرَيْرَةَ، وَابْنَ عَبَّاسٍ، فَقَالا: لا يَنْكِحُهَا حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ، فَقَالَ: إِنَّمَا كَانَ طَلاقِي إِيَّاهَا وَاحِدَةً، قَالَ ابْنُ

عَبَّاسٍ : أَرْسَلْتَ مِنْ يَدِكَ مَا كَانَ لَكَ مِنْ فَضْلٍ.

ترجمہ: محمد بن اَیاس بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کرنے سے پہلے ہی اسے تین طلاقیں دے دیں، پھر اسے یہ مناسب لگا کہ وہ اس عورت کے ساتھ شادی کرلے، تو وہ یہ مسئلہ دریافت کرنے کے لیے آیا، میں اس کے ساتھ چلا گیا، اس نے حضرت ابوہریرہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مسئلہ دریافت کیا: تو ان دونوں نے یہی جواب دیا کہ: وہ اس عورت کے ساتھ شادی اس وقت تک نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ عورت کسی دوسرے مرد کے ساتھ شادی نہیں کرلیتی (اور پھر بیوہ یا طلاق یافتہ نہیں ہوجاتی)۔ وہ شخص کہنے لگا کہ میں نے جو اس عورت کو طلاق دی تھی وہ تو ایک ہی تھی؟ تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا: تمہیں جو اضافی سہولت حاصل تھی تم نے خود ہی ترک کردی۔

تشریح: اس روایت میں غیر مدخول بہا کو طلاق دینے کا مسئلہ مذکور ہے، اس کی تفصیل کچھ یوں ہے: اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو دخول سے قبل تین طلاقیں بیک لفظ دے دیتا ہے تو تینوں واقع ہوجائیں گی۔ اور اگر ایک طلاق دیتا ہے، تو صرف پہلی طلاق واقع ہوگی، بقیہ دونوں لغو قرار پائیں گی۔ بیک وقت تین طلاقیں دینے سے تین اس لیے واقع ہوں گی کہ وہ عورت مطلق طلاق کا محل ہے، اس لئے وہ مغلظہ ہوجائے گی اور حلالہ کے بغیر زوجِ اوّل کے لئے حلال نہ ہوگی۔ اور اگر علیحدہ علیحدہ طلاق دی تو صرف پہلی ہی کارگر ہوگی اور یہ ایک بائنہ طلاق ہوگی۔ اب یہ عورت چونکہ طلاق کا محل نہیں رہی، اس لیے دوسری اور تیسری بے کار ہوجائیں گی۔

اس صورت میں بھی بعض کا خیال ہے کہ ایک رجعی طلاق ہوتی ہے، جیسا کہ

مدخولہ کو صریح لفظ طلاق سے ایک طلاق دی جائے تو رجعی طلاق ہوتی ہے، لیکن احناف کے نزدیک اس صورت میں ایک واقع ہونے والی طلاق بائن ہوگی، اگرچہ وہ الفاظِ صریحہ میں سے کسی لفظ کے ذریعہ طلاق دی گئی ہو، لہٰذا احناف کے نزدیک مدخولہ اور غیر مدخولہ کے متعلق یہ فرق ہے۔

ضابطہ، اشکال اور اس کا جواب

ضابطہ: ضابطہ یہ ہے کہ طلاقِ بائنہ کے بعد بائنہ واقع نہیں ہوسکتی ہے اور طلاقِ رجعی کے بعد بائنہ ہوسکتی ہے اور بائنہ کے بعد رجعی واقع ہوسکتی ہے، لیکن یہ ضابطہ مدخول بہا کے لئے ہے، کیونکہ وہ بینونت کے بعد بھی محل طلاق ہے، لیکن غیر مدخول بہا ایک ہی صریح طلاق سے بائنہ ہوجاتی ہے، کیونکہ وطی نہ ہونے کی وجہ سے اس نے خاوند کی منی کا رحم میں ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ ہی کوئی نہیں۔

اِشکال: امام محمدؒ کی عبارت اور احناف کا مسلک ملتا جلتا ہے، کیونکہ امام محمدؒ نے فرمایا کہ: غیر مدخول بہا ایک طلاق سے بائنہ ہوجائے گی۔ الفاظ یہ ہیں: بَانَتْ بِها قَبلَ أن يَتكَلَّمَ بالثَّانِيةِ، ولاَ عِدَّةَ عَلَيهَا، الثَّانِيةُ والثَّالثَةُ مَا دامَتْ فِي العِدَّةِ. دوسری طلاق کے الفاظ منہ سے نکلنے سے قبل پہلی طلاق سے اسے طلاقِ بائنہ ہوگی اور اس پر کوئی عدت نہیں ہے، پس اس پر دوسری اور تیسری اس وقت واقع ہوگی جب تک وہ عدت میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مدخول بہا کو دوسری اور تیسری طلاق دورانِ عدت واقع ہوسکتی ہے؛ حالانکہ احناف دوسری اور تیسری طلاق کو لغو قرار دیتے ہیں؟

جواب: امام محمدؒ نے اپنے کلام میں چند الفاظ مقدر رکھے ہیں، جن کا نکالنا اور مفہوم مراد لینا اہل علم پر چھوڑ دیا ہے۔ آپ کی اصل عبارت یوں تھی: لاَ عِدَّةَ

عَلَيهَا فَتقعُ علىٰ غَير امرأتِهِ الثَّانِيةُ والثَّالِثَةُ مَا دامَتْ فِي العِدَّةِ. یعنی غیر مدخول بہا ایک طلاق سے بائنہ ہو جائے گی؛ مگر جو اس کی بیوی مدخول بہا ہے اس پر دوسری طلاق عدت کے دوران واقع ہوگی۔

(مزید تفصیل کے لیے: مصنف عبدالرزاق، ج:۶، ص:۳۳۱ر دیکھ لیں)

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا، لأَنَّهُ طَلَّقَهَا ثَلاثًا جَمِيعًا، فَوَقَعْنَ عَلَيْهَا جَمِيعًا مَعًا، وَلَوْ فَرَّقَهُنَّ وَقَعَتِ الأُولَى خَاصَّةً لأَنَّهَا بَانَتْ بِهَا قَبْلَ أَنْ يَتَكَلَّمَ، وَلا عِدَّةَ عَلَيْهَا فَتَقَعُ عَلَيْهَا الثَّانِيَةُ وَالثَّالِثَةُ مَا دَامَتْ فِي الْعِدَّةِ.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص نے تینوں طلاقیں ایک ساتھ دیدیں تو وہ تینوں ایک ساتھ واقع ہو جائیں گی۔ اگر انہیں الگ الگ کر کے دیتا تو بطورِ خاص پہلی طلاق واقع ہو جاتی اور اس شخص کے دوسری طلاق کے بارے میں کلام کرنے سے پہلے ہی وہ عورت بائنہ طور پر اس سے جدا ہو جاتی، اس عورت پر کوئی عدت لازم نہ ہوگی۔ اور دوسری اور تیسری طلاق تو عورت کی عدت کے دوران واقع ہوتی ہے۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم بھی ظاہر قرآن اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابو ہریرۃؓ کے فتویٰ کے مطابق یہی فتویٰ دیتے ہیں۔ اور یہی امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء کا مذہب ہے، اس لئے کہ جب طلاق دینے والے نے غیر مدخول بہا پر "اَنْتِ طَالِقٌ ثَلاثًا" اکٹھی تین طلاقیں واقع کی ہیں، تو اس پر

وہ تینوں ایک ساتھ واقع ہوں گی۔اور چونکہ وقوع ایقاع کی فرع ہے اور ایقاع میں تین طلاقیں یکبارگی واقع ہوں گی۔ہاں! البتہ اگر شوہر نے ''اَنْتِ طَالِقٌ وَ طَالِقٌ وَ طَالِقٌ'' تکرار کے ساتھ کہہ کر تین طلاقیں دی ہیں اور اس کلام کے آخر میں شرط یا استثناء وغیرہ جو ماقبل کلام کے لیے مُغیّر بن سکے استعمال نہیں کیا، تو صرف ایک طلاق واقع ہوگی، اس لئے کہ دوسری طلاق کے بولنے سے پہلے ہی اس کو ایک طلاق بائنہ پڑ چکی ہے، چونکہ اس پر عدت نہ ہونے کی وجہ سے وہ طلاق کا محل نہیں رہی، اس لیے دوسری اور تیسری طلاق اس پر نہیں پڑے گی۔

(ب:۳۲) بَابُ الرجُلِ يُطلِّقُها زوجُها فتزوَّج رجُلاً فيُطلِّق قبلَ الدُّخول

بیوی کو مرد نے طلاق دیدی، پھر اُس نے کسی اور مرد سے شادی کرلی، پھر اس مرد نے اُسے وطی سے قبل طلاق دیدی، اسکا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا الْمِسْوَرُ بْنُ رِفَاعَةَ الْقُرَظِيُّ، عَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ الزُّبَيْرِ، أَنَّ رِفَاعَةَ بْنَ سِمْوَالٍ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ تَمِيمَةَ بِنْتَ وَهْبٍ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلاثًا، فَنَكَحَهَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ الزُّبَيْرِ، فَأَعْرَضَ عَنْهَا، فَلَمْ يَسْتَطِعْ أَنْ يَمَسَّهَا، فَفَارَقَهَا وَلَمْ يَمَسَّهَا، فَأَرَادَ رِفَاعَةُ أَنْ يَنْكِحَهَا، وَهُوَ زَوْجُهَا الأَوَّلُ الَّذِي طَلَّقَهَا، فَذَكَرَ ذَلِكَ لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَنَهَاهُ عَنْ تَزْوِيجِهَا، وَقَالَ: لا تَحِلُّ لَكَ حَتَّى تَذُوقَ الْعُسَيْلَةَ.

ترجمہ: رفاعہ بن سموالؓ نے اپنی بیوی تمیمہ بنت وہب کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ اقدس میں تین طلاقیں دے دیں، تو عبدالرحمٰن بن زبیرؓ نے اس عورت کے ساتھ شادی کرلی، پھر وہ عورت کے ساتھ صحبت نہیں کر سکے اور صحبت کرنے سے پہلے ہی انہوں نے اس عورت سے علیحدگی اختیار کر لی، تو رفاعہؓ نے اس خاتون کے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ کیا، کیونکہ وہ اس کے پہلے شوہر تھے جنہوں نے اسے طلاق دی تھی۔ انہوں نے اس بات کا تذکرہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، تو آپؐ نے اس عورت کے ساتھ شادی کرنے سے منع کردیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: وہ تمہارے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہوگی جب تک وہ عورت دوسرے شوہر کا مزہ نہیں چکھ لیتی (یعنی دوسرے شوہر کے ساتھ صحبت نہیں کرلیتی)۔

حلالہ کے احکام

تشریح: اس باب میں حلالہ کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ: اگر کسی شخص نے اپنی آزاد بیوی کو تین طلاقیں دیدیں تو یہ عورت شوہر کے لئے حلال نہیں رہے گی، یہاں تک کہ حلالہ نہ ہوجائے۔ اور اس کی شکل یہ ہے کہ عدت گزارنے کے بعد دوسرے آدمی سے شادی کرے، پھر وہ صحبت کرے، پھر وہ طلاق دے، یا مرجائے، تب اس کی عدت گزار کر پہلے شوہر سے شادی کرسکتی ہے اور پہلے شوہر کے لئے حلال ہوسکتی ہے۔ دوسرے شوہر سے شادی کرنے کی دلیل یہ آیت ہے: "فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ".
اس آیت میں ہے کہ تیسری طلاق کے بعد جب تک دوسرے شوہر سے شادی نہ کرے پہلے کے لیے حلال نہیں ہوگی۔ اور دوسرے شوہر کی صحبت کے بغیر حلال نہ

ہونے کی دلیل حدیث باب ہے، جس میں حضرت رفاعہ قرظی کا واقعہ مذکور ہے۔ حضرت رفاعہ قرظی کی بیوی نے دوسرے شخص سے نکاح کیا، نکاح کے بعد وہ شوہر اوّل کے پاس آنا چاہ رہی تھی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: لا تَحِلُّ لَكَ حَتَّى تَذُوقَ الْعُسَيْلَة. اس میں عُسَيْلَة سے جماع مراد ہے۔ حضرت عائشہؓ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔

تو اس حدیث سے یہ بات صاف معلوم ہوئی کہ عورت جب تک دوسرے شوہر سے نکاح کے بعد جماع نہ کرے، تو اس وقت تک وہ شوہر اوّل کے لئے حلال نہیں ہوسکتی۔

البتہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ زوجِ ثانی پر کوئی لازم نہیں کہ وہ طلاق دیدے۔ اگر وہ طلاق نہیں دیتا تو وہ اس کی بیوی ہے؛ لیکن اگر اس نے رضا ورغبت کے ساتھ طلاق دیدی، تو عورت پر عدت گزارنا لازم ہے، پھر جا کر نکاح کر سکتی ہے۔ (نورالانوار، ص:۱۲)

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا، لِأَنَّ الثَّانِيَ لَمْ يُجَامِعْهَا، فَلا يَحِلُّ أَنْ تَرْجِعَ إِلَى الأَوَّلِ حَتَّى يُجَامِعَهَا الثَّانِي.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک دوسرا شوہر عورت کے ساتھ صحبت نہیں کر لیتا، اس وقت تک اس عورت کے لیے پہلے شوہر کے پاس جانا جائز نہیں ہے۔

تشریح: اس کی وضاحت ماقبل کی تشریح کے ضمن میں آچکی ہے۔ اب یہاں ایک بات قابل غور ہے کی تحلیل کے لئے صرف دوسرے شخص سے نکاح ہو

جانا کافی ہے، یا جماع بھی شرط ہے؟ تو اس میں تین اقوال ملتے ہیں:

(۱) حضرت سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں کہ: دوسرے شخص سے صرف نکاح کا ہو جانا تحلیل کے لیے کافی ہے۔

(۲) جمہور فقہاء فرماتے ہیں کہ: دوسرے شخص سے نکاح اور جماع دونوں کا ہونا تحلیل کیلئے کافی نہیں ہے؛ بلکہ وطی بھی ضروری ہے؛ البتہ انزال شرط نہیں۔

(۳) حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ: دوسرے شخص سے صرف نکاح اور جماع کا ہونا تحلیل کے لیے کافی نہیں؛ بلکہ انزال بھی اس کے لئے ضروری ہے۔

(عمدۃ القاری، ج:۲۰، ص:۲۳۶، مَن أجازَ الطلاق الثلاث)

حلالہ کی مکروہِ تحریمی صورت

اگر زوجِ ثانی نے شرط لگائی کہ جماع کے بعد طلاق دوں گا، یا عورت نے یہی شرط لگائی، یا زوجِ اوّل نے یہی شرط رکھی، یا زوجِ ثانی نے زوجِ اوّل سے رقم طے کر لی کہ اتنا پیسہ دو گے تو میں حلال کروں گا۔ یہ تمام صورتیں حلالہ کی مکروہ تحریمی ہیں؛ کیونکہ یہ مقاصد نکاح کے منافی ہیں، نکاح میں دوام ہوتا ہے اور یہاں عدمِ دوام کی شرط لگائی گئی ہے۔

جمہور ائمہ کے نزدیک یہ حلالہ صحیح نہیں اور جماع کے باوجود یہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہوگی؛ کیونکہ یہ شرائط فاسد ہیں، لہٰذا نکاح فاسد ہوگیا، تو حلال صحیح نہیں ہوا۔ ائمہ احناف فرماتے ہیں کہ: یہ فاسد شرائط خود فاسد ہو جائیں گی اور نکاح صحیح رہ جائے گا؛ کیونکہ شرائط فاسدہ سے عقدِ نکاح فاسد نہیں ہوتا۔ اور جب عقدِ نکاح صحیح ہوگیا تو حلالہ بھی صحیح ہوگیا، تو عورت زوجِ اوّل کے لئے حلال ہوگئی۔

(ب:۳۴) بَابُ الْمَرْأَةِ تُسَافِرُ قَبْلَ انْقِضَاءِ عِدَّتِهَا
کسی عورت کا عدت کے دوران سفر پر جانے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، حَدَّثَنَا حُمَيْدُ بْنُ قَيْسٍ الْمَكِّيُّ الأَعْرَجُ، عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ يَرُدُّ الْمُتَوَفَّى عَنهُنَّ أَزْوَاجُهُنَّ مِنَ الْبَيْدَاءِ يَمْنَعُهُنَّ مِن الْحَجِّ. قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا، لايَنْبَغِي لامْرَأَةٍ أَنْ تُسَافِرَ فِي عِدَّتِهَا حَتَّى تَنْقَضِيَ مِنْ طَلاقٍ كَانَتْ، أَوْ مَوْتٍ.

ترجمہ: سعید بن میبّبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے بیوہ عورتوں کو ''بیداء'' نامی مقام سے واپس کر دیا تھا۔ انہوں نے ان خواتین کو حج کرنے سے روک دیا تھا۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں کہ عورت کے لئے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنی عدت پوری کرنے سے پہلے سفر پر جائے؛ خواہ وہ عدت طلاق کی وجہ سے ہو یا شوہر کے انتقال کی وجہ سے ہو۔

حضرت عمر بن خطابؓ کا معمول

تشریح: مذکورہ روایت میں حضرت عمر بن خطابؓ کا ایک معمول بیان فرمایا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: آپ ان عورتوں کو حج کرنے کے لئے ساتھ نہیں لے جاتے، جن کے خاوند فوت ہو گئے ہوتے، انہیں مقام ''بیداء''

سے واپس کر دیتے؛ کیونکہ وہ ابھی عدت میں ہوتی تھیں۔ اس اثر کے بعد امام محمدؒ نے فرمایا کہ: عدتِ وفات اور عدتِ طلاق دونوں کا ایک ہی حکم ہے کہ عورت عدت کے دوران سفر پر نہیں جا سکتی۔

امام محمدؒ نے اسی بات کو دوسری جگہ یوں نقل فرمایا ہے کہ: جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے وہ گھر سے نہ نکلے، ہاں! اگر بہت ضروری ہو تو نکل سکتی ہے؛ لیکن بہر صورت اسے رات اپنے گھر آ کر بسر کرنی چاہیے۔ (کتاب الآثار، ص:۱۱۱)

جس عورت کو طلاقِ رجعی یا طلاقِ بتہ دی گئی ہو، اس کے لیے رات کے وقت یا دن کے وقت گھر سے نکلنا جائز نہیں ہے؛ البتہ بیوہ عورت دن کے وقت باہر نکل سکتی ہے اور رات کے کچھ حصے میں بھی باہر رہ سکتی ہے، لیکن وہ اپنے گھر کے باہر کہیں رات بسر نہیں کرے گی۔ جہاں تک طلاق یافتہ عورت کا تعلق ہے تو اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: ''تم انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ بھی نہ نکلیں، سوائے اس کے جب وہ واضح طور پر برائی کا ارتکاب کریں''۔

ایک قول کے مطابق یہاں ''فاحشہ'' سے مراد گھر سے نکلنا ہے۔ اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد زنا کرنا ہے؛ البتہ ان پر حد قائم کی جائے تو وہ باہر نکلے گی۔

جہاں تک بیوہ عورت کا تعلق ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے خرچ کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا، اس لیے وہ دن کے وقت باہر نکلنے کی محتاج ہوگی؛ تاکہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکے؛ لیکن رات بہر حال شوہر کے گھر میں آ کر گزارے۔

طلاق یافتہ عورت کو کسبِ معاش کے لیے بھی نکلنے کی اجازت نہیں ہے؛ کیونکہ مطلقہ کے دورانِ عدت کا خرچہ شوہر کے ذمہ ہوتا ہے؛ البتہ اگر اس نے اپنی عدت کے دوران کے خرچ کے عوض خلع حاصل کر لیا ہو، تو ایک قول کے مطابق وہ دن کے

وقت باہر نکل سکتی ہے اور ایک قول کے مطابق پھر بھی نہیں نکلے گی؛ کیونکہ اس نے خود اپنے حق کو ساقط کیا ہے، لہٰذا اس کی وجہ سے وہ حق باطل نہیں ہوگا، جو اس کے ذمہ لازم ہے۔ ان تمام تر تفصیل کی روشنی میں خلاصہ یہ نکلا کہ بیوہ عورتیں جب تک عدت کے دوران ہیں سفر پر نہیں جا سکتیں۔

(ب:۳۴) بَابُ الْمُتعةِ

متعہ کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا الزُّهْرِيُّ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ، وَالْحَسَنِ ابْنَيْ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ، عَنْ أَبِيهِمَا، عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ جَدِّهِمَا، أَنَّهُ قَالَ لابْنِ عَبَّاسٍ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ يَوْمَ خَيْبَرَ، وَعَنْ أَكْلِ لُحُومِ الْحُمُرِ الإِنْسِيَّةِ.

ترجمہ: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بات منقول ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے فرمایا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے سے منع فرمایا۔ نیز آپ نے گھروں میں رہنے والے گدھوں کا گوشت کھانے سے بھی منع فرمایا۔ (گھروں میں رہنے والے گدھوں سے وہی گدھے مراد ہیں جو لوگوں کے پاس رہتے ہیں، بار برداری وغیرہ کے کام آتے ہیں، جنگلی گدھا جس کو "گورخر" کہتے ہیں حلال ہے، اس کا گوشت کھایا جا سکتا ہے)۔

متعہ کی ممانعت

تشریح: نَهَى النَّبِيُّ عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ: کسی متعینہ مدت کے لیے،

متعینہ رقم کے عوض نکاح کرنے کا نام ''متعہ'' ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی عورت سے یہ کہہ دے: میں دو سال کے لیے، یا ایک ماہ کیلئے، بعوض اتنی رقم تم سے نکاح کرتا ہوں۔

گویا متعہ ایک سازشی نکاح ہے۔ نہ اس میں گواہ ہے، نہ اولیاء کی اجازت ہے، نہ کفو اور خاندان کا سوال ہے، نہ ایجاب ہے، نہ قبول ہے۔ متعہ جاہلیت کے باطل نکاحوں میں سے ایک نکاح تھا۔ ابتدائے اسلام میں یہ اسی طرح چلتا رہا، کوئی نیا حکم نہیں آیا تھا، جنگ خیبر کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی، پھر فتح مکہ کے بعد جنگ اوطاس کے موقع پر تین دن کی اجازت کے بعد قیامت تک کے لیے متعہ کو مسلمانوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام قرار دیا گیا؛ گویا نکاحِ متعہ کی دو مرتبہ اباحت آئی اور دو مرتبہ حرمت فرمائی اور پھر ہمیشہ کے لئے حرام ٹھہرا۔ ابوداؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ متعہ کی حرمت حجۃ الوداع کے موقع پر آئی تھی، ممکن ہے کہ یہ اعلان حرمت کے بعد مزید تشہیر و تفہیم و تعمیم کے لئے کیا گیا ہو۔ بہر حال متعہ نکاح کے اغراض کے سراسر منافی ہے اور بے شمار مفاسد کا منبع ہے۔ مثلاً: ایک عورت نے ایک ماہ میں تین شوہروں سے دس دس دن کے لیے متعہ کیا، اور پھر ایک سال کے بعد بچہ پیدا ہو گیا، تو اب تین شوہروں کا اشتراک عمل ہے، تو جو بچہ پیدا ہوا ہے یہ بچہ کس کا ہے؟ کس کا وارث بنے گا؟ کون اس کا سرپرست اور وارث ہوگا؟ متعہ کے اس عمل بد سے تلبیس نسل اور ابطال میراث لازم آتا ہے۔

لہٰذا اجماعِ اُمت کے فیصلہ سے متعہ حرام ہے۔ فقہ اربعہ کے اتفاق سے متعہ حرام ہے۔ شرافت کے اُصولوں سے متعہ حرام ہے۔ صاحب ہدایہ نے ہدایہ میں

امام مالکؒ کی طرف متعہ کے جواز کی نسبت کی ہے؛ لیکن اس نسبت میں غلطی ہوگئی ہے؛ کیونکہ مؤطا امام مالک میں اس کو ناجائز لکھا ہے۔

روافض: شیعہ روافض اس سازشی نکاح اور بے غیرتی سے لبریز عمل کو جائز کہتے ہیں اور اس کا بڑا ثواب بیان کرتے ہیں اور اس کے جواز پر قرآن کی آیت کو دلیل کے طور پر پیش کر کے کہتے ہیں کہ: "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَآتُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ" میں استمتاع کا ذِکر ہے، جو متعہ سے ماخوذ ہے، اور أُجُوْرَهُنَّ میں اُجرت کا ذکر ہے، مہر کا ذکر نہیں، لہٰذا متعہ مستقل حکم ہے۔ نیز روافض حضرت ابن عباسؓ کی طرف متعہ کے جواز کا قول منسوب کرتے ہیں اور مشکوٰۃ ص: ۲۷۳ پر ابن مسعودؓ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔

جمہور فرماتے ہیں کہ: قرآن کی آیت: "فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ" حرمت متعہ پر یہ آیت نص قطعی ہے۔ مسلم شریف کی ایک روایت حرمت متعہ پر اسی طرح واضح دلیل ہے: وَ إِنَّ اللّٰهَ قد حرَّم ذالك إلٰی یومِ القِیامَةِ. اسی طرح مشکوٰۃ ص: ۲۷۰ پر سلمہ بن اکوعؓ کی روایت ہے جو متعہ کی حرمت پر دال ہے۔ اجماعِ اُمت بھی حرمت متعہ پر قائم ہے۔

الجواب: جمہور، شیعہ شنیعہ اور رافضہ مرفوضہ کی دلیل قرآنی آیت کا یہ جواب دیتے ہیں کہ "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ" کی آیت سے پہلے اور آیت کے بعد نکاح کا ذکر ہے، لہٰذا "أُجُوْرَهُنَّ" سے مراد مہر ہے۔ اور "اسْتَمْتَعْتُمْ" سے نکاح مراد ہے۔ "اُجور" کا اطلاق مہر پر ہوتا ہے۔ جیسے قرآن میں ہے: "فَانْكِحُوْهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَآتُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ". یہاں "اُجور" سے مزدوری مراد نہیں؛ بلکہ حق بضعہ کا معاوضہ مراد ہے، جو مہر ہے۔

باقی ابن مسعودؓ اگر کسی وقت ابتداء میں متعہ کے قائل تھے تو ہوں گے، بعد میں آپ نے رجوع کرلیا تھا۔ اور حضرت ابن عباسؓ اگرچہ جواز کے قائل تھے؛ لیکن جب حضرت علیؓ نے آپ کو سختی سے منع فرمادیا تو آپ نے رجوع کیا اور فرمایا: فَکُلُّ فَرجٍ سِواهُما فَهُوَ حَرامٌ".

شیعہ روافض پر تعجب ہے کہ حضرت علیؓ نے جس متعہ سے سختی سے منع کردیا ہے، شیعوں کا محبوب ترین مشغلہ یہی متعہ بن کررہ گیا ہے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا الزُّهْرِيُّ، عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ، أَنَّ خَوْلَةَ بِنْتَ حَكِيمٍ دَخَلَتْ عَلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، فَقَالَتْ: إِنَّ رَبِيعَةَ بْنَ أُمَيَّةَ اسْتَمْتَعَ بِامْرَأَةٍ مُوَلَّدَةٍ فَحَمَلَتْ مِنْهُ، فَخَرَجَ عُمَرُ فَزِعًا يَجُرُّ رِدَاءَهُ، فَقَالَ: هَذِهِ الْمُتْعَةُ لَوْ كُنْتُ تَقَدَّمْتُ فِيهَا لَرَجَمْتُ.

ترجمہ: عروہ بن زبیرؓ بیان کرتے ہیں کہ خولہ بنت حکیم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور بولی: ربیعہ بن امیہ نے فلاں عورت کے ساتھ متعہ کیا ہے، جس کے نتیجہ میں وہ عورت حاملہ ہوگئی ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی چادر کو کھینچتے ہوئے غصہ کے عالم میں وہاں سے نکلے اور بولے: یہ تو متعہ ہے۔ اگر میں نے اس کے بارے میں پہلے اعلان کردیا ہوتا تو میں اس کو سنگسار کردیتا۔

تشریح: اس اثر میں متعہ کے ناجائز ہونے کے سلسلے میں ربیعہ بن اُمیہ کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ خولہ بنت حکیم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ ربیعہ نے ایک عورت سے متعہ کیا ہے جس کی بنا پر وہ عورت حاملہ ہوگئی ہے۔ یہ بات سن کر حضرت عمر بن خطابؓ غصہ سے اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے

باہر تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ: یہ متعہ ہے، اگر میں اس کی حرمت کا اعلان پہلے کر چکا ہوتا تو میں اس کو رجم کر دیتا۔

تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا غصہ سے پیش آنا اس بات کی دلیل ہے کہ متعہ درست نہیں ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: اَلْمُتعَةُ مَکْرُوهَةٌ، فَلاَ یَنْبَغِی، فَقَدْ نَهٰی عَنْهَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیمَا جَاءَ فِی غَیْرِ حَدِیثٍ، وَلاَ اِثْنَیْنِ، وَقَوْلُ عُمَرَ: لَوْکُنْتُ تَقَدَّمْتُ فِیهَا لَرَجَمْتُ، إِنَّمَا نَضَعُهُ مِنْ عُمَرَ عَلَی التَّهْدِیدِ، وَهٰذَا قَوْلُ أَبِی حَنِیفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا رِحِمَهُم اللّٰهُ تَعالٰی عَلَیهِم.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں: متعہ مکروہ ہے۔ اسے نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چار مرتبہ نہیں بلکہ بارہا اس سے منع فرمایا ہے۔ (حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ) حضرت عمر کے اس قول کو ہم تہدید پر محمول کرتے ہیں۔ یہی قول امام ابوحنیفہ اور اکثر فقہاء کا ہے۔

حضرت عمر بن خطابؓ کا قول اور حدیث مرفوع میں تعارض

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے فرمان اور حدیث مرفوع کے درمیان پیدا ہونے والے تعارض دور فرما رہے ہیں۔

امام محمدؒ نے فرمایا کہ متعہ مکروہ ہے؛ البتہ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ متعہ اُن کے نزدیک مکروہِ تنزیہی ہے، اور اس کے کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، جب کہ امام محمدؒ کے نزدیک مکروہ کا لفظ حرام کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس لئے ان کے

نزدیک متعہ حرام ہے۔

روایت کے الفاظ "فِيمَا جَاءَ فِي غَير حدِيث ولاَ اثنَين" سے مراد بکثرت احادیث ہیں۔ اور اس روایت کی آخری بات کہ: "حضرت عمرؓ نے فرمایا: اگر میں نے اس کا اعلان کر دیا ہوتا تو اسے رجم کر دیتا" کو تہدید پر اس لئے محمول کیا گیا کیونکہ متعہ دو دفعہ حلال اور دو دفعہ حرام ہوا تھا، اس کے آخری حکم حرمت سے ابھی تمام مسلمان باخبر نہ تھے؛ کیونکہ اس دور میں مختصر وقت میں کسی حکم کا اطرافِ عالم میں پہنچ جانا عادۃً مشکل تھا اور حدودِ شرعیہ میں اگر شبہہ موجود ہو تو اُن کا نفاذ نہیں ہوتا، اس لیے حضرت عمرؓ کے ارشاد کو حقیقت نہیں؛ بلکہ تہدید پر محمول کیا گیا ہے۔

ابن ربیعؒ نے نکاحِ متعہ کو "غرائب شریعت" اس لیے کہا کہ اس دور میں اس کی حرمت کا عام ہونا اور ہر جگہ اس کی خبر کا پہنچ جانا ممکن نہیں تھا۔

(ب:۳۵) بَابُ الرَّجل تَكونُ عِندہ امرأتان فَيُؤثِرُ اِحداهُما علَى الأخرىٰ

دو بیویوں میں سے ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا ابْنُ شِهَابٍ، عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ أَنَّهُ تَزَوَّجَ ابْنَةَ مُحَمَّدِ بْنِ سَلَمَةَ، فَكَانَتْ تَحْتَهُ، فَتَزَوَّجَ عَلَيْهَا امْرَأَةً شَابَّةً فَآثَرَ الشَّابَّةَ عَلَيْهَا، فَنَاشَدَتْهُ الطَّلاقَ فَطَلَّقَهَا وَاحِدَةً، ثُمَّ أَمْهَلَهَا حَتَّى إِذَا كَادَتْ تَحِلُّ ارْتَجَعَهَا، ثُمَّ عَادَ، فَآثَرَ الشَّابَّةَ، فَنَاشَدَتْهُ الطَّلاقَ، فَطَلَّقَهَا وَاحِدَةً، ثُمَّ أَمْهَلَهَا حَتَّى كَادَتْ أَنْ تَحِلَّ ارْتَجَعَهَا، ثُمَّ عَادَ

فَآثَرَ الشَّابَّةَ، فَنَاشَدَتْهُ الطَّلَاقَ، فَقَالَ: مَا شِئْتِ إِنَّمَا بَقِيَتْ وَاحِدَةٌ، فَإِنْ شِئْتِ اسْتَقْرَرْتِ عَلَى مَا تَرَيْنَ مِنَ الْأَثَرَةِ، وَإِنْ شِئْتِ طَلَّقْتُكِ، قَالَتْ: بَلْ أَسْتَقِرُّ عَلَى الْأَثَرَةِ، فَأَمْسَكَهَا عَلَى ذٰلِكَ، وَلَمْ يَرَ رَافِعٌ أَنَّ عَلَيْهِ فِي ذٰلِكَ إِثْمًا حِينَ رَضِيَتْ أَنْ تَسْتَقِرَّ عَلَى الْأَثَرَةِ.

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیج کے بارے میں یہ بات منقول ہے کہ انہوں نے محمد بن سلمہ کی صاحبزادی کے ساتھ شادی کرلی۔ انہوں نے ایک اور نوجوان خاتون سے بھی شادی کرلی، ان کی توجہ اس نوجوان بیوی کی طرف زیادہ تھی، تو ان کی پہلی اہلیہ نے طلاق کا مطالبہ کردیا، انہوں نے اس خاتون کو ایک طلاق دے دی؛ لیکن اسے اپنے پاس روکے رکھا، جب اُس عورت کی عدت پوری ہونے لگی تو انہوں نے پھر اس سے رجوع کرلیا، اس دوران بھی ان کی توجہ اپنی نوجوان بیوی کی طرف ہی مبذول رہی۔ اُن کی پہلی بیوی نے پھر طلاق کا مطالبہ کردیا۔ انہوں نے پھر اسے ایک طلاق دے دی اور اسے یوں ہی رہنے دیا، یہاں تک کہ جب اس عورت کی عدت پوری ہونے لگی تو اس سے رجوع کرلیا؛ لیکن اُن کی توجہ پھر بھی اپنی نوجوان بیوی کی طرف ہی مائل رہی، اُن کی پہلی بیوی نے پھر اُن سے طلاق کا مطالبہ کیا، تو حضرت رافع نے ان سے کہا: اگر تم چاہتی ہو، تو ٹھیک ہے، اب صرف ایک طلاق باقی رہ گئی ہے، اگر تم اسی طرح یہاں رہنا چاہتی ہو کہ میں دوسری بیوی کی طرف زیادہ متوجہ رہوں تو ٹھیک ہے، اگر تم چاہتی ہو تو میں تمہیں طلاق دیدیتا ہوں۔ تو اس خاتون نے کہا کہ: ٹھیک ہے، آپ اُسے مجھ پر ترجیح دیں، میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گی، تو حضرت رافعؓ نے اسے اسی طرزِ عمل کے ساتھ اپنے پاس رہنے دیا، کیونکہ اس

خاتون نے ان کے پاس رکنے کا فیصلہ کیا تھا، اگر چہ وہ ان کے ساتھ ترجیحی سلوک کریں۔ (راوی کہتے ہیں) حضرت رافع نے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا کہ جب اس عورت نے ترجیحی سلوک کے ساتھ ان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔

تشریح: حضرت رافع بن خدیج صحابیِ رسول ہیں، اس لئے آپ کے بارے میں جو واقعہ ذکر ہوا اس کو ظاہری معنی میں لے کر بدگمانی کرنا قطعاً درست نہیں ہے؛ بلکہ اس کی ایسی تاویل کہ جس سے اُن پر کوئی حرف نہ آئے، ضروری ہے۔ علامہ زرقانی نے فرمایا کہ: اُن کا نئی بیوی کی طرف جھکاؤ وہ نہ تھا جو ممنوع ہے، یعنی کھانے پینے اور رہن سہن کے معاملے میں پہلی بیوی پر فوقیت دینا؛ بلکہ یہ جھکاؤ اور میلان غیر اختیاری امر میں تھا، یعنی محبت اور دِلی رُجحان نئی بیوی کی طرف زیادہ تھا۔

ماقبل میں یہ بات آچکی ہے کہ ایک سے زائد بیویوں کے درمیان اُمورِ اختیار یہ میں عدل وانصاف ضروری ہے۔ اور حضرت رافع بن خدیج کا واقعہ اسی موضوع کی ایک مثال ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بیوی اگر اپنے حقوق سے دستبردار ہو جاتی ہے اور دوسری بیوی کو عطا کر دیتی ہے تو اس میں کوئی گناہ اور حرج نہیں؛ کیونکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے اس کی تائید ملتی ہے، چنانچہ اُمّ المومنین سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری اُمّ المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دی تھی اور حضورؐ اس کے مطابق عمل کرتے رہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک بیوی اگر اپنے حقوق میں سے کچھ حقوق اپنی ساتھی دوسری بیوی کو دے دیتی ہے تو یہ جائز ہے۔ اور قرآن کریم نے میاں بیوی کے درمیان اختلاف کے وقت صلح کا جو طریقہ ارشاد فرمایا یہ دستبرداری اسی ضمن میں آتی ہے۔

اس لیے اگر رافع بن خدیج کی پہلی بیوی نے اپنی خوشی کے ساتھ یہ تسلیم کرلیا

کہ نئی بیوی کی طرف آپ کا میلان اور جھکاؤ اگر چہ مجھے کھٹکتا تھا اور اس کی وجہ سے میں طلاق کا مطالبہ بھی کر چکی ہوں؛ لیکن اب میں طلاق کا مطالبہ کرنے کے بجائے آپ کی زوجیت میں رہنا پسند کرتی ہوں اور اس جھکاؤ پر اعتراض نہ کروں گی؛ بلکہ اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کرتی ہوں۔

اسی لئے حضرت رافع بن خدیج اس کو گناہ نہیں سمجھتے تھے؛ کیونکہ یہ عدل و انصاف کے خلاف نہیں ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: لا بَأْسَ بِذَلِكَ إِذَا رَضِيَتْ بِهِ الْمَرْأَةُ، وَلَهَا أَنْ تَرْجِعَ عَنْهُ إِذَا بَدَا لَهَا، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ: اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ جب عورت اس بات سے راضی ہو تو ایسا کیا جا سکتا ہے؛ تاہم اس عورت کو اس بات کا حق حاصل ہوگا کہ جب مناسب سمجھے اس بات سے رجوع کر لے۔ امام ابو حنیفہ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی عورت اپنے حقوق سے دستبردار ہو جاتی ہے اور اپنا حق دوسری بیوی کو عطا کر دیتی ہے تو ایسا کر سکتی ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن پھر بھی عورت کو اس بات کا حق ہوگا کہ جب بھی مناسب سمجھے اپنی بات سے رجوع کر سکتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ: مثلاً بیوی دباؤ کی وجہ سے ایک رات پر راضی ہو گئی تھی اور مرد دوسری بیوی کے پاس تین دن رہتا تھا لیکن بعد میں اگر پہلی بیوی کہنے لگے کہ: میرے پاس بھی تین دن رہو، ورنہ تو میں چلی جاؤں گی، تو اسے اس کا اختیار ہوگا۔ امام ابو حنیفہ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

(ب:۳٦) بَابُ اللِّعَان

لعان کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، أَنَّ رَجُلا لاعَنَ امْرَأَتَهُ فِي زَمَانِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَانْتَفَى مِنْ وَلَدِهَا، فَفَرَّقَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَهُمَا، وَأَلْحَقَ الْوَلَدَ بِالْمَرْأَةِ، قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ، إِذَا نَفَى الرَّجُلُ وَلَدَ امْرَأَتِهِ، وَلاعَنَ فُرِّقَ بَيْنَهُمَا، وَلَزِمَ الْوَلَدُ أُمَّهُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا رَحِمَهُمُ اللَّهُ تَعَالَى.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانۂ اقدس میں ایک شخص نے اپنی بیوی کے ساتھ لعان کر لیا اور اس عورت سے ہونے والے بچے کی نفی کر دی، تو نبی اکرم ﷺ نے ان دونوں کے درمیان علیحدگی کروادی اور بچے کو اس کی ماں کے ساتھ لاحق کر دیا۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں: جب کوئی شخص اپنی بیوی کے بچے کی نفی کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ لعان کر لیتا ہے، تو میاں بیوی کے درمیان علیحدگی ہو جائے گی اور بچہ ماں کی طرف منسوب ہوگا۔

امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: اس باب میں لعان کا تذکرہ کیا گیا ہے اور چونکہ لعان کا مسئلہ ایک طویل اور لمبی بحث کا حامل ہے، اسی لئے لعان کے بارے میں چند باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

(۱) لعان کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم (۲) لعان کیسے وجود میں آیا؟
(۳) لعان کی حقیقت (۴) نفس لعان سے میاں بیوی کے درمیان تفریق ہوگی یا نہیں؟ (۵) مرد اگر اپنی بیوی کو کسی اجنبی کے ساتھ حالت زنا میں پائے تو کیا وہ اسے قتل کر سکتا ہے؟

(۱) لعان کا لغوی معنیٰ

لعان — فعال کے وزن پر بابِ مفاعلہ کا مصدر ہے۔ اس کا مادہ لعنت ہے۔ اور چونکہ میاں بیوی ایک دوسرے کو رحمت خداوندی سے باہر کرتے ہیں، یا رشتۂ زوجیت سے ایک دوسرے کو دور کرتے ہیں، اس لئے لغوی اعتبار سے ان کو ''لعان'' کہہ دیا گیا۔ نیز ان قسموں میں لعنت کا لفظ صراحتاً موجود ہے، اس لیے بھی اس معاملہ کا نام ''لعان'' رکھا گیا ہے۔

لعان کا اصطلاحی مفہوم

لعان کی اصطلاحی تعریف میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔ ائمہ احناف کے نزدیک لعان کی تعریف اس طرح ہے: ''شَهاداتٌ مُؤكَّدات بالإيمان مَقْرُونة باللَّعن''. (ہدایہ، ج:۲، ص:۴۱۶) یعنی قسموں کے ساتھ تاکید شدہ گواہی کا نام ''لعان'' ہے، لہٰذا لعان حنفیہ کے ہاں شہادت کی قسم سے ہے، اسی لئے لعان میں شہادت کی تمام شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، چنانچہ نابالغ اور مجنون میں چونکہ شہادت کی اہلیت نہیں، لہٰذا وہ لعان بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ اسی طرح کافر اور مسلمان کا آپس میں لعان نہیں۔ اسی طرح محدود فی القذف بھی لعان نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ سب لوگ شہادت کی اہلیت نہیں رکھتے، تو لعان کے اہل بھی نہیں ہیں۔

جمہور کے نزدیک لعان کی تعریف یہ ہے: ”إیمَان مُؤکَّدات بلَفظ الشَّهادة“ ان کے ہاں لعان باب الیمین سے ہے، چنانچہ ان کے ہاں جو کوئی یمین اور قسم کا اہل ہوگا وہ لعان کا بھی اہل ہوگا، تو ان کے ہاں محدود فی القذف اور غیر مسلم لعان کر سکتے ہیں۔

(۲) لعان کیسے وجود میں آیا؟

لعان کا حکم شعبان نو ہجری میں نازل ہوا تھا، چنانچہ ”عمدۃ القاری لشرح البخاری“ جلد:۲، ص:۲۹۰ باب اللعان پر مذکور ہے: کَانَ أَوَّل رَجُلٍ لَعَنَ فِي الإسلام هِلالُ بن أمَيَّة. یعنی ”ہلال بن امیہ“ وہ پہلا شخص ہے جس نے مسلمانوں میں سب سے پہلے لعان کیا۔ لیکن مشکوٰۃ صفحہ ۲۷۱ پر عویمر عجلانی کی روایت میں ”قَد أنزلَ فِيكَ“ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ لعان کا حکم ان کے بارے میں اترا تھا، لیکن علماء نے یہ تطبیق دی ہے کہ لعان کا حکم عام ہے، تو ہر ایک کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تیرے متعلق یہ حکم آیا ہے، یا اصل حقیقت یہ ہے کہ حکم تو عویمر کے متعلق اُترا تھا؛ مگر اس پر عمل ہلال بن اُمیہ نے پہلے کیا، یا ممکن ہے دونوں کے متعلق آیت نازل ہوئی ہو۔

(۳) لعان کی حقیقت

لعان کی صورت اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب شوہر بیوی پر زنا کی تہمت لگائے اور بیوی انکار کرے اور کہہ دے کہ: تم نے مجھ پر جھوٹا بہتان لگایا ہے، اب اس کو ثابت کرو۔ اس طرح عورت اپنے شوہر کے خلاف عدالت میں جا کر قاضی کے سامنے فریاد کرے، قاضی شوہر کو بلائے اور دعویٰ کے ثبوت کے لئے چار گواہ

مانگے، اگر بہتان ثابت ہو گیا تو عورت پر رجم کا حکم نافذ ہوگا۔ اور اگر شوہر چار گواہ پیش نہ کر سکا تو ان دونوں میں لعان کا حکم نافذ ہوگا۔

لعان کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے شوہر کہے گا کہ: "میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے اس عورت پر زنا کی جو تہمت لگائی ہے میں اس میں سچا ہوں"۔ چار دفعہ عورت کی طرف اشارہ کر کے شوہر یہ قسم کھائے اور پانچویں بار اس طرح قسم کھائے کہ: "اگر میں اس الزام میں جھوٹا ہوں، تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو"۔

پھر اس کے بعد عورت اس طرح قسم کھائے کہ: "میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ میرے شوہر نے مجھ پر زنا کی جو تہمت لگائی ہے اس میں یہ جھوٹا ہے"۔ چار دفعہ اس طرح قسم کھانے کے بعد پانچویں مرتبہ عورت کہے کہ: "اس نے مجھ پر زنا کی جو تہمت لگائی ہے، اگر اس میں یہ سچا ہے تو مجھ پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہو"۔

(۴) لعان کے نتیجہ میں فقہاء کا اختلاف

میاں بیوی کے درمیان جب لعان کا عمل مکمل ہو جائے تو اس کے بعد کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ اس میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے، اس سلسلے میں دو مذاہب ہیں:

ائمہ ثلاثہ کا مذہب: ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ لعان کے بعد میاں بیوی کے درمیان خود بخود فرقت اور جدائی آ جائے گی، قاضی کی تفریق اور اس کے فیصلہ کی ضرورت نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہ کا مذہب: حنفیہ فرماتے ہیں کہ صرف لعان کرنے سے میاں بیوی میں تفریق نہیں آئے گی؛ بلکہ قضائے قاضی کی ضرورت پڑے گی۔

ائمہ ثلاثہ کی دلیل: ائمہ ثلاثہؒ نے حضرت ابن مسعود اور حضرت عمر فاروق

رضی اللہ عنہما کی ایک روایت اور اثر سے استدلال کیا ہے جس کو عبدالرزاق مصنف میں نقل کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: "الْمُتلاعِنان لَا يَجتمِعَان أبدًا".
طریقۂ استدلال اس طرح ہے کہ اس روایت میں بتایا گیا ہے کہ لعان کرنے کے بعد میاں بیوی ہرگز اکٹھے نہیں رہ سکتے ہیں، اگر لعان سے فرقت نہیں آئی تو اس سے میاں بیوی کے درمیان اجتماع لازم آئیگا جو اس روایت کی تصریح کے خلاف ہے۔
جواب: "الْمُتلاعِنان لَا يَجتمِعَان أبدًا" کا مطلب یہ ہے کہ لعان کی تکمیل کے بعد میاں بیوی کی جدائی ہمیشہ کے لئے ہے۔ اور اس مطلب میں نہ کسی کو اختلاف ہے اور نہ یہ مطلب کسی کے خلاف ہے۔
حنفیہ کی دلیل: حنفیہ نے حضرت عویمر عجلانی کی روایت سے استدلال کیا ہے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں: "كَذبتُ عَليهَا إنْ أمسكتُها، فَطلَّقَها ثلاثًا". اس روایت سے دو باتیں ثابت ہوئیں: ایک یہ کہ لعان کے بعد تین طلاقیں دے دی گئیں، اگر لعان سے خود بخود فرقت واقع ہو جاتی تو تین طلاق کی کیا ضرورت تھی؟ دوسری بات یہ بھی واضح ہوگئی کہ ایک ساتھ تین طلاقیں نافذ ہو جاتی ہیں۔ تیسری بات یہ واضح ہوگئی کہ حضرت عویمر خود فرماتے ہیں کہ: اگر اب لعان کے بعد میں نے اس عورت کو اپنے پاس رکھا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے اس عورت پر جھوٹ بولا، اس لئے میں اس کو طلاق دیتا ہوں۔ یہ بیان اس کی واضح دلیل ہے کہ صرف لعان سے فرقت واقع نہیں ہوتی ہے۔ اگر اس سے فرقت ہو جاتی تو عویمر خود یہ بیان نہیں دے سکتے تھے۔
دوسری دلیل: حنفیہ نے ابوداؤد کی ایک حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جو عویمر عجلانی ہی کا قصہ ہے۔ اس میں یہ الفاظ آئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ

لعان کے بعد تفریق کرنا مسنون طریقہ ہے۔ ملاحظہ ہو: ''فَمضتِ السُّنَّةُ بعدُ فِي المُتلاعِنِين أن يفرقَ بينهُما، ثُمَّ لاَ يجتمِعَان أبدًا''.

(ابوداؤد شریف، ج:۱، ص:۳۰٦)

ان دونوں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف لعان تفریق کا سبب نہیں ہے؛ بلکہ قاضی کی مداخلت کی ضرورت ہے۔

(۵) زنا میں قتل کرنے کا حکم

اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو حالت زنا میں خود دیکھا تو کیا وہ اسے قتل کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں کافی تفصیل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی نے اپنی بیوی کو حالت زنا میں دیکھ لیا اور جوشِ غیرت میں آ کر دونوں کو قتل کر دیا تو اُمید ہے کہ عند اللہ ماخوذ نہیں ہوگا۔ فقہاء نے یہ جملہ لکھا ہے: ''ولَهُ قتلُهُما'' کہ شوہر دونوں کو قتل کر سکتا ہے، لیکن چونکہ ظاہری شریعت کے قواعد کی اس اقدام سے خلاف ورزی ہوئی، اس لیے جمہور علماء فرماتے ہیں کہ شرعی عدالت میں اس شخص کو لا کر قصاص میں مارا جائے گا۔

(ب:۳۷) بَابُ مُتعَةِ الطَّلاَقِ

طلاق کے بعد بیوی کو کچھ دینے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، حَدَّثَنَا نَافِعٌ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: لِكُلِّ مُطَلَّقَةٍ مُتْعَةٌ إِلاَّ الَّتِي تُطَلَّقُ، وَقَدْ فُرِضَ لَهَا صَدَاقٌ، وَلَمْ تُمَسَّ فَحَسْبُهَا نِصْفُ مَا فُرِضَ لَهَا.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں ہر طلاق یافتہ عورت کو مال ومتاع دیا جائے گا، سوائے اس عورت کے کہ جسے ایسی صورت میں طلاق دی گئی ہو کہ اس کے لیے مہر مقرر ہو چکا ہو اور شوہر نے اس کے ساتھ صحبت نہ کی ہو، ایسی عورت کے لیے طے شدہ مہر کا نصف حصہ ہوگا۔

متعہ سے کیا مراد ہے؟

تشریح: اس باب میں مطلقہ کے لیے متعہ کا مسئلہ بیان فرمایا ہے۔
''متعہ'' سے مراد وہ اشیاء ہیں جو طلاق دینے کے بعد خاوند اپنی بیوی کو حسن سلوک کے طور پر دیتا ہے۔ اس سلسلے میں چند امور پیش نظر رکھنے چاہییں:

جس عورت کو بطور متعہ کچھ دینا ہے اس کا بوقت نکاح حق مہر مقرر کیا گیا تھا یا نہیں؟ اور مقرر ہونے کی صورت میں اس کو طلاق وطی سے قبل ہوئی یا وطی کے بعد؟ اور مقرر نہ ہونے کی صورت میں بھی طلاق قبل وطی یا بعد وطی ہوئی؟ ان صورتوں کے پیش نظر متعہ کا مسئلہ مختلف ہوگا۔

ان تمام صورتوں میں صرف ایک صورت میں متعہ واجب ہوگا اور بذریعہ قاضی اس کے خاوند کو متعہ دینے پر مجبور کیا جائے گا، وہ یہ کہ بوقت نکاح اس کا حق مہر مقرر نہ ہوا تھا اور قبل وطی اس کو طلاق ہوگئی، اس کو متعہ لازماً ملے گا۔ یہ حضراتِ حنفیہ کے نزدیک ہے۔

اس کے علاوہ بقیہ صورتوں میں تفصیل یوں ہے کہ: اگر حق مہر مقرر تھا اور طلاق وطی سے قبل ہوگئی تو متعہ کے بجائے نصف حق مہر ادا کرنا پڑے گا۔ اور اگر وطی کے بعد طلاق ہوئی تو پورا حق مہر دینا لازمی ہے۔ اور اگر حق مہر مقرر نہ ہوا اور طلاق وطی کے بعد ہوئی تو حق مہر مثلی دینا پڑے گا۔ اور اگر وطی سے قبل طلاق ہوئی تو متعہ دینا لازمی ہے۔

اس کے علاوہ دیگر صورتوں میں متعہ دینا جائز اور حسن معاشرت کا آئینہ دار ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ، وَلَيْسَتِ الْمُتْعَةُ الَّتِي يُجْبَرُ عَلَيْهَا صَاحِبُهَا إِلا مُتْعَةٌ وَاحِدَةٌ، هِيَ مُتْعَةُ الَّذِي يُطَلِّقُ امْرَأَتَهُ قَبْلَ أَنْ يَدْخُلَ بِهَا، وَلَمْ يَفْرِضْ لَهَا، فَهَذِهِ لَهَا الْمُتْعَةُ وَاجِبَةٌ، يُؤْخَذُ بِهَا فِي الْقَضَاءِ، وَأَدْنَى الْمُتْعَةِ لِبَاسُهَا فِي بَيْتِهَا: الدِّرْعُ وَالْمِلْحَفَةُ وَالْخِمَارُ، وَهُوَ قَولُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا رَحِمَهُمُ اللَّهُ.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں، مال ومتاع کے حوالے سے شوہر کو مجبور نہیں کیا جائے گا، صرف وہ ایک صورت میں ادائیگی کرے گا کہ جب کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ صحبت کرنے سے پہلے اسے طلاق دے دیتا ہے اور اس نے اس عورت کا کوئی مہر مقرر نہ کیا ہو، تو اب ایسی صورت میں اس عورت کو مال ومتاع کے طور پر کوئی ادائیگی کی جائے گی اور قاضی کے فیصلے کے اعتبار سے اُسے وصول کیا جائے گا۔ اس مال ومتاع کی کم سے کم مقدار یہ ہے کہ عورت کے گھر میں پہننے کا لباس اسے دیا جائے جس میں: چادر، قمیص، اور تہبند ہوگا۔ امام صاحبؒ اور اکثر فقہاءؒ اسی بات کے قائل ہیں۔

متعہ دینا کب واجب، کب مستحب ہے؟

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ نے مذکورہ قول میں اس بات کو بیان کیا ہے کہ مطلقہ کو کب متعہ دینا واجب ہے؟ اور کب مستحب ہے؟ چنانچہ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مطلقہ عورت کی چار قسمیں ہیں:

(۱) غیر مدخول بها غیر مُسمّٰی لها المهر

(۲) مدخول بها مسمّٰی لها المهر

(۳) غیر مدخول بها مسمی لها المهر

(۴) مدخول بها غیر مسمی لها المهر.

ان چار صورتوں میں سے پہلی مطلقہ کو متعہ دینا واجب ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: "اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً وَمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ". آیت مذکورہ میں "مَتِّعُوْهُنَّ" امر کا صیغہ ہے جو مطلقہ غیر مدخول بہا غیر مسمی لہا المہر کے لئے وجوبِ متعہ پر دلالت کر رہا ہے۔ اور امام محمدؒ نے متعہ کے بارے میں تین کپڑوں کا ذکر فرمایا۔ اور اس سے مراد وہ کپڑے ہیں جو عورت اپنے گھر میں پہنتی ہے۔ ایک: کرتا۔ دوم: اوڑھنی۔ اور سوم: چادر ہے۔

دوسری صورت والی مطلقہ کو کوئی متعہ نہیں ملے گا، چنانچہ اللہ کا فرمان ہے: "وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ". بقیہ دونوں صورتوں میں متعہ دینا مستحب ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور اکثر فقہاءؒ اسی بات کے قائل ہیں۔

(ب:۳۸) بَابُ مَا يُكْرَهُ لِلْمَرْأَةِ مِنَ الزِّينَةِ فِى الْعِدَّةِ

دورانِ عدت عورت کے لیے زینت کی کراہت کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، أَنَّ صَفِيَّةَ بِنْتَ أَبِى عُبَيْدٍ اشْتَكَتْ عَيْنَيْهَا وَهِيَ حَادٌّ عَلَى عَبْدِ اللّٰهِ بَعْدَ وَفَاتِهِ، فَلَمْ تَكْتَحِلْ حَتَّى كَادَتْ عَيْنَاهَا أَنْ تَرْمَصَا.

ترجمہ: نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ سیدہ صفیہ بنت ابوعبید کی آنکھوں میں شکایت ہوگئی، وہ حضرت عبداللہؓ کے انتقال کے بعد ان کی وفات کا سوگ کر رہی تھیں، تو انہوں نے اپنی آنکھوں میں سرمہ نہیں لگایا، یہاں تک کہ ان کی آنکھوں میں مواد بھر گیا تھا۔

تشریح: اس باب میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ دورانِ عدت عورت کے لیے زیب وزینت اختیار کرنا کیسا ہے؟ چنانچہ ذکر کردہ روایت میں دو باتیں قابل غور ہیں: ایک یہ کہ عدت کے دوران زیب وزینت سے عورت کو پرہیز کرنا چاہیے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ خاوند کی فوتیدگی کے سوا کسی اور کے فوت ہو جانے پر تین دن سے زائد سوگ نہیں منانا چاہیے۔ پہلی بات کے ضمن میں زینت کے لیے سرمہ لگانا، خوشبو استعمال کرنا اور تیل وغیرہ کا استعمال ممنوع ہے، لیکن ان میں سے کوئی چیز اگر بغرضِ علاج اور ضرورت کے تحت کی جائے، تو اس کی اجازت ہے۔ جناب صفیہ بنت عبیدؓ نے احتیاطاً بطور علاج بھی استعمال نہ فرمایا، یہ ان کے احتیاط کی اعلیٰ مثال ہے۔

حالت عذر میں معتدہ کے لئے سرمہ وغیرہ لگانے کا حکم

اس بارے میں دو مذاہب ہیں: (۱) ظاہریہ کہتے ہیں کہ: معتدہ کے لئے سرمہ وغیرہ لگانا جائز نہیں؛ اگرچہ آنکھوں میں کوئی تکلیف ہی کیوں نہ ہو۔ (۲) جمہور کے نزدیک بغیر عذر کے سرمہ لگانا اگرچہ جائز نہیں لیکن عذر کی صورت میں رات کو سرمہ وغیرہ لگانے میں کوئی حرج نہیں، جہاں تک دن کا تعلق ہے امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک عذر کی صورت میں دن میں بھی سرمہ لگانے کی اجازت ہے، جبکہ امام شافعیؒ دن میں بھی باوجود عذر کے اجازت نہیں دیتے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ لا يَنْبَغِي أَنْ تَكْتَحِلَ بِكُحْلِ الزِّينَةِ، وَلا تَدَّهِنَ، وَلا تَتَطَيَّبَ، فَأَمَّا الذُّرُورُ وَنَحْوُهُ فَلا بَأْسَ بِهِ، لأَنَّ هَذَا لَيْسَ بِزِينَةٍ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ ایسی عورت کے لئے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ زیب وزینت کے طور پر سرمہ لگائے، یا تیل لگائے، یا خوشبو استعمال کرے۔ جہاں تک سفیدے وغیرہ کا تعلق ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زینت کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم بھی اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ اور یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔ جاننا چاہیے کہ معتدہ چاہے بیوہ ہو، یا مطلقہ، یا مختلعہ، اس کے لئے عدت کے دوران سوگ واجب ہے اور کسی طرح کی زیب وزینت اس کے لئے جائز نہیں، ہاں! البتہ کسی بیماری کی وجہ سے علاج کے طور پر کوئی زینت کی چیز استعمال کرنے کی ضرورت پیش آ جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، حَدَّثَنَا نَافِعٌ، عَنْ صَفِيَّةَ بِنْتِ أَبِي عُبَيْدٍ، عَنْ حَفْصَةَ، أَوْ عَائِشَةَ، أَوْ عَنْهُمَا جَمِيعًا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لا يَحِلُّ لامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ أَنْ تُحِدَّ عَلَى مَيِّتٍ فَوْقَ ثَلاثِ لَيَالٍ إِلا عَلَى زَوْجٍ.

ترجمہ: صفیہ بنت ابوعبید، سیدہ حفصہؓ یا شاید سیدہ عائشہؓ یا شاید

دونوں کے حوالے سے نقل کرتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ: اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والی کسی بھی عورت کے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ کسی شخص کے انتقال پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے؛ البتہ شوہر کا حکم مختلف ہے۔

تشریح: اس روایت کی تھوڑی سی وضاحت پہلی روایت میں دوسری بات کے ضمن میں آچکی ہے کہ خاوند کی فوتیدگی کے سوا کسی اور کے فوت ہو جانے پر تین دن سے زیادہ سوگ نہیں منانا چاہیے، چنانچہ سیدہ حفصہؓ جنابِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں، آپ نے فرمایا: وہ عورت جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن، یا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ کریمؐ پر ایمان رکھتی ہو، اس کے لئے کسی مرنے والے پر تین دن سے زائد سوگ منانا جائز نہیں؛ مگر اپنے خاوند کی فوتیدگی پر چار ماہ اور دس دن تک سوگ منا سکتی ہے۔ (مصنف عبدالرزاق، ج:۷، ص:۴۹)

خلاصہ یہ کہ عورت کو عدت کے دوران زینت و زیبائش نہیں کرنی چاہیے، وہ عدت طلاق کی ہو، یا خاوند کے فوت ہو جانے کی ہو۔ اور ترکِ زینت میں ہر اس چیز سے اجتناب ہے جو زینت میں شامل ہے۔ خوشبو لگانا، تیل استعمال کرنا، مہندی لگانا اور زیورات کا استعمال یہ سب اُمور ممنوع ہیں۔ اور خاوند کے سوا کسی اور کے فوت ہونے کی صورت میں تین دن کے بعد عورت خوشبو لگا سکتی ہے، زیب و زینت اختیار کر سکتی ہے، مگر خاوند کے فوت ہو جانے کے بعد چار ماہ اور دس دن تک سوگ میں رہے گی۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، يَنْبَغِي لِلْمَرْأَةِ أَنْ تُحِدَّ عَلَى زَوْجِهَا حَتَّى تَنْقَضِيَ عِدَّتُهَا، وَلَا تَتَطَيَّبُ، وَلَا تَدَّهِنُ لِزِينَةٍ، وَلَا تَكْتَحِلُ لِزِينَةٍ، حَتَّى تَنْقَضِيَ عِدَّتُهَا، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں کہ عورت کے لئے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کا سوگ کرے، یہاں تک کہ اس کی عدت گذر جائے۔ وہ اس دوران خوشبو استعمال نہیں کرے گی، زیب وزینت کے لیے تیل نہیں لگائے گی، زیب وزینت کے لیے سرمہ استعمال نہیں کرے گی، یہاں تک کہ اس کی عدت پوری ہو جائے۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے قول کی وضاحت ماقبل روایت کی تشریح کے ضمن میں آ چکی ہے کہ عورت کے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ عدت کے دوران زیب وزینت وزیبائش اختیار کرے؛ بلکہ سوگ کرے، یہاں تک کہ اس کی عدت پوری ہو جائے۔ اور عورت کا سوگ یہ ہے کہ وہ خوشبو لگانا اور بناؤ سنگھار اور سرمہ اور تیل لگانا، خوشبودار ہو یا بغیر خوشبو کا، سب کچھ چھوڑ دے، ہاں اگر کوئی عذر ہو تو استعمال کر سکتی ہے۔

(ب:۳۹) بَابُ الْمَرْأَةِ تَنْتَقِلُ مِنْ مَنْزِلِهَا قَبْلَ اِنْقِضَاءِ عِدَّتِهَا مِنْ مَوْتٍ أَوْ طَلَاقٍ

موت یا طلاق کی عدت مکمل ہونے سے قبل عورت کا اپنے گھر سے باہر نکلنے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنِي يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ، عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ، وَسُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ، أَنَّهُ سَمِعَهُمَا يَذْكُرَانِ أَنَّ يَحْيَى بْنَ سَعِيدِ بْنِ الْعَاصِ طَلَّقَ بِنْتَ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ الْحَكَمِ الْبَتَّةَ، فَانْتَقَلَهَا عَبْدُ

الرَّحْمَنِ، فَأَرْسَلَتْ عَائِشَةُ إِلَى مَرْوَانَ وَهُوَ أَمِيرُ الْمَدِينَةِ: اتَّقِ اللّٰهَ وَارْدُدِ الْمَرْأَةَ إِلَى بَيْتِهَا، فَقَالَ مَرْوَانُ فِي حَدِيثِ سُلَيْمَانَ: أَنَّ عَبْدَ الرَّحْمَنِ غَلَبَنِي، وَقَالَ فِي حَدِيثِ الْقَاسِمِ: أَوَمَا بَلَغَكِ شَأْنُ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ؟ قَالَتْ عَائِشَةُ: لا يَضُرُّكَ أَنْ لا تَذْكُرَ حَدِيثَ فَاطِمَةَ، قَالَ مَرْوَانُ، إِنْ كَانَ بِكِ الشَّرُّ فَحَسْبُكِ مَا بَيْنَ هَذَيْنِ مِنَ الشَّرِّ.

ترجمہ: قاسم بن محمد اور سلیمان بن یسار بیان کرتے ہیں، یحییٰ بن سعید نے عبدالرحمٰن بن حکم کی صاحبزادی کو طلاقِ بتہ دے دی، تو عبدالرحمٰن نے اس خاتون کو اپنے گھر منتقل کر دیا، تو سیدہ عائشہؓ نے مروان کو پیغام بھیجا، جو اُن دنوں مدینہ منورہ کا گورنر تھا (پیغام یہ تھا کہ) تم اللہ سے ڈرو! اور اس عورت کو اس کے گھر واپس بھیجو! مروان نے کہا: (یہاں تک سلیمان نامی راوی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: اس بارے میں عبدالرحمٰن مجھ پر غالب آ گئے)۔

قاسم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: مروان نے کہا: کیا آپ کو سیدہ فاطمہ بنت قیسؓ کے واقعہ کا پتہ نہیں ہے؟ تو سیدہ عائشہؓ نے فرمایا: یہ چیز تمہیں کوئی نقصان نہیں دے گی کہ اگر تم فاطمہ کے واقعہ کا تذکرہ نہ کرو۔ تو مروان نے کہا کہ: اگر فاطمہ بنت قیس کے گھر سے نکلنے کا سبب آپ کے نزدیک جھگڑا ہے، تو پھر اسی کی طرح یہاں بھی صورتِ حال ہے۔

مطلقہ رجعیہ، بائنہ اور متوفی عنہا زوجہا باہر نکل سکتی ہیں؟

تشریح: عورت خواہ عدتِ طلاق گذار رہی ہو، یا خاوند کی فوتید گی کی، اسے بہر صورت اسی مکان میں عدت پوری کرنی چاہیے جہاں اس کو طلاق ہوئی، یا خاوند کا انتقال ہوا۔ اس کی تفصیل ہم "بَابُ الْمَرأة تُسافر قبل اِنقضاءِ

عِدَّتِها" میں ذکر کر چکے ہیں۔

اس باب کے تحت جو روایات ذکر ہوئیں اُن کے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں، چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن کی صاحبزادی کے معاملے میں اُمّ المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ اور مروان -امیر مدینہ- کے پیغامات کے تبادلے کے بارے میں روایات دو طرح سے وارد ہیں:

ایک تو یہ کہ مروان نے جناب عبدالرحمٰن سے بات کی کہ اپنی بیٹی کو عدت گذارنے کے لئے واپس اسی مکان میں بھیج دو، جہاں اسے طلاق ہوئی تھی؛ لیکن عبدالرحمٰن کے غلبہ کی وجہ سے مروان اپنے فیصلے پر عمل نہ کرسکا۔ اس روایت کے پیش نظر مروان اور سیدہ عائشہؓ کے درمیان اس روایت میں کوئی اختلاف نہیں، دونوں ہی مطلقہ کو اسی مکان میں عدت گذارنے کے قائل ہیں جہاں اسے طلاق ہوئی۔

دوسری روایت کچھ اس طرح ہے کہ: مروان نے جواباً کہا کہ: جب فاطمہ بنت قیسؓ دورانِ عدت اپنے خاوند کے گھر کو چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہوگئی تھیں، تو عبدالرحمٰن کی بیٹی پر اعتراض کیوں؟

سیدہ عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ: فاطمہ بنت قیس والی روایت کو حضرت عمرؓ نے رَد کیا تو میں بھی رَد کرتی ہوں۔ علاوہ ازیں فاطمہ بنت قیس کو اس مکان میں خطرہ تھا۔ اس پر مروان نے پھر کہا کہ: اگر فاطمہ بنت قیس کو خطرہ تھا تو یہی خطرہ بنت عبدالرحمٰن کو بھی ہے۔

بہر حال جب دونوں میں اختلاف ہے تو امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ: ہمارا اور ہمارے تمام فقہائے کرام کا امام اعظم سمیت سیدہ عائشہؓ کے قول پر عمل ہے۔ اور یہی نص قرآنی کے مطابق ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ، لا يَنْبَغِي لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَنْتَقِلَ مِنْ مَنْزِلِهَا الَّذِي طَلَّقَهَا فِيهِ زَوْجُهَا طَلاقًا بَائِنًا، أَوْ غَيْرَهُ، أَوْ مَاتَ عَنْهَا فِيهِ حَتَّى تَنْقَضِيَ عِدَّتُهَا، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں کہ ایسی عورت کے لئے اپنے گھر سے منتقل ہونا مناسب نہیں ہے جس کے شوہر نے اسے طلاقِ بتہ دیدی ہو، یا اس کے علاوہ کوئی اور طلاق دی ہو، یا جو عورت بیوہ ہو چکی ہو، وہ اس وقت تک منتقل نہیں ہوگی جب تک اس کی عدت نہیں گذر جاتی۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہائے کرام اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ مطلقہ بائنہ، یا بیوہ کا عدت کے گذرنے تک اس گھر میں رہنا واجب اور ضروری ہے جس گھر میں طلاق یا وفات سے پہلے ان کا رہن سہن تھا۔

یہی امام ابوحنیفہ اور اکثر فقہاء کا قول ہے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، أَنَّ ابْنَةَ سَعِيدِ بْنِ زَيْدِ بْنِ نُفَيْلٍ طُلِّقَتِ الْبَتَّةَ، فَانْتَقَلَتْ، فَأَنْكَرَ ذَلِكَ عَلَيْهَا ابْنُ عُمَرَ.

ترجمہ: امام مالکؒ حضرت نافع کا یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ حضرت سعید بن زیدؓ کی صاحبزادی کو طلاق ہوگئی تو وہ اپنے گھر سے منتقل ہوگئی، تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس بات کو برا مانا۔

تشریح: اس روایت میں حضرت سعید بن زیدؓ کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے جن کا عقد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پوتے عبداللہ سے ہوا تھا، طلاق ہونے

کے بعد یہ اپنے خاوند کا مکان چھوڑ کر اپنے والد کے گھر منتقل ہوگئی، جس کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے برا مانا اس کی وجہ بھی قرآنِ کریم کی مخالفت تھی جیسا کہ زرقانیؒ نے لکھا ہے: (وَ أنكرَ ذالِكَ) الانتِقالَ عليها عبد الله بنُ عُمرَ لِمُخالفة القرآن. (زرقانی، ج:۳، ص:۲۰۷) حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کو اس لیے برا مانا؛ کیونکہ اس میں قرآن کی مخالفت تھی۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا سَعْدُ بْنُ إِسْحَاقَ بْنِ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ، عَنْ عَمَّتِهِ زَيْنَبَ ابْنَةِ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ، أَنَّ الْفُرَيْعَةَ بِنْتَ مَالِكِ بْنِ سِنَانٍ وَهِيَ أُخْتُ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، أَخْبَرَتْهُ، أَنَّهَا أَتَتْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَسْأَلُهُ أَنْ تَرْجِعَ إِلَى أَهْلِهَا فِي بَنِي خُدْرَةَ، فَإِنَّ زَوْجِي خَرَجَ فِي طَلَبِ أَعْبُدٍ لَهُ أَبَقُوا حَتَّى إِذَا كَانَ بِطَرَفِ الْقُدُومِ أَدْرَكَهُمْ، فَقَتَلُوهُ، فَقَالَتْ: فَسَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَأْذَنَ لِي أَنْ أَرْجِعَ إِلَى أَهْلِي فِي بَنِي خُدْرَةَ فَإِنَّ زَوْجِي لَمْ يَتْرُكْنِي فِي مَسْكَنٍ يَمْلِكُهُ، وَلا نَفَقَةٍ، فَقَالَ: نَعَمْ، فَخَرَجْتُ حَتَّى إِذَا كُنْتُ بِالْحُجْرَةِ دَعَانِي، أَوْ أَمَرَ مَنْ دَعَانِي، فَدُعِيتُ لَهُ، فَقَالَ: كَيْفَ قُلْتِ؟، فَرَدَّدْتُ عَلَيْهِ الْقِصَّةَ الَّتِي ذَكَرْتُ لَهُ، فَقَالَ: امْكُثِي فِي بَيْتِكَ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ، قَالَتْ: فَاعْتَدَدْتُ فِيهِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا، قَالَتْ: فَلَمَّا كَانَ أَمْرُ عُثْمَانَ أَرْسَلَ إِلَيَّ فَسَأَلَنِي عَنْ ذَلِكَ فَأَخْبَرْتُهُ بِذَلِكَ فَاتَّبَعَهُ وَقَضَى بِهِ.

ترجمہ: سعد بن اسحاق اپنی پھوپھی سیدہ زینب بنت کعبؓ کا یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ فریعہ بنت مالکؓ۔ جو حضرت ابو سعید خدریؓ کی بہن ہے۔

انہوں نے یہ بات بیان کی ہے کہ: وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں؛ تاکہ ان سے یہ دریافت کریں کہ وہ اپنے میکہ یعنی بنو خدرہ میں منتقل ہو جائیں۔ (انہوں نے بتایا) میرے شوہر اپنے کچھ غلاموں کو تلاش کرنے کے لیے نکلے تھے، انہوں نے ''طرف قدوم'' کے مقام پر اُن غلاموں کو پالیا، تو ان غلاموں نے میرے شوہر کو قتل کر دیا۔

وہ خاتون بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی کہ آپ مجھے یہ اجازت دیں کہ میں میکے میں یعنی بنو خدرہ میں منتقل ہو جاؤں؛ کیونکہ میرے شوہر نے رہائش کے لئے میرے لئے کوئی جگہ نہیں چھوڑی ہے جس کے وہ مالک ہوتے اور خرچ بھی نہیں چھوڑا ہے۔ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ٹھیک ہے۔ وہ خاتون بیان کرتی ہیں: میں اس وقت وہاں سے نکلی، میں ابھی حجرہ کے دروازے پر پہنچی تھی کہ نبی اکرمؐ نے مجھے بلایا، یا آپؐ نے ہدایت کی تو مجھے بلا کر لایا گیا، تو آپؐ نے فرمایا: تم نے کیا بات بیان کی تھی؟ میں نے پورا واقعہ آپ کے سامنے ذکر کیا جو پہلے بھی ذکر کیا تھا۔ تو آپ نے فرمایا: تم اپنے گھر میں ہی ٹھہری رہو، جب تک تمہاری عدت پوری نہیں ہو جاتی۔ وہ خاتون بیان کرتی ہیں: پھر میں نے چار ماہ دس دن تک اسی گھر میں عدت بسر کی۔ وہ خاتون بیان کرتی ہیں جب حضرت عثمان غنیؓ کا عہد خلافت تھا تو انہوں نے مجھے پیغام بھیج کر مجھ سے اس بارے میں دریافت کیا، میں نے اس بارے میں بتایا تھا تو انہوں نے اس کی پیروی کی تھی اور اس کے مطابق فیصلہ دیا تھا۔

تشریح: حضرت ابو سعید کی بہن فریعہ بنت مالک کے شوہر کے چند

غلام بھاگ گئے تھے وہ اُن کوڈھونڈنے کے لئے نکلے۔ ''طرف القدوم'' نامی جگہ میں وہ سب اکٹھا ہوکر آ گئے اور اپنے آقا کو قتل کر دیا۔ پس حضرت فریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور پورا واقعہ بیان کیا اور مسئلہ پوچھا کہ: کیا وہ میکے میں عدت گذار سکتی ہیں؟ کیونکہ جس مکان میں وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھیں وہ مکان عاریت کا تھا، شوہر کی ملکیت نہیں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیدی، جب وہ جانے لگیں تو آدھے کمرے سے، یا آدھی مسجد سے واپس بلالیا، اور فرمایا: تم نے کیا مسئلہ پوچھا تھا؟ دوبارہ پوچھو۔ انہوں نے وہی بات دہرائی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہاں تم اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھیں وہیں عدت گذارو۔ پہلے آپؐ نے خیال کیا ہوگا کہ مکان شوہر کی ملکیت نہیں؛ اس لئے آپ نے میکے جانے کی اجازت دی، پھر خیال آیا کہ عاریت پر دینے والا شخص مکان خالی کرنے کا مطالبہ نہیں کر رہا، پس میکے جانے کا جواز نہیں، اس لیے آپ نے واپس بلا کر منع کر دیا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسی قسم کا واقعہ پیش آیا، تو انھوں نے فریعہ کو بلا کر یہ حدیث سنی، پھر اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معتدہ (یعنی عدت میں بیٹھی ہوئی عورت) کو بلاضرورت ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہونا جائز نہیں ہے، تا آنکہ اس کی عدت پوری ہو جائے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ، عَنِ ابْنِ الْمُسَيِّبِ، أَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الْمَرْأَةِ يُطَلِّقُهَا زَوْجُهَا وَهِيَ فِي بَيْتٍ بِكَرَاءٍ، عَلَى مَنِ الْكَرَاءُ؟ قَالَ: عَلَى زَوْجِهَا، قَالُوا: فَإِنْ لَمْ يَكُنْ عِنْدَ زَوْجِهَا؟ قَالَ: فَعَلَيْهَا،

قَالُوا: فَإِنْ لَمْ يَكُنْ عِنْدَهَا؟ قَالَ: فَعَلَى الْأَمِيرِ.

ترجمہ: یحییٰ بن سعیدؒ بیان کرتے ہیں: سعید بن مسیبؒ سے ایسی عورت کے بارے میں دریافت کیا گیا جس کا شوہر اسے طلاق دے دیتا ہے اور وہ کرائے کے مکان میں رہ رہی ہوتی ہے؟ تو سعیدؒ نے کہا کہ: اس کے شوہر پر کرائے کی ادائیگی لازم ہوگی۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ: اگر اس کے شوہر کے پاس اس بات کی گنجائش نہ ہو؟ تو سعیدؒ نے کہا: اس عورت پر اس کی ادائیگی لازم ہوگی۔ لوگوں نے دریافت کیا: اگر عورت کے پاس بھی اس بات کی گنجائش نہ ہو؟ تو سعید نے کہا: تو حاکم وقت پر اس کی ادائیگی لازم ہوگی۔

معتدہ کے مکان کا کرایہ کس کے ذمہ ہوگا؟

تشریح: اس روایت میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے وہ مسئلہ خود باب کی روایت سے واضح ہے کہ مکان اگر کرایہ کا ہو تو اس کا کرایہ خاوند کے ذمہ ہوگا۔ اور اگر خاوند کرایہ ادا نہ کر سکتا ہو، تو عورت کے ذمہ ہوگا۔ اور اگر عورت کرایہ ادا نہ کر سکتی ہو، تو بیت المال سے کرایہ ادا کیا جائے گا۔ اور عدت بہر حال اسی مکان میں پوری کرنی پڑے گی۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، أَنَّ ابْنَ عُمَرَ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ فِي مَسْكَنِ حَفْصَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَكَانَ طَرِيقُهُ فِي حُجْرَتِهَا، فَكَانَ يَسْلُكُ الطَّرِيقَ الْأُخْرَى مِنْ أَدْبَارِ الْبُيُوتِ إِلَى الْمَسْجِدِ، كَرَاهَةَ أَنْ يَسْتَأْذِنَ عَلَيْهَا حَتَّى رَاجَعَهَا.

ترجمہ: نافعؒ بیان کرتے ہیں: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے

اپنی اہلیہ کو سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر طلاق دیدی، ان کا راستہ سیدہ حفصہؓ کے حجرے میں سے گذرتا تھا؛ لیکن وہ گھروں کے پیچھے کی طرف سے دوسرے راستے سے مسجد جایا کرتے تھے؛ کیونکہ وہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ رجوع کرنے سے پہلے اپنی بیوی سے اندر آنے کی اجازت مانگیں (یعنی تنہائی میں اس کے پاس جائیں)۔

تشریح: اس روایت میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے طلاق دینے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ، ایک طلاقِ رجعی دینے کے بعد انہوں نے اپنی مطلقہ بیوی کے گھر سے گذرنا چھوڑ دیا تھا، یہ اُن کے تقویٰ اور پرہیز گاری کا آئینہ دار ہے۔ صاحب زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی یہی وجہ بیان کی ہے: "كَرَاهِيَةَ أن يَستأذِنَ عَليهَا مِن شِدَّةِ وَرَعِه حَتّى راجعهَا لِعصمتِه". (زرقاني، ج:۳، ص:۲۰۷) یعنی آپ اپنے تقویٰ اور پرہیز گاری کے کمال کی وجہ سے اس کے گھر میں داخل ہونا اچھا نہیں سمجھتے تھے جب تک رجوع نہ کرلیں۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، لا يَنْبَغِي لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَنْتَقِلَ مِنْ مَنْزِلِهَا الَّذِي طَلَّقَهَا فِيهِ زَوْجُهَا، إِنْ كَانَ الطَّلاقُ بَائِنًا، أَوْ غَيْرَ بَائِنٍ، أَوْ مَاتَ عَنْهَا فِيهِ حَتَّى تَنْقَضِيَ عِدَّتُهَا، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ: ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں کہ عورت کے لئے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے گھر سے منتقل ہو، یعنی وہ عورت جس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی ہو؛ خواہ وہ بائنہ طلاق ہو، یا بائنہ طلاق کے علاوہ ہو، یا جس عورت کا شوہر فوت ہو چکا ہو، وہ اُس وقت گھر سے منتقل نہیں ہوگی جب تک اُس کی عدت پوری نہیں ہوجاتی۔ امام

ابو حنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ عورت خواہ عدتِ طلاق گذار رہی ہو، یا خاوند کی فوتید گی کی عدت، اُسے ہر حال میں وہیں رہ کر عدت پوری کرنی چاہیے جہاں اس کو طلاق ہوئی، یا خاوند کا انتقال ہوا، وہاں سے منتقل ہونا جائز نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور اکثر فقہائے کرام اسی بات کے قائل ہیں۔

لیکن یہاں ایک مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ جو عورت طلاقِ رجعی کے ساتھ مطلقہ ہو، تو اس کا نفقہ اور سکنیٰ زوج پر لازم ہے۔ اور اگر عورت تین طلاق کے ساتھ مطلقہ مغلظہ ہے لیکن حاملہ بھی ہے، تو اس کا نفقہ بھی وضع حمل تک زوج پر بالاتفاق لازم ہے۔ اور اگر عورت مطلقہ مغلظہ غیر حاملہ ہے، تو اس کے نفقہ اور سکنیٰ میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔

مطلقہ مغلظہ کے نفقہ وسکنیٰ میں فقہاء کا اختلاف

امام احمدؒ واصحابِ ظواہر کا مذہب: امام احمدؒ کے نزدیک مطلقہ مغلظہ غیر حاملہ کے لیے نہ نفقہ ہے اور نہ سکنیٰ ہے، یعنی نہ نان ہے نہ مکان ہے۔

امام مالکؒ وشافعیؒ کا مذہب: امام مالکؒ اور شافعیؒ کے نزدیک سکنیٰ ہے؛ لیکن نفقہ نہیں ہے، یعنی مکان ہے، نان نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کا مذہب: احناف کے نزدیک اس مطلقہ کے لیے سکنیٰ بھی ہے اور نفقہ بھی ہے، یعنی نان اور مکان دونوں شوہر پر لازم ہیں۔

اصحاب ظواہر کی دلیل: اہل ظواہر فاطمہ بنت قیسؓ کی روایت سے

استدلال کرتے ہیں، اس میں یہ الفاظ ہے: ”لاَ نَفقَةَ لَكِ إلاَّ أن تكُونِي حَامِلاً“. اوراسی حدیث میں ان کو حکم دیا گیا ہے کہ تم ابن اُمّ مکتومؓ کے گھر میں رہو، جس سے معلوم ہوا کہ ان کو سکنیٰ کا بھی حق نہیں ہے۔ (صحیح مسلم، ص:۲۲۱)

دلیل کا جواب: احناف فاطمہ بنت قیسؓ کی روایت کا جواب دیتے ہیں کہ یہ روایت کئی وجوہ سے معلل ہے:

(۱) حضرت عمر فاروقؓ نے جب یہ حدیث سنی تو فرمانے لگے: لاَ نَدَعُ كِتابَ رَبِّنَا، وَ سُنَّةَ نَبِيِّنَا لِقولِ اِمرأةٍ نَسِيتْ أو شبه لَها، سمعت النبيَّ صَلَّى اللّٰه عَليه وسلَّم يقُولُ: لَها السُّكنٰى والنَّفقَةُ.

(مرقاۃ المفاتیح، ج:۶، ص:۳۲۵)

(۲) حضرت سعید بن میسّبؒ فرماتے ہیں کہ: فاطمہ بنت قیسؓ کو نفقہ اس لیے نہیں دیا گیا کہ، اس کی زبان میں سختی اور تیزی تھی؛ گویا وہ ناشزہ تھی اور ناشزہ کو نان ونفقہ نہیں دیا جاتا۔

امام مالکؒ وشافعیؒ کی دلیل: ان دونوں حضرات نے سکنیٰ کے ثبوت کے لیے قرآنِ کریم کی اس آیت سے استدلال کیا ہے: ”اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ“. اور نفقہ کی نفی کے لئے اس آیت سے استدلال کیا ہے: ”وَاِنْ كُنَّ اُوْلَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ“. طریقہ استدلال مفہومِ مخالف کے طور پر ہے، کہ نفقہ صرف معتدہ حاملہ کو ملے گا، لہٰذا جو عورت حاملہ مطلقہ نہیں اس کو کسی بھی صورت میں نفقہ نہیں ملے گا۔

دلیل کا جواب: احناف مذکورہ دلیل کا جواب یہ دیتے ہیں کہ: ہم مفہومِ مخالف کو نہیں مانتے ہیں اور نہ یہ ہمارے ہاں کوئی مستند دلیل ہے، خاص کر جب

حضرت ابن مسعودؓ کی قرأت میں یہ الفاظ موجود ہیں: ’’وَ اَنفِقُوا عَلَيهِنَّ مِن وُّجدِكُم‘‘. اس صراحت کے بعد ہم نفقہ کا انکار نہیں کر سکتے ہیں۔ اور ویسے شوافع کو بطورِ الزام احناف یہ جواب دیتے ہیں کہ: جب آپ نے سکنیٰ مان لیا تو کیا اس بیچاری عورت کو قتل کرانا چاہتے ہو اور اس کو کہتے ہو کہ گھر میں پڑی رہو، کیونکہ تم پر عدت گذارنا واجب ہے اور تم کو کھانا کچھ بھی نہیں ملے گا، یہ تو عجیب فیصلہ ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل: احناف نے وجوبِ سکنیٰ کے لیے قرآنِ کریم کی دو آیتوں سے استدلال کیا ہے: ایک آیت یہ ہے: ’’اَسكِنُوهُنَّ مِن حَيثُ سَكَنتُم مِن وُجدِكُم‘‘. یہ آیت بھی مکان دینے پر صریح دلالت کرتی ہے۔ اور ضمنی طور پر یہ آیت نفقہ کو بھی واجب کرتی ہے، کیونکہ جب اس عورت کے نکلنے اور نکالنے پر پابندی ہے تو لازمی طور پر اس کو نفقہ دینا پڑے گا۔

نیز شریعت کے قواعد کے مطابق بھی اس کو نفقہ دینا پڑے گا؛ کیونکہ یہاں اس عورت کا حبس بوجہ حق زوج آ گیا ہے؛ کیونکہ عدت، نکاح کے اثرات میں سے ایک اثر ہے اور نکاح کی وجہ سے جب نفقہ زوج پر لازم تھا تو اب اس نکاح کے اثر کی وجہ سے جو حبس آ گیا ہے، اس میں بھی نفقہ زوج پر فرض ہو گا۔

(ب:۴۰) بَابُ عِدَّةِ أُمِّ الوَلَد

اُمِّ ولد کی عدت کا بیان

أَخبَرَنَا مَالِكٌ، حَدَّثَنَا نَافِعٌ، عَنِ ابنِ عُمَرَ، أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: عِدَّةُ أُمِّ الوَلَدِ إِذَا تُوُفِّيَ عَنهَا سَيِّدُهَا حَيضَةٌ.

قَالَ مُحَمَّدٌ: أَخبَرَنِي الحَسَنُ بنُ عُمَارَةَ، عَنِ الحَكَمِ بنِ عُيَينَةَ، عَن

يَحْيَى بْنِ الْجَزَّارِ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهُ، أَنَّهُ قَالَ: عِدَّةُ أُمِّ الْوَلَدِ ثَلاثُ حِيَضٍ.

ترجمہ: نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرمایا کرتے تھے: جب اُمّ ولد (کنیز) کا آقا انتقال کر جائے تو اسکی عدت ایک حیض ہوگی۔

حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اُمّ ولد کی عدت تین حیض ہوگی۔

اُمّ ولد کی تعریف اور اُس کا حکم

تشریح: ''اُمّ ولد'' وہ باندی ہے کہ جس کے یہاں اپنے مولیٰ کے نطفہ سے بچہ/بچی پیدا ہو جائے۔

اس باندی کا حکم یہ ہے کہ مولیٰ کے مرنے کے بعد وہ آزاد ہو جاتی ہے، اس کی تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اُمّ ولد کے مولیٰ کا انتقال ہو گیا تو وہ مولیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا خاوند بھی بنتا ہے؛ کیونکہ وہ اس سے وطی کرتا رہا، لہٰذا مولیٰ کے مرنے کے بعد اس کو عدت کیا گذارنی پڑے گی؟

مذکورہ باب میں تین عدتیں بیان ہوئیں: (۱) ایک حیض (۲) تین حیض (۳) اور آزاد عورت کے بیوہ ہونے کی عدت، یعنی چار ماہ اور دس دن۔ ابن عمرؓ ایک حیض کے قائل ہیں۔ علی بن ابی طالبؓ سے تین حیض منقول ہے۔ اور عمرو بن العاصؓ سے آزاد عورت کی عدت مروی ہے۔ ان تینوں میں واضح فرق ہے۔

ایک حیض اور تین حیض میں واضح فرق موجود ہے۔ اسی طرح ایک حیض اور آزاد

عورت کی عدت چار ماہ دس دن میں بھی واضح فرق ہے۔ لہٰذا اتفاق کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ ان تین میں سے امام محمدؒ نے تیسرے قول کو اپنا مسلک قرار دیا ہے۔

جیسا کہ صحیح ابن حبان میں یہی بات نقل کی گئی ہے: "لَا تَلبِسُوا عَلينَا سُنَّةَ نَبِيِّنا، عِدَّةُ أمِّ الوَلد عِدَّة المُتوفّى عنهَا زوجُها". (صحیح ابن حبان، ج:۶، ص:۲۵۰) کہ تم لوگ ہم پر ہمارے پیغمبر کی سنت کو خلط ملط نہ کرو۔ اُمّ ولد کی عدت وہی ہے جو اس عورت کی ہے جس کا خاوند انتقال کر گیا ہو، یعنی چار ماہ اور دس دن۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، عَنْ ثَوْرِ بْنِ يَزِيدَ، عَنْ رَجَاءِ بْنِ حَيْوَةَ، أَنَّ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ سُئِلَ عَنْ عِدَّةِ أُمِّ الْوَلَدِ؟ فَقَالَ: لا تُلَبِّسُوا عَلَيْنَا فِي دِينِنَا إِنْ تَكُ أَمَةً فَإِنَّ عِدَّتَهَا عِدَّةُ حُرَّةٍ. قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ وَإِبْرَاهِيمَ النَّخَعِيِّ وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا، رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيهِم.

ترجمہ: حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اُمّ ولد کی عدت کے بارے میں دریافت کیا گیا، تو فرمایا: تم ہمارے دین کے بارے میں ہمیں الجھن کا شکار نہ کرو، اگر چہ وہ کنیز ہے؛ لیکن اس کی عدت آزاد عورت کی عدت کے مانند ہوگی۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں: ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ ابراہیم نخعیؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: اس روایت کی تشریح باب کی پہلی روایت کے ضمن میں آچکی ہے کہ، جب اُمّ ولد کا آقا انتقال کر جائے، یا وہ اسے آزاد کر دے، تو اس کی عدت آزاد عورت کی عدت کے مانند ہوگی، یعنی چار ماہ اور دس دن۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ: اس کی عدت صرف ایک حیض ہوگی؛ کیونکہ یہ عدت ملک یمین کے زائل

ہونے کی وجہ سے لازم ہوئی ہے، اس لیے یہ استبراء کے مانند ہو جائے گی۔

امام محمد علیہ الرحمہ بھی اسی بات کے قائل ہیں کہ اُمّ ولد کی عدت آزاد عورت کی عدت کے مانند ہوگی۔

(ب:۴۱) بَابُ الْخَلِيَّةِ وَالْبَرِيَّةِ وَمَا يُشْبِهُ الطَّلَاقَ

خلیہ، برئیہ اور ان جیسے دوسرے الفاظ جو طلاق۔ کے مشابہ ہیں، کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: الْخَلِيَّةُ وَالْبَرِيَّةُ ثَلَاثُ تَطْلِيقَاتٍ كُلُّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا.

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ، عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ، قَالَ: كَانَ رَجُلٌ تَحْتَهُ وَلِيدَةٌ فَقَالَ لأَهْلِهَا: شَأْنَكُمْ بِهَا؟ قَالَ الْقَاسِمُ: فَرَأَى النَّاسُ أَنَّهَا تَطْلِيقَةٌ.

ترجمہ: نافعؒ بیان کرتے ہیں، حضرت عبداللہ بن عمرؓ لفظ ''خلیہ'' اور لفظ ''برئیہ'' کے استعمال کے ذریعہ تین طلاقیں مراد لیا کرتے تھے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک لفظ کا (یہی حکم ہے)۔

قاسم بن محمدؒ بیان کرتے ہیں کہ: ایک شخص کی بیوی کنیز تھی، اس شخص نے بیوی کے مالک سے کہا: تم اسے سنبھالو۔ قاسم کہتے ہیں: تو لوگوں نے اس چیز کو ایک طلاق شمار کیا۔

تشریح: ''خلیة'' اور ''بریئة'' ایسے الفاظ ہیں جو بیک وقت ایک سے زائد معانی کا احتمال رکھتے ہیں، اُن احتمالات میں سے طلاق بھی ہے، ایسے الفاظ کنایہ کہلاتے ہیں۔ ان الفاظ کی ادائیگی کے وقت نیت و ارادہ، طلاق ہو، یا کوئی اور،

دلیل وقرینہ جو اس ارادے کی نشاندہی کرتا ہے، تو ان سے طلاق ہو جائے گی؛ ورنہ کسی دوسرے معنی میں استعمال ہوں گے۔

لفظ ''خلیہ'': خالی ہونے، یا علیحدگی اختیار کرنے کا معنی رکھتا ہے۔ لفظ ''بریہ'' بری ہونا اور بیزار ہونا کا مفہوم لیے ہوئے ہے۔ اب کوئی شخص اپنی بیوی سے کہتا ہے: مجھ سے علیحدہ ہو جا، یا میں تجھ سے بیزار ہوں، تو علیحدگی اور بیزار ہونا اس نے کس معنی میں استعمال کیا؟ اگر اس کی مراد یہ ہے کہ دوسرے کمرے میں چلی جا، مجھ سے الگ ہو جا، تا کہ میں اپنا کام کرلوں، تو ایسے الفاظ تقریباً ہر گھر میں استعمال ہوتے ہیں ان سے طلاق نہیں ہوگی۔

الفاظِ کنایات اور اُن سے طلاق واقع ہونے یا نہ ہونے کی تفصیل کتب اُصولِ فقہ اور فقہ میں بالتفصیل موجود ہے، وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں صرف ایک بات ذکر کرنے پر ہم اکتفا کرتے ہیں، وہ یہ کہ ان کنایہ والے الفاظ سے ایک طلاق، یا کل طلاق مراد لی جاسکتی ہے، ایک کو ''فردِ حقیقی'' اور کل کو ''فردِ حکمی'' کہا جاتا ہے۔ اگر ایک طلاقِ بائنہ مراد لی تو بائنہ ہوگی۔ اور اگر کل مراد لی، تو آزاد عورت کو تین اور باندی کو دو واقع ہوں گی۔ بہرحال کنایات میں نیت ضروری ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں جناب ابراہیم سے مروی ہے کہ انہوں نے لفظ ''بریہ'' کے متعلق فرمایا: اگر یہ لفظ نیت طلاق سے بولا گیا، تو اس سے کم از کم جو اُس کی نیت ہوسکتی ہو وہ ایک طلاقِ بائنہ ہوگی، اگر خاوند کی بھی یہی نیت اور بیوی بھی یہی چاہتی ہو۔ اور اگر مرد نے اس لفظ سے تین طلاقوں کی نیت کی، تو تین ہی واقع ہو جائیں گی۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ج:۵، ص:۷۰)

قَالَ مُحَمَّدٌ: إِذَا نَوَى الرَّجُلُ بِالْخَلِيَّةِ وَبِالْبَرِيَّةِ ثَلاثَ تَطْلِيقَاتٍ فَهِيَ ثَلاثُ تَطْلِيقَاتٍ وَإِذَا أَرَادَ بِهَا وَاحِدَةً فَهِيَ وَاحِدَةٌ بَائِنٌ، دَخَلَ بِامْرَأَتِهِ، أَوْ لَمْ يَدْخُلْ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص لفظ ''خلیہ'' یا لفظ ''بریہ'' استعمال کرتے ہوئے تین طلاقوں کی نیت کرے گا تو وہ تین طلاقیں شمار ہوں گی۔ اور جب وہ اُن کے ذریعہ ایک طلاق کی نیت کرے گا، تو وہ ایک بائنہ طلاق شمار ہوگی؛ خواہ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کی ہو یا صحبت نہ کی ہو۔ امام صاحب اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ قول میں امام محمدؒ الفاظِ کنایہ سے واقع ہونے والی طلاق کا ضابطہ بیان فرما رہے ہیں کہ: اگر کسی نے طلاق دینے میں کسی لفظ کنائی کا استعمال کیا تو طلاق اس کی نیت کے لحاظ سے واقع ہوگی، اگر ایک کی نیت کی تو ایک طلاقِ بائنہ اور اگر تین طلاقوں کی نیت کی تھی تو تین طلاقیں واقع ہوں گی، یہی حضرت امام ابوحنیفہ اور اکثر فقہاء کا قول ہے۔

دوسری روایت جو کہ قاسم کی ہے اس میں الفاظِ کنایہ لفظ ''شأن'' کا استعمال ہوا ہے اور اس میں فقہاء نے ایک طلاق شمار کیا ہے اور پہلی روایت میں تین طلاق شمار کی ہے، اس لیے ہم نے ضابطہ بنالیا ہے۔

......☆☆☆......

(ب:۴۲) بَابُ الرَّجُل يُولَدُ لهُ فيَغلِبُ عَليه الشَّبهُ

اپنے بچے بچی پر شبہ پڑنے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا ابْنُ شِهَابٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَجُلا مِنْ أَهْلِ الْبَادِيَةِ أَتَى رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: إِنَّ امْرَأَتِي وَلَدَتْ غُلامًا أَسْوَدَ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: هَلْ لَكَ مِنْ إِبِلٍ؟، قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: مَا أَلْوَانُهَا؟، قَالَ: حُمْرٌ، قَالَ: فَهَلْ فِيهَا مِنْ أَوْرَاقٍ؟، قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَبِمَا كَانَ ذَلِكَ؟، قَالَ: أُرَاهُ نَزَعَهُ عِرْقٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ، قَالَ: فَلَعَلَّ ابْنَكَ نَزَعَهُ عِرْقٌ، قَالَ مُحَمَّدٌ: لا يَنْبَغِي لِلرَّجُلِ أَنْ يَنْتَفِيَ مِنْ وَلَدِهِ بِهَذَا وَنَحْوِهِ.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: ایک دیہاتی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا: میری بیوی نے ایک ایسے بچے کو جنم دیا ہے جس کا رنگ کالا ہے اور (اس وجہ سے کہ وہ میرا ہم رنگ نہیں ہے) میں نے اس کا انکار کر دیا ہے (یعنی یہ کہہ دیا ہے کہ: یہ بچہ میرا نہیں ہے)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ سن کر) فرمایا کہ: تمہارے پاس کچھ اونٹ ہیں؟ اس نے عرض کیا: ہاں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کس رنگ کے ہیں؟ اس نے عرض کیا: سرخ رنگ کے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا اُن میں کوئی اونٹ خاکستری رنگ کا بھی ہے؟ اس

نے عرض کیا: ہاں! اُن میں خاکستری رنگ کے بھی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے، یہ خاکستری رنگ کے اونٹ کہاں سے آگئے؟ (یعنی ان میں خاکستری رنگ کہاں سے آیا، جب کہ اُن کے ماں باپ خاکستری رنگ کے نہیں ہیں؟) اس نے عرض کیا: کوئی رگ ہوگی جس نے انہیں کھینچ لیا (یعنی اس کے اصل میں کوئی خاکستری رنگ کا رہا ہوگا جس کے مشابہ یہ بھی ہو گئے)۔ آپؐ نے فرمایا: تو پھر یہ بچہ بھی کسی ایسی رنگ کے سبب کالا ہوا ہے، جس نے اس کو کھینچ لیا ہے (یعنی اس بچہ کی اصل میں بھی کوئی شخص کالے رنگ کا رہا ہوگا، جس کے مشابہ یہ بچہ ہو گیا ہے)۔

تشریح: غُلاماً أسْوَد: اس دیہاتی کے ذہن میں یہ بات تھی کہ میرا یہ بچہ کالا کیوں ہے، جب کہ میں خود گورا ہوں، میری بیوی گوری ہے، یہ بچہ آخر کس کا ہے؟ اس پر انہوں نے شبہ کا اظہار کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت حکیمانہ اور سادہ عام فہم انداز سے دیہاتی کے تجربہ کے مطابق سمجھا دیا؛ کیونکہ اونٹوں کے معاملے میں دیہاتی ماہر تھا، اس نے حقیقت کو پالیا اور خاموش ہو گیا۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ: محض معمولی باتوں اور ضعیف علامتوں کی بنیاد پر اپنے بچہ کا انکار کرنا منع ہے؛ بلکہ اس صورت میں مضبوط دلائل اور مکمل شہادت کا موجود ہونا ضروری ہے، مثلاً: بیوی سے صحبت نہیں کی اور اس کا بچہ پیدا ہو گیا، یا صحبت کے بعد چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ پیدا ہو گیا، ایسی صورتوں میں انکار کرنا جائز ہے، محض خیالی شبہات پر تہمت لگانا جائز نہیں ہے۔

......☆☆☆......

(ب:۴۳) بَابُ المَرأة تُسلِمُ قَبلَ زوجِها

خاوند سے پہلے بیوی کے اسلام قبول کرنے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا ابْنُ شِهَابٍ، أَنَّ أُمَّ حَكِيمٍ بِنْتَ الْحَارِثِ بْنِ هِشَامٍ كَانَتْ تَحْتَ عِكْرِمَةَ بْنِ أَبِي جَهْلٍ فَأَسْلَمَتْ يَوْمَ الْفَتْحِ، وَخَرَجَ عِكْرِمَةُ هَارِبًا مِنَ الإِسْلامِ حَتَّى قَدِمَ الْيَمَنَ، فَارْتَحَلَتْ أُمُّ حَكِيمٍ حَتَّى قَدِمَتْ فَدَعَتْهُ إِلَى الإِسْلامِ فَأَسْلَمَ، فَقَدِمَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمَّا رَآهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَثَبَ إِلَيْهِ فَرَحًا وَمَا عَلَيْهِ رِدَاؤُهُ حَتَّى بَايَعَهُ.

ترجمہ: ابن شہابؒ بیان کرتے ہیں کہ اُمّ حکیم بنت حارث، عکرمہ بن ابوجہل کی بیوی تھی، اس خاتون نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کرلیا؛ لیکن عکرمہ اسلام سے بھاگتے ہوئے وہاں سے چلے گئے اور یمن آ گئے۔ اُس کے بعد اُمّ حکیم وہاں سے روانہ ہوئیں اور عکرمہ کے پاس آ گئیں اور انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، تو عکرمہ نے اسلام قبول کرلیا۔ جب وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ نے انہیں دیکھ لیا، تو آپ خوشی سے کھڑے ہوگئے۔ آپ نے اُس وقت چادر نہیں اوڑھی ہوئی تھی، پھر حضرت عکرمہ نے آپ کے دست اقدس پر اسلام قبول کرلیا۔

مسئلہ اسلام اَحد الزوجین

تشریح: امام محمد علیہ الرحمہ نے میاں بیوی کے درمیان اختلافِ دین کے ضمن میں عکرمہ بن ابی جہل اور اس کی بیوی اُمّ حکیم کا واقعہ درج فرمایا۔ واقعہ

مذکورہ میں مسئلہ مذکورہ کی ایک شق موجود ہے، وہ یہ کہ عورت مسلمان ہو جائے اور خاوند حالت کفر پر ہو، تو اس کا کیا حل ہے؟ دوسری شق یہ ہے کہ مرد مسلمان ہو جائے اور عورت حالت کفر میں ہو، تو اس بارے میں کیا حکم ہے؟ ان دونوں کا حکم وہی ہے جو اس واقعہ کی روشنی میں امام محمدؒ نے ذکر فرمایا۔ وہ یہ کہ جو بھی دونوں میں سے ابھی حالت کفر میں ہے اور وہ ابھی دارالاسلام میں ہی موجود ہو، تو اسے اسلام لانے اور قبول کرنے کو کہا جائے گا، اگر وہ اسلام قبول کر لے تو نکاح جوں کا توں باقی رہے گا۔ اور اگر انکار کر دے تو ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور یہ تفریق طلاقِ بائنہ ہوگی۔

مذکورہ واقعہ میں ایک وہم ہو سکتا ہے کہ اُمّ حکیم نے جب اسلام قبول کیا تو ان کا خاوند عکرمہ وہاں سے بھاگ کر یمن کی طرف چلا گیا تھا، لہٰذا وہ دارالاسلام میں نہ رہا۔ دوسرا وہم یہ ہو سکتا ہے کہ کیا سرزمین حجاز (مکہ) اس وقت دارالاسلام بن چکی تھی؟

علامہ سرخسیؒ نے "المَبسُوط"، ج:۵، ص:۵۲ پر اس وہم کا جواب دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں: "عِكرِمَة وأُمُّ حَكِيم بن حِزام إنَّما هَرِبَ إلى السَّاحل، وكانت مِن حُدودِ مكّة، فَلَم يُوجَدْ تَبايُن الدّار". یعنی عکرمہ جب مکہ سے بھاگ گیا تو وہ جانب ساحل روانہ ہوا اور ساحل حدودِ مکہ ہی میں شامل ہے، اس لئے یہاں دو مختلف دار نہیں پائے گئے، گویا عکرمہ ابھی حدودِ مکہ میں ہی تھا اور مکہ کے فتح ہو جانے کے بعد اس کے دارالاسلام ہونے میں کونسا شبہ رہ جاتا ہے، لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ عکرمہ کو جو دارالاسلام کی حدود میں رہتے ہوئے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی، اس نے قبول کر لی، اس لئے دونوں میاں بیوی کے درمیان تفریق کی ضرورت نہ پڑی۔

فقہائے کرام کا اختلاف

امام شافعیؒ کا مذہب: امام شافعیؒ کے نزدیک اختلافِ دارین میاں بیوی کے درمیان تفریق کا سبب نہیں بنتا، اس لیے اگر کوئی عورت مسلمان ہو کر دارالاسلام میں آگئی اور اس کا کافر خاوند ابھی دارالحرب میں ہے، تو اس ہجرت کر آنے کو ہم ان کے درمیان تفریق کا سبب نہیں بنائیں گے۔ ہاں! اگر عورت کی عدت گذر گئی اور اس کا خاوند نہ آیا، تو اب تفریق ہو جائے گی۔

امام ابوحنیفہؒ کا مذہب: حنفیہ کے نزدیک دارین کے اختلاف سے نکاح ختم ہو جاتا ہے، یعنی جب میاں بیوی میں سے کوئی ایک دارالحرب سے دارالاسلام میں آگیا؛ خواہ وہ مسلمان ہو کر ہجرت کر کے آگیا، یا اسے قیدی بنا کر لے آئے، تو ان دونوں کا نکاح ٹوٹ جائے گا اور خاوند کے آنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

امام شافعی کی دلیل: حدیث باب ان کا مستدل ہے۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ اُمّ حکیم فتح مکہ میں مسلمان ہو گئیں اور عکرمہ اسلام لانے کے ڈر سے بھاگ کر یمن کی طرف چلے گئے۔ اُمّ حکیم بھی وہاں پہنچ گئیں اور اپنے خاوند کو دعوت اسلام دی وہ مسلمان ہو گئے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ نے اُن کے درمیان تفریق نہیں کی؛ بلکہ آپ خوش ہوئے اور انہیں بیعت سے نوازا۔

دوسری دلیل: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا واقعہ ہے، وہ یہ کہ جب سیدہ زینبؓ نے اسلام قبول کیا تو ان کے خاوند ابوالعاص چھ سال بعد مسلمان ہوئے، اس طویل عرصہ کے بعد اسلام لانے کے

باوجود حضور نے ان کا نکاح قائم رکھا اور آپ نے نکاحِ اوّل کے ساتھ ابوالعاص کو لوٹا دیا۔ (ترمذی، ج:۱، ص:۲۱۷)

پہلی دلیل کا جواب: پہلی دلیل میں حدیث باب ان کا مستدل تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تشریح کرتے وقت ہم نے واقعہ کے ضمن میں ایک وہم کا رد "المَبسُوط" سے ذکر کیا تھا کہ یہاں اختلافِ دارین نہیں پایا گیا؛ کیونکہ عکرمہ ساحل کی طرف گئے تھے اور ساحل حدودِ مکہ ہی میں شامل ہے۔

دوسری دلیل کا جواب: احناف اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ: دیکھو! حضرت ابوالعاص کے واقعہ سے تو آپ حضرات قطعاً استدلال نہیں کر سکتے ہو، ایک تو یہ کہ ترمذی میں جہاں یہ ہے کہ نکاحِ اوّل کے ساتھ لوٹا دیا، وہاں یہ بھی ہے کہ نکاحِ جدید اور مہر جدید کے ساتھ لوٹایا، اب کیا کروگے؟ إذَا تَعَارَضَا تَسَاقَطَا.

اسی طرح آپ حضرات اس واقعہ اور روایت سے اس لیے بھی استدلال نہیں کر سکتے ہو کہ اس میں عدت کی مدت بھی گذر گئی تھی، تین حیض، یا تین ماہ کیا، چھ سال گذر گئے تھے، تو لامحالہ تم بھی تاویل کروگے، ہم بھی تاویل کریں گے، بغیر تاویل کوئی بھی استدلال نہیں کر سکے گا۔ تو تاویلات میں ایک تاویل یہ ہے کہ یہ خصوصیت پیغمبری تھی کہ چھ سال تک سابقہ نکاح برقرار رہا۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ بِالنِّکَاحِ الأوَّل میں ایک تشبیہ کی صورت ہے کہ پہلے نکاح کی طرح مہر جدید اور نکاحِ جدید کے ساتھ نکاح ہوا۔

باقی ترمذی کی دونوں روایتیں صحیح اور درست ہیں۔ اور اس میں واضح تعارض ہے، تو جمہور کہتے ہیں کہ عمرو بن شعیب کی روایت جو ہماری دلیل ہے، کہ نکاحِ جدید ہوا اور مہر جدید رکھا، یہ روایت راجح ہے، چونکہ یہ مثبت ہے اور حضرت ابن عمرؓ

کی روایت نافی ہے۔ اور نافی اور مثبت میں جب تعارض آتا ہے تو مثبت اولیٰ بالترجیح ہوتی ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے توضیحات، ج:۵،ص:۱۱۸ پر دیکھیں)

حنفیہ کی دلیل: احناف نے دلیل میں قرآنِ کریم سے دو آیتیں پیش کی ہیں: اوّل آیت اس طرح ہے: "فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ"۔ (سورۂ ممتحنہ: ۱۰)

اس سے واضح طور پر یہ مسئلہ ثابت ہوجاتا ہے کہ تباینِ دارین فرقت زوجین کا سبب ہے۔

دوسری آیت یہ ہے: "وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ"۔ اگر تباینِ دارین فرقت زوجین کا ذریعہ نہیں تو ان عورتوں سے نکاح کیسے جائز ہوا جن کے شوہر مکہ میں موجود تھے؟

دوسری دلیل: جس کو امام ترمذیؒ نے عمرو بن شعیبؒ کے حوالے سے اپنی کتاب میں نقل کی ہے، الفاظ یہ ہیں: إنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى الله عليه وسلَّم رَدَّ ابنَةَ زَينَبَ عَلٰى أَبِي العَاصِ بن الربيع بِمَهرٍ جَدِيدٍ ونِكَاحٍ جَدِيدٍ. (ترمذی، ج:۱،ص:۲۱۷)

قَالَ مُحَمَّدٌ: إِذَا أَسْلَمَتِ الْمَرْأَةُ وَزَوْجُهَا كَافِرٌ فِي دَارِ الْإِسْلَامِ لَمْ يُفَرَّقْ بَيْنَهُمَا حَتّٰى يُعْرَضَ عَلَى الزَّوْجِ الْإِسْلَامُ، فَإِنْ أَسْلَمَ فَهِيَ امْرَأَتُهُ وَإِنْ أَبَى أَنْ يُسْلِمَ فُرِّقَ بَيْنَهُمَا وَكَانَتْ فُرْقَتُهُمَا تَطْلِيقَةً بَائِنَةً، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ وَإِبْرَاهِيمَ النَّخَعِيِّ.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں جب کوئی عورت اسلام قبول کرلے، اور اس کا شوہر کافر ہو اور اسلامی سلطنت کی حدود میں رہ رہا ہو، تو ان میاں بیوی

کے درمیان اس وقت تک علیحدگی نہیں کی جائے گی جب تک شوہر کو اسلام کی دعوت نہیں دی جاتی، اگر وہ شخص اسلام قبول کر لیتا ہے تو وہ عورت اس کی بیوی شمار ہوگی۔ اور اگر وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے تو ان میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کروادی جائے گی اور یہ علیحدگی ایک بائنہ طلاق شمار ہوگی۔ امام ابوحنیفہؒ اور ابراہیم نخعیؒ اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ امام محمدؒ نے باب میں مذکورہ حدیث سے ایک ضابطہ مستنبط فرمایا ہے کہ: اگر بیوی شوہر سے پہلے اسلام لے آئے تو شوہر پر اسلام پیش کیا جائے گا، اگر وہ اسلام لے آیا تو وہ عورت سابقہ نکاح کے ساتھ بدستور اس کی زوجیت میں رہے گی۔ اور اگر شوہر نے اسلام لانے سے انکار کر دیا، تو ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور یہ تفریق امام احمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایک طلاقِ بائنہ شمار ہوگی، نہ کہ فسخ نکاح؛ اسلئے شوہر کی جانب سے "إمساك بالمعروف" فوت ہونے سے "التسريح بإحسان" متعین ہو گیا، اس لئے اگر وہ طلاق دے دیتا ہے تو فبہا؛ ورنہ قاضی طلاق میں اس کا قائم مقام ہوگا۔

(ب:۴۴) بَابُ انْقِضَاءِ الْحَيْضِ

حیض کے مکمل ہونے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا ابْنُ شِهَابٍ، عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ، عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: انْتَقَلَتْ حَفْصَةُ بِنْتُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ حِينَ دَخَلَتْ فِي الدَّمِ مِنَ الْحَيْضَةِ الثَّالِثَةِ، فَذَكَرْتُ ذَلِكَ لِعَمْرَةَ بِنْتِ

عَبْدِ الرَّحْمَنِ، فَقَالَتْ: صَدَقَ عُرْوَةُ، وَقَدْ جَادَلَهَا فِيهِ نَاسٌ، وَقَالُوا، إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُولُ: (ثَلاثَةَ قُرُوءٍ)، فَقَالَتْ: صَدَقْتُمْ، وَتَدْرُونَ مَا الأَقْرَاءُ؟ إِنَّمَا الأَقْرَاءُ: الأَطْهَارُ.

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا ابْنُ شِهَابٍ، عَنْ أَبِي بَكْرِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ هِشَامٍ، أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ مِثْلَ ذَلِكَ.

ترجمہ: عروہ بن زبیرؒ سیدہ عائشہؓ کے بارے میں یہ بات نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ کی صاحبزادی حفصہؓ کا جب تیسرا حیض شروع ہوا تو وہ (اپنے عدت والے گھر سے دوسری جگہ) منتقل ہوگئی۔ابن شہابؒ کہتے ہیں: جب میں نے اس روایت کا تذکرہ عمرہ بنت عبدالرحمٰنؒ سے کیا تو وہ بولیں: عروہ نے سچ کہا۔لوگوں نے اس بارے میں ان سے اختلاف بھی کیا تھا۔لوگوں نے یہ کہا تھا کہ: اللہ تعالیٰ تو اپنی کتاب میں "ثَلاثَةَ قُرُوْء" فرماتا ہے۔حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ: تم سچ کہتے ہو، لیکن جانتے ہو کہ "الاقراء" کیا ہے؟ اس سے مراد "الاطہار" یعنی پاکی ہے۔حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰنؒ بھی اسی کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔

لفظ "قروء" سے کیا مراد ہے؟

تشریح: مذکورہ روایت سے معلوم ہوا کہ عورت کی عدت تین قروء ہے؛ لیکن لفظ قروء سے مراد حیض ہے یا طہر؟ اس میں اختلاف ہے۔چنانچہ اُمّ المومنین عائشہ صدیقہؓ اس سے طہر مراد لیتی ہیں۔اور طلاق کا سنت طریقہ جب یہ قرار پایا کہ ایسے طہر میں طلاق دی جائے جس میں وطی نہ کی ہو، تو سنت طریقہ کے مطابق اگر کسی نے طہر میں طلاق دی تو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: اس عورت کو

''تین قروء'' یعنی تین طہر عدت گذارنی ہے۔ ایک طہر وہ جس میں طلاق ہوئی اور دو اور طہر گذارنے پر عدت پوری ہو جائے گی، لہٰذا تیسرے طہر کے اختتام پر جو حیض آئے گا وہ طلاق کے بعد اگرچہ تیسرا حیض ہے؛ لیکن اس سے قبل تین طہر مکمل ہو چکے ہیں، اس لئے اب تیسرے حیض میں مرد اس عورت سے رجوع کر سکتا ہے۔ اُمّ المومنین اس مسئلہ میں یہی فتویٰ دیا کرتی تھیں، لیکن کثیر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مراد الگ ہے، جس کی تفصیل ہم آنے والی روایت میں ذکر کریں گے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، وَزَيْدُ بْنُ أَسْلَمَ، عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ، أَنَّ رَجُلا مِنْ أَهْلِ الشَّامِ يُقَالُ لَهُ: الأَحْوَصُ، طَلَّقَ امْرَأَتَهُ، ثُمَّ مَاتَ حِينَ دَخَلَتْ فِي الدَّمِ مِنَ الْحَيْضَةِ الثَّالِثَةِ، فَقَالَتْ: أَنَا وَارِثَتُهُ، وَقَالَ بَنُوهُ: لا تَرِثِينَهُ، فَاخْتَصَمُوا إِلَى مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ، فَسَأَلَ مُعَاوِيَةُ فَضَالَةَ بْنَ عُبَيْدٍ وَنَاسًا مِنْ أَهْلِ الشَّامِ، فَلَمْ يَجِدْ عِنْدَهُمْ عِلْمًا فِيهِ، فَكَتَبَ إِلَى زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ، فَكَتَبَ إِلَيْهِ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ: أَنَّهَا إِذَا دَخَلَتْ فِي الدَّمِ مِنَ الْحَيْضَةِ الثَّالِثَةِ فَإِنَّهَا لا تَرِثُهُ، وَلا يَرِثُهَا، وَقَدْ بَرِءَتْ مِنْهُ وَبَرِءَ مِنْهَا. أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ مَوْلَى ابْنِ عُمَرَ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، مِثْلَ ذَلِكَ

ترجمہ: سلیمان بن یسارؒ بیان کرتے ہیں کہ (ملک) شام سے تعلق رکھنے والا ایک شخص جس کا نام ''احوص'' تھا، اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، پھر ابھی عورت کا تیسرا حیض شروع ہوا تھا کہ اسی دوران اس شخص کا انتقال ہو گیا، وہ عورت بولی کہ: میں اس شخص کی وارث ہوں۔ اس شخص کے بیٹوں نے یہ کہا کہ: تم اس کی وارث نہیں بنوگی۔ یہ لوگ اپنا مقدمہ لے کر

حضرت معاویہ بن ابوسفیانؓ کے پاس آئے، تو حضرت معاویہؓ نے فضالہ بن عبیدؓ سے اور شام سے تعلق رکھنے والے دیگر افراد سے اس بارے میں دریافت کیا، تو انہیں اس بارے میں کوئی علم نہیں تھا، پھر ان لوگوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کو خط لکھا تو انہوں نے جواب میں لکھا کہ جب عورت کو (عدت کے دوران) تیسرا حیض شروع ہو جائے تو وہ عورت اپنے شوہر کی وارث نہیں بنے گی اور وہ مرد اس عورت کا وارث نہیں بنے گا، اس عورت کا تعلق اس سے ختم ہو گیا ہے، اور اس مرد کا بھی تعلق اس سے ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے حوالے سے بھی اسی کے مانند منقول ہے۔

تشریح: یہ روایت بھی اُمّ المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے فرمان کے مطابق اسی بات پر دلالت کرتی ہے کہ کلام اللہ میں "تین قروء" کی جو عدت مذکور ہے، تو اس "قروء" سے مراد طہر ہے۔ یہی امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔ چنانچہ مذکورہ واقعہ بھی "طہر" کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ، "اَحوص" نامی شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی، جب تیسرا حیض اُس کو شروع ہوا، اَحوص مر گئے، معاویہ بن ابی سفیانؓ نے زید بن ثابتؓ کو لکھ کر بھیجا کہ اس کا کیا حکم ہے؟ زید بن ثابتؓ نے جواب میں لکھا کہ: جب اسے تیسرے حیض کا خون شروع ہو تو عورت کا مرد سے اور مرد کا عورت سے کوئی تعلق نہ رہا اور وہ ایک دوسرے کی میراث نہیں پائیں گے۔ معلوم ہوا کہ عورت کی عدت تین طہر مکمل ہو چکی ہے، اس لیے میراث نہیں ملے گی۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: انْقِضَاءُ الْعِدَّةِ عِنْدَنَا الطَّهَارَةُ مِنَ الدَّمِ مِنَ الْحَيْضَةِ الثَّالِثَةِ إِذَا اغْتَسَلَتْ مِنْهَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک تیسرے حیض کے خون

کے بعد جب طہر آئے گا اور وہ عورت اسکے بعد غسل کر لے گی، اس وقت اس کی عدت ختم ہوگی۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ: یہ مسئلہ صحابۂ کرامؓ اور بعد کے تابعین اور فقہاء کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے، کہ آزاد معتدہ کی عدت تین حیض ہوگی، یا تین طہر؟ حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ: حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ہمارے اکثر فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ وہ اپنی عدت تین حیض گذارے گی، لہٰذا جب تیسرے حیض سے پاک ہوکر غسل کرلے گی، تو اس کی عدت پوری ہوجائے گی۔ لیکن مطلقہ عدت کس کے ذریعہ گذارے گی؟ آیا طہر کے ذریعہ یا حیض کے ذریعہ؟ تو اس میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔

مطلقہ کی عدت میں فقہائے کرام کا اختلاف

امام شافعیؒ امام مالکؒ کا مذہب: یہ ہے کہ آزاد معتدہ کی عدت تین طہر ہے۔

امام ابوحنیفہؒ وامام احمدؒ کا مذہب: یہ ہے کہ آزاد معتدہ کی عدت تین حیض ہے۔

امام شافعی کی دلیل: یہ ہے کہ قرآن پاک میں آتا ہے: "اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ"۔ اس آیت میں "لِعِدَّتِهِنَّ" میں لام بمعنیٰ: وقت کے ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ: تم عورتوں کو طلاق دو ان کی عدت کے وقت۔ اور زمانۂ حیض میں طلاق دینا بالاتفاق بدعت اور حرام ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ عدت اور طلاق کا وقت ایک ہی ہے اور طلاق کی مشروعیت کا وقت طہر ہے، لہٰذا عدت کا وقت بھی طہر ہوگا اور مطلقہ طہر کے ساتھ عدت گذارے گی، نہ کہ حیض کے ساتھ۔

دوسری دلیل: عَن عُمرة بنت عَبدِ الرَّحمٰن؛ قالتْ عَائشَةؓ:

صَدقتُم، وتَدرُونَ مَا الأقرَاءُ؟ إنَّمَا الأقرَاءُ الأطهَارُ.

دلیل کا جواب: یہ ہے کہ ”فَطَلِّقُوھُنَّ لِعِدَّتِہِنَّ“ کی لام بمعنی وقت نہیں؛ بلکہ بلکہ لام سببیہ ہے: ”أي: فَطَلِّقُوھُنَّ لِأجَلِ عِدَّتِہِنَّ“ یعنی تم اس طہر میں طلاق دو جس میں وطی نہیں پائی گئی؛ تاکہ مطلقہ عورتیں حیض کے ساتھ عدت گزار سکیں۔ اگر تم بیویوں کو اس طہر میں طلاق دو گے جس میں تم نے وطی کی ہے، تو بیوی کا حاملہ بننے کا خطرہ ہے اور عدت لمبی ہو جائے گی، جس سے بیوی زیادہ مشقت میں پڑ جائے گی۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”وَالّٰئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُہُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشْہُرٍ وَّالّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ“.

(ترجمہ) ”اور جو عورتیں نا اُمید ہو گئیں حیض سے تمہاری عورتوں میں سے، اگر تم کو شبہ رہ گیا تو ان کی عدت تین ماہ ہیں۔ اور ایسے ہی جن کو حیض نہیں آیا“۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے غیر حائضہ کی عدت عدمِ حیض کی وجہ سے تین ماہ مقرر کی ہے، لہٰذا حائضہ کی عدت تین حیض ہوں گے۔ اور ہر ماہ ایک حیض کے قائم مقام ہوگا۔ اور جب اس آیت سے حائضہ کی عدت کا تین ماہ ہونا ثابت ہوتا ہے تو ”ثَلاثَۃَ قُرُوْءٍ“ سے حیض مراد ہوگا؛ کیوں کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے، چنانچہ کہا گیا ہے: إنَّ القُرآنَ یُفسِّرُ بعضُہُ بَعضًا.

دوسری دلیل: حدیث عائشہؓ ہے: إنَّ رسُولَ اللہ صَلَّی اللہُ علیہ وسلَّم قال: طلاقُ الأمَۃِ تطلِیقتَان، وَ عِدَّتُہا حَیضَتان. یعنی باندی کی طلاقیں دو ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہیں۔ باندی کا حق چونکہ آزاد عورت کی بہ نسبت آدھا ہوتا ہے اس لئے باندی کی طلاق ڈیڑھ، اور عدت ڈیڑھ حیض ہونی

چاہیے تھی؛ مگر چونکہ طلاق اور حیض متجزی نہیں ہوتے، اس لیے دو طلاق اور دو حیض پورے کر دیئے گئے۔

الحاصل اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ باندی حیض کے ذریعہ عدت گذارے گی، اور جب باندی حیض سے عدت گذارے گی، تو آزاد عورت بھی حیض ہی سے عدت گذارے گی۔ اور حدیث چونکہ شارحِ قرآن ہے، اس لیے اس حدیث سے بھی ثابت ہو گیا کہ "ثَلاثَةَ قُرُوْءٍ" میں لفظ "قروء" سے حیض مراد ہے نہ کہ طہر۔

أَخْبَرَنَا أَبُو حَنِيفَةَ، عَنْ حَمَّادٍ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ، أَنَّ رَجُلا طَلَّقَ امْرَأَتَهُ تَطْلِيقَةً يَمْلِكُ الرَّجْعَةَ، ثُمَّ تَرَكَهَا حَتَّى انْقَطَعَ دَمُهَا مِنَ الْحَيْضَةِ الثَّالِثَةِ وَدَخَلَتْ مُغْتَسَلَهَا، وَأَدْنَتْ مَاءَ هَا، فَأَتَاهَا فَقَالَ لَهَا: قَدْ رَاجَعْتُكِ، فَسَأَلَتْ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ عَنْ ذَلِكَ وَعِنْدَهُ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْعُودٍ، فَقَالَ عُمَرُ: قُلْ فِيهَا بِرَأْيِكَ، فَقَالَ: أُرَاهُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ أَحَقَّ بِرَجْعَتِهَا مَا لَمْ تَغْتَسِلْ مِنْ حَيْضَتِهَا الثَّالِثَةِ، فَقَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: وَأَنَا أَرَى ذَلِكَ، ثُمَّ قَالَ عُمَرُ لِعَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ: كُنَيْفٌ مُلِءَ عِلْمًا.

ترجمہ: ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک مرتبہ اپنی بیوی کو ایک طلاق دی، جس میں اس کے پاس رجوع کا حق تھا، پھر اس نے اپنی بیوی کو ایسے ہی رہنے دیا، یہاں تک کہ (عدت کے دوران) تیسرے حیض کا خون بند ہو گیا اور وہ عورت غسل خانے میں داخل ہوئی اور پانی کے قریب پہنچی تو وہ شخص اس عورت کے پاس آیا اور اس سے کہا: میں نے تم سے رجوع کر لیا

ہے۔ اس عورت نے حضرت عمر بن خطابؓ سے اس بارے میں دریافت کیا:
اس وقت حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی موجود
تھے، حضرت عمرؓ نے اُن سے کہا: آپ اس بارے میں اپنی رائے پیش کریں، تو
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا: اے امیر المومنین! میں یہ سمجھتا ہوں کہ مرد کو
اس عورت کے ساتھ رجوع کرنے کا حق حاصل ہے جب تک وہ تیسرے حیض
کے بعد غسل نہیں کر لیتی، تو حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا: میری بھی یہی
رائے ہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمایا: یہ علم سے
بھرے ہوئے ہیں (یعنی بہت بڑے عالم ہیں)۔

تشریح: ماقبل میں پہلی روایت کے ضمن میں یہ بات آچکی ہے کہ لفظ
''قروء'' سے مراد حیض ہے، یا طہر؟ اس میں اختلاف ہے۔ حضرت عائشہؓ طہر مراد
لیتی ہیں، جیسا کہ ذکر ہو چکا، لیکن کثیر صحابۂ کرام اور حضراتِ حنفیہ ''قروء'' سے مراد
حیض لیتے ہیں۔ اور اس روایت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ لفظ قروء سے مراد حیض
ہے اور عورت کی عدت تیسرے حیض کے ختم ہونے کے بعد غسل کر کے کپڑے سمیٹنے
تک باقی رہتی ہے، اس سے قبل اگر کسی نے رجوع کر لیا تو جائز ہے، چنانچہ روایت
میں ہے کہ جب وہ عورت غسل کرنے کے لیے پانی کے قریب پہنچی تو شوہر کہنے لگا
کہ: میں نے تم سے رجوع کر لیا ہے، تو وہ عورت اس مسئلہ کو لے کر حضرت عمر بن
خطابؓ کے پاس گئی، وہاں عبداللہ بن مسعودؓ بھی موجود تھے، تو حضرت عمر بن
خطابؓ نے اُن سے کہا کہ: اس مسئلہ میں اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔ حضرت
عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا: اے امیر المومنین! مرد کو اس عورت سے رجوع کرنے کا
حق حاصل رہتا ہے جب تک وہ تیسرے حیض سے فارغ ہو کر غسل نہ کر لے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا: میری بھی رائے یہی ہے۔

أَخْبَرَنَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، قَالَ: قَالَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: هُوَ أَحَقُّ بِهَا حَتَّى تَغْتَسِلَ مِنْ حَيْضَتِهَا الثَّالِثَةِ.

أَخْبَرَنَا عِيسَى بْنُ أَبِي عِيسَى الْخَيَّاطُ الْمَدِينِيُّ، عَنِ الشَّعْبِيِّ، عَنْ ثَلاثَةَ عَشَرَ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، كُلُّهُمْ قَالُوا: الرَّجُلُ أَحَقُّ بِامْرَأَتِهِ حَتَّى تَغْتَسِلَ مِنْ حَيْضَتِهَا الثَّالِثَةِ، قَالَ عِيسَى: وَسَمِعْتُ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيِّبِ، يَقُولُ: الرَّجُلُ أَحَقُّ بِامْرَأَتِهِ حَتَّى تَغْتَسِلَ مِنْ حَيْضَتِهَا الثَّالِثَةِ.

ترجمہ: سعید بن میبؒ فرماتے ہیں کہ: حضرت علیؓ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ جب تک عورت تیسرے حیض کے بعد غسل نہیں کر لیتی، اس وقت تک مرد کو اس سے رجوع کا حق حاصل ہوگا۔

شعبی نے تیرہ (۱۳) صحابۂ کرام کے حوالے سے یہ بات نقل کی ہے کہ وہ سب اس بات کے قائل ہیں کہ جب تک عورت تیسرے حیض کے بعد غسل نہیں کر لیتی، اس وقت تک مرد کو اس سے رجوع کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

عیسیٰ فرماتے ہیں: میں نے سعید بن میبؒ کو فرماتے ہوئے سنا کہ آدمی کو اپنی بیوی کے بارے میں حق حاصل رہے گا، جب تک وہ عورت تیسرے حیض کے بعد غسل نہیں کر لیتی۔

تشریح: ذکر کردہ دونوں روایتوں سے بھی یہی ثابت ہوا کہ لفظ ''قروء'' سے مراد حیض ہے۔ اور عدت کا شمار حیض سے ہوگا، نہ کہ طہر سے۔ اور

عورت کا جب تک تیسرا حیض نہ گذرنے پائے اور وہ غسل سے فارغ نہ ہولے، مرد کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے۔

لیکن ایک بات اس موقع پر ذکر کردینا ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ احناف نے اس میں تفصیل بیان کی ہے کہ حیض کی اکثر مدت جب ہمارے نزدیک دس دن ہے اور کم از کم تین دن ہے تو ایک عورت کو صورتِ مذکورہ میں تیسرا حیض دس دن مکمل آکر بند ہوا، تو احناف کے نزدیک حیض کے انقطاع کے ساتھ ہی عدت ختم ہوجائے گی، یہاں غسل کرکے کپڑے پہننا عدت میں شمار نہ ہوگا، لہٰذا انقطاع حیض سے چند لمحے قبل رجوع درست ہوگا، مکمل انقطاع کے بعد رجوع نہیں ہوسکتا، خواہ اس نے غسل کیا ہو یا نہ کیا ہو، ہاں! اگر دس دن سے کم اور تین دن سے زائد حیض آیا تو اس صورت میں غسل کرنے اور کپڑے پہننے تک رجوع کا حق رہتا ہے۔

(مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: احکام القرآن للجصاص، ج:۱، ص:۳۵۰)

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذا نَأخُذُ، وَهُوَ قَولُ أبِي حَنِيفَةَ وَالعَامَةِ مِن فُقَهَائِنَا

ترجمہ: حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ اور امام صاحب اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہمارا مسلک بھی امام صاحب کے مسلک کے مطابق ہے کہ قرآن میں "ثَلَاثَةَ قُرُوْء" میں "قروء" سے مراد حیض ہے، نہ کہ طہر اور مرد عورت سے رجوع کرنے کا حق رکھتا ہے، جب تک عورت تیسرے حیض کا غسل نہیں کرلیتی، جب غسل کرلے گی تو رجوع کا اختیار ختم ہوجائے گا۔ مزید تفصیل ماقبل میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

(ب:۴۵) بَابُ المَرأة يُطلِّقُهَا زوجُهَا طلاقًا يَملِكُ الرَّجعَةَ فَتَحِيضُ حَيضَةً أوْ حَيضَتَينِ ثُمَّ تَرتَفِعُ حَيضَتُهَا

مرد اپنی بیوی کو طلاقِ رجعی دے، پھر اس عورت کو ایک یا دو حیض آکر مزید حیض آنا بند ہو جائے، اس کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيَى بْنِ حِبَّانَ، أَنَّهُ كَانَ عِنْدَ جَدِّهِ امْرَأَتَانِ هَاشِمِيَّةٌ، وَأَنْصَارِيَّةٌ، فَطَلَّقَ الأَنْصَارِيَّةَ وَهِيَ تُرْضِعُ، وَكَانَتْ لا تَحِيضُ وَهِيَ تُرْضِعُ فَمَرَّ بِهَا قَرِيبٌ مِنْ سَنَةٍ، ثُمَّ هَلَكَ زَوْجُهَا حِبَّانُ عِنْدَ رَأْسِ السَّنَةِ، أَوْ قَرِيبٌ مِنْ ذَلِكَ لَمْ تَحِضْ، فَقَالَتْ: أَنَا أَرِثُهُ مَا لَمْ أَحِضْ، فَاخْتَصَمُوا إِلَى عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فَقَضَى لَهَا بِالْمِيرَاثِ، فَلامَتِ الْهَاشِمِيَّةُ عُثْمَانَ، فَقَالَ: هَذَا عَمَلُ ابْنِ عَمِّكِ هُوَ أَشَارَ عَلَيْنَا بِذَلِكَ، يَعْنِي عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ كَرَّمَ اللَّهُ وَجْهَهُ.

ترجمہ: محمد بن یحییٰ بیان کرتے ہیں: ان کے دادا کی دو بیویاں تھیں، ان میں سے ایک ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور ایک انصاری تھیں۔ انصاری خاتون کو انھوں نے طلاق دیدی، جس دوران وہ اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی اُس دوران اُسے حیض نہیں آرہا تھا، تو تقریباً ایک سال کا عرصہ گذر گیا، جب اسے حیض نہیں آیا اس کے بعد اس کے شوہر حضرت حبان کا تقریباً ایک

سال بعد یا اس کے آس پاس انتقال ہو گیا، لیکن اس سارے عرصے کے دوران اس عورت کو حیض نہیں آیا (حضرت حبان کے انتقال پر) اس عورت نے کہا: میں اس کی وارث بنوں گی، جب تک مجھے حیض نہیں آجاتا، یہ لوگ اپنا مقدمہ لے کر حضرت عثمان غنیؓ کے پاس گئے، تو حضرت عثمان غنیؓ نے اس عورت کو وارث قرار دیا، اس بات پر ہاشمی عورت نے حضرت عثمانؓ کو ملامت کی، تو حضرت عثمانؓ بولے: تمہارے چچازاد بھائی اسی بات کے قائل ہیں۔ راوی کہتے ہیں: حضرت عثمانؓ نے حضرت علی بن ابوطالبؓ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

تشریح: اس روایت میں حضرت حبانؓ کی دو بیویوں کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی انصاری بیوی کو طلاق دی، چونکہ وہ بچی کو دودھ پلاتی تھی اس لئے اسے ایک سال تک حیض نہیں آیا، حبانؓ نے رجوع نہ کیا اور سخت بیمار ہو کر زندگی سے نا اُمید ہو گئے، انصاری بیوی کو مسئلہ معلوم تھا کہ مجھ جیسی عورت کی عدت تین حیض ہے، کیونکہ نہ تو میں بالغہ ہوں کہ حیض نہ آتا ہو اور نہ ہی اتنی بوڑھی ہوں کہ حیض آنا بالکل بند ہو گیا ہو، ایسی حالت میں میاں بیوی میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو باقی (زندہ) رہنے والا مرنے والے کا وارث بنتا ہے، لہٰذا میں اپنے خاوند کی بصورتِ وفات میراث لوں گی۔

ہاشمیہ عورت اور انصاریہ عورت عدمِ اتفاق کی وجہ سے مقدمہ حضرت عثمانؓ کے پاس لے گئیں، آپ نے انصاریہ کے حق میں فیصلہ سنا دیا، جس پر ہاشمیہ کو رنج ہوا، تو آپ نے فرمایا کہ: یہ فیصلہ حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کا ہے۔

(مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: بیہقی شریف، ج:۷، ص:۴۱۹)

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا يَزِيدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ قُسَيْطٍ، وَيَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ،

عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، أَنَّهُ قَالَ: قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: أَيُّمَا امْرَأَةٍ طُلِّقَتْ فَحَاضَتْ حَيْضَةً، أَوْ حَيْضَتَيْنِ ثُمَّ رُفِعَتْ حَيْضَتُهَا فَإِنَّهَا تَنْتَظِرُ تِسْعَةَ أَشْهُرٍ فَإِنِ اسْتَبَانَ بِهَا حَمْلٌ فَذَلِكَ وَإِلا اعْتَدَّتْ بَعْدَ التِّسْعَةِ ثَلَاثَةَ أَشْهُرٍ ثُمَّ حَلَّتْ.

ترجمہ: سعید بن میّبؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے یہ فرمایا ہے کہ جس عورت کو طلاق ہو جائے اور اسے ایک یا دو حیض آجائے پھر اس کو حیض آنا بند ہو جائے، تو وہ نو ماہ تک انتظار کرے گی، اگر اس کے دوران اس کا حمل ظاہر ہو جاتا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ نو ماہ گذرنے کے بعد تین ماہ تک عدت بسر کرے گی، پھر اس کی عدت پوری ہو جائے گی۔

تشریح: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: جب کسی عورت کو طلاق ہو جائے اور اس عورت کو ایک یا دو حیض آنے کے بعد خون آنا بالکل بند ہو جائے، تو اسے نو ماہ کا انتظار کرنا چاہئے، اس کے بعد تین مہینے اور عدت گذارے۔ اس کا پس منظر یوں ہے کہ جب ایک عورت کو ایک دو حیض آکر خون بند ہو گیا تو ایسا تین صورتوں میں سے ایک ہوگا، یا تو حاملہ ہونے کی وجہ، یا پھر خونِ حیض سے بالکل نا اُمید ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا۔ پہلی صورت میں اگر حمل ظاہر ہو جائے تو پھر بالاتفاق اس کی عدت وضع حمل ہوگی۔ اور اگر حمل ظاہر نہیں ہوا؛ بلکہ پتہ چلا کہ یہ نا اُمیدی کی وجہ سے ہے، تو اب مزید تین ماہ عدت گذارنے پڑیں گے، یہ حضرت عمرؓ کا قول ہے۔

أَخْبَرَنَا أَبُو حَنِيفَةَ، عَنْ حَمَّادٍ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ، أَنَّ عَلْقَمَةَ بْنَ قَيْسٍ، طَلَّقَ امْرَأَتَهُ طَلَاقًا يَمْلِكُ الرَّجْعَةَ فَحَاضَتْ حَيْضَةً، أَوْ حَيْضَتَيْنِ، ثُمَّ

ارْتَفَعَ حَيْضُهَا عَنْهَا ثَمَانِيَةَ عَشَرَ شَهْرًا، ثُمَّ مَاتَتْ فَسَأَلَ عَلْقَمَةُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُودٍ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالَ: هٰذِهِ امْرَأَةٌ حَبَسَ اللّٰهُ عَلَيْكَ مِيرَاثُهَا فَكُلْهُ.

أَخْبَرَنَا عِيسَى بْنُ أَبِي عِيسَى الْخَيَّاطُ، عَنِ الشَّعْبِيِّ، أَنَّ عَلْقَمَةَ بْنَ قَيْسٍ سَأَلَ ابْنَ عُمَرَ عَنْ ذٰلِكَ فَأَمَرَهُ بِأَكْلِ مِيرَاثِهَا.

ترجمہ: ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ علقمہ بن قیس نے اپنی بیوی کو ایک طلاق دیدی، جس میں انہیں رجوع کا حق حاصل تھا، اس عورت کو شاید ایک یا دو مرتبہ حیض آیا، اس کے بعد اسے حیض آنا بند ہوگیا اور اٹھارہ ماہ تک نہیں آیا، اس کے بعد اس خاتون کا انتقال ہوگیا۔ علقمہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس بارے میں دریافت کیا، تو حضرت عبداللہؓ نے فرمایا: یہ ایسی عورت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے روک دیا تھا؛ تاکہ تمہیں اس کی وراثت مل جائے، تو اب تم اسے استعمال کرو۔ شعبیؒ بیان کرتے ہیں کہ علقمہ بن قیس نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے اس بارے میں دریافت کیا، تو حضرت عبداللہؓ نے انہیں اس عورت کی وراثت لینے کی ہدایت دی۔

تشریح: اس روایت میں علقمہ بن قیس کی بیوی کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی بیوی کو ایک طلاقِ رجعی دی، پھر اسے ایک یا دو حیض آیا اور پھر حیض آنا بند ہوگیا، تو اس سلسلے میں حضرت عمر بن خطابؓ کا ارشاد ماقبل میں مذکور ہوا کہ اس عورت کو نو ماہ کا انتظار کرنا پڑے گا اور اس کے بعد مزید تین ماہ اور عدت گذارنے ہوں گے، لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تین ماہ گذارنے کے قائل نہیں ہیں۔ اور اس روایت میں علقمہ نے اپنی بیوی کے سلسلے میں انہیں سے دریافت کیا

تھا، چنانچہ حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ: جب عورت حیض سے نا اُمید ثابت ہوجائے تو اس کی عدت مہینوں سے ہوتی ہے اور تین ماہ اس کے پورے ہوچکے ہیں، اس لیے ترجیح حضرت ابن مسعودؓ کے قول کو ہوگی۔ اور اگر ایک–دو حیض آنے کے بعد نہ تو حمل ظاہر ہوا، نہ ہی وہ عورت نا اُمید ہے؛ بلکہ کسی عارضہ کی بناء پر حیض آنے میں دیر ہوگئی، جیسا کہ علقمہ بن قیس کی بیوی کو بوجہ دودھ پلانے کے اٹھارہ (۱۸) ماہ تک حیض نہ آیا، پھر اس کا انتقال ہوگیا، تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے علقمہ کو اس کا وارث قرار دیا؛ کیونکہ ابھی اس کی عدت ختم نہیں ہوئی تھی۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: فَهَذَا أَكْثَرُ مِنْ تِسْعَةِ أَشْهُرٍ وَثَلاثَةِ أَشْهُرٍ بَعْدَهَا، فَبِهَذَا نَأْخُذُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا، لأَنَّ الْعِدَّةَ فِي كِتَابِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى أَرْبَعَةِ أَوْجُهٍ لا خَامِسَ لَهَا: لِلْحَامِلِ حَتَّى تَضَعَ وَالَّتِي لَمْ تَبْلُغِ الْحَيْضَةَ ثَلاثَةُ أَشْهُرٍ، وَالَّتِي قَدْ يَئِسَتْ مِنَ الْمَحِيضِ ثَلاثَةُ أَشْهُرٍ، وَالَّتِي تَحِيضُ ثَلاثُ حِيَضٍ، فَهَذَا الَّذِي ذَكَرْتُمْ لَيْسَ بِعِدَّةِ الْحَائِضِ، وَلا غَيْرِهَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ نو ماہ اور اس کے بعد مزید تین ماہ سے زیادہ کی مدت ہے۔ ہم اس روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی کتاب میں عدت کی چار صورتیں بیان ہوئی ہیں، کوئی پانچویں صورت نہیں ہے۔ حاملہ عورت کی عدت یہ ہے کہ وہ بچے کو جنم دے۔ جس عورت کو حیض آنا شروع نہیں ہوا، اس کی عدت تین ماہ ہے۔ جو عورت حیض سے مایوس ہوچکی ہو، اس کی عدت مہینوں کے اعتبار سے ہے۔ اور جس عورت کو حیض آتا ہے اس کی عدت

تین حیض ہے، تو جس عورت کا آپ لوگوں نے ذکر کیا ہے، اس میں نہ تو حیض والی عورت کی عدت ہے اور نہ ہی دوسری کسی قسم کی عدت ہے۔

تشریح: فھٰذا أکثر: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ اس عبارت سے یہ بتا رہے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا فتویٰ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عمرؓ کے فتویٰ کے معارض ہے اور ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے قول پر ہی فتویٰ دیا ہے۔

لأنّ العِدَّةَ: سے اس کی وجہ بیان کی ہے کہ جب ہم نے اللہ کے فرمان "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ" کے مطابق کتاب اللہ کی طرف رجوع کیا، تو اس میں صرف چار قسم کی عورتوں کو پایا: (۱) حاملہ، اس کی عدت وضع حمل ہے۔ (۲) نابالغہ کی تین ماہ۔ (۳) حیض والی کی تین حیض۔ (۴) آئِسة (نا اُمید) کی تین ماہ۔

تو کتاب اللہ کے رو سے حضرت عمرؓ کے فتویٰ میں جو عدت معتدہ کی ذکر کی گئی ہے، نہ تو وہ حائضہ عورت کی عدت کے دائرے میں آتی ہے اور نہ غیر حائضہ کے، اس لیے چوں کہ یہ معتدہ حائضہ ہے، اس لیے کتاب اللہ میں ذکر کردہ مدت عدت تین حیض جب تک اس پر نہیں گذریں گے اس کی عدت پوری نہیں ہوگی، اس کے علاوہ کوئی اور عدت اس کے عدت کے پورا ہونے کی متعین کرنا درست نہیں ہوگا۔

(ب:۴۶) بَابُ عِدَّةِ المُستَحاضَةِ

مستحاضہ کی عدت کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا ابْنُ شِهَابٍ، أَنَّ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيِّبِ، قَالَ: عِدَّةُ الْمُسْتَحَاضَةِ سَنَةٌ.

ترجمہ: سعید بن میسّبؒ بیان کرتے ہیں کہ استحاضہ کا شکار عورت کی عدت ایک سال ہوگی۔

خونِ استحاضہ کسے کہتے ہیں؟

تشریح: خونِ استحاضہ وہ خون ہے جو کسی بیماری کی بناء پر عورت کو آئے، اس کا اخراج رحم سے متعلق نہیں اور یہ خون لگاتار آئے، جس سے یہ معلوم نہ ہو سکے کہ یہ حیض کا خون ہے، یا بیماری کی وجہ سے آیا ہے۔ ایسی عورت کی عدت اگرچہ سعید بن میسّبؒ نے ایک سال بیان فرمائی، لیکن یہ جمہور صحابۂ کرامؓ کے خلاف ہے۔ مستحاضہ کی عدت قولِ مشہور و معروف میں یوں ہے کہ استحاضہ کا لگاتار خون آنے سے قبل دیکھیں گے کہ اس عورت کو زمانۂ گذشتہ میں کتنے دن حیض آتا تھا، اب اس کے بعد اس کی طہارت کے دن شمار کریں گے، تو اس طرح جب تین مرتبہ حیض کے دن گذر جائیں تو اس کی عدت ختم ہو جائے گی؛ خواہ یہ مدت ایک سال سے کم ہو یا زیادہ۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: الْمَعْرُوفُ عِنْدَنَا أَنَّ عِدَّتَهَا عَلَى أَقْرَائِهَا الَّتِي كَانَتْ تَجْلِسُ فِيمَا مَضَى، وَكَذَلِكَ قَالَ إِبْرَاهِيمُ النَّخعِيُّ وَغَيْرُهُ مِنَ الْفُقَهَاءِ، وَبِهِ نَأْخُذُ. وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا. أَلا تَرَى أَنَّهَا تَتْرُكُ الصَّلاةَ أَيَّامَ أَقْرَائِهَا الَّتِي كَانَتْ تَجْلِسُ لأَنَّهَا فِيهِنَّ حَائِضٌ؟ فَكَذَلِكَ تَعْتَدُّ بِهِنَّ، فَإِذَا مَضَتْ ثَلاثَةُ قُرُوءٍ مِنْهُنَّ بَانَتْ إِنْ كَانَ ذَلِكَ أَقَلَّ مِنْ سَنَةٍ، أَوْ أَكْثَرَ.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ بات معروف ہے کہ اس کی عدت قروء کے اعتبار سے ہوگی، جس کے حساب سے وہ پہلے (طہر

کے دن) گذارا کرتی تھی ، ابراہیم نخعیؒ اور دیگر فقہاء نے اسی طرح بیان کیا ہے۔
ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔ کیا آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ وہ عورت اپنے قروء کے دن کے دوران نماز ترک کر دیتی تھی ، جن دنوں میں وہ پہلے بیٹھی رہا کرتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دوران اسے حیض آجایا کرتا تھا ، تو وہ اس حساب سے اُن کی گنتی کیا کرتی تھی ، پھر جب اس عورت کے تین قروء گذر جائیں گے تو وہ اپنے شوہر سے الگ ہو جائے گی ، اگرچہ یہ مدت ایک سال سے کم ہو ، یا اس سے زیادہ ہو۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ مستحاضہ معتدہ مطلقہ کے سلسلے میں حضرت ابراہیم نخعیؒ اور دیگر فقہاء کے قول کے مطابق ہمارا مذہب معروف یہ ہے کہ اس کی عدت وہ تین حیض ہوں گی جن میں وہ استحاضہ کی بیماری میں مبتلا ہونے سے پہلے نماز روزہ ودیگر اعمال سے رُکا کرتی تھی۔ اسی پر ہم نے فتویٰ دیا ہے۔ اور یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ہمارے اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ استحاضہ کی بیماری میں مبتلا ہونے سے پہلے عادت حیض کے ایام کے لحاظ سے نماز ودیگر چیزوں سے جو ایک حائضہ عورت کے لیے ممنوع ہیں ترک کرتی تھی ، اس لیے مناسب ہے کہ ان ممنوع الاعمال ایام کو جس طرح دیگر چیزوں میں معتبر قرار دیا گیا ہے ، طلاق کی عدت میں بھی اعتبار کیا جائے۔

(ب:۴۷) بَابُ الرَّضَاعِ

دودھ پلانے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ، كَانَ يَقُولُ: لَا رَضَاعَةَ إِلَّا لِمَنْ أُرْضِعَ فِي الصِّغَرِ.

ترجمہ: نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرمایا کرتے تھے: رضاعت وہی ہوتی ہے کہ جب بچے کو کم سنی میں دودھ پلایا گیا ہو۔

رضاعت کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

تشریح: رضاعت کا لغوی معنی: "مَصُّ الثَدي مُطلَقًا". یعنی عورت کے پستان کو چوسنا ہے۔ اور شریعت میں رضاعت کی تعریف یہ ہے: "عورت کے پستان سے مدتِ رضاعت (۲/سال کے اندر) میں بچہ کے پیٹ میں دودھ پہنچانا؛ خواہ منھ کے ذریعہ یا ناک کے ذریعہ وہ پہنچایا گیا ہو، یا یہ کہ بچہ نے خود پی کر حلق سے نیچے اُتارا، یا ناک سے اُس کے پیٹ میں دودھ پہنچایا گیا ہو، ان تمام طریقوں سے رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ (البحر الرائق، ج:۳، ص:۲۲۱)

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ أَبِي بَكْرٍ، عَنْ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، عَنْ عَائِشَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ عِنْدَهَا، وَإِنَّهَا سَمِعَتْ رَجُلا يَسْتَأْذِنُ فِي بَيْتِ حَفْصَةَ، قَالَتْ عَائِشَةُ: فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، هَذَا رَجُلٌ يَسْتَأْذِنُ فِي بَيْتِكَ، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أُرَاهُ فُلانًا لِعَمٍّ لِحَفْصَةَ مِنَ الرَّضَاعَةِ، قَالَتْ عَائِشَةُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، لَوْ كَانَ عَمِّي فُلانٌ مِنَ الرَّضَاعَةِ حَيًّا دَخَلَ عَلَيَّ؟ قَالَ: نَعَمْ.

ترجمہ: عمرہ بنت عبدالرحمٰن سیدہ عائشہؓ کے بارے میں یہ بات نقل کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے یہاں موجود تھے۔ آپؐ نے کسی شخص کو سیدہ حفصہؓ کے یہاں اندر آنے کی اجازت مانگتے ہوئے سنا، تو سیدہ عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ شخص آپ کے گھر

میں اندر آنے کی اجازت مانگ رہا ہے؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ یہ فلاں شخص ہوگا۔ نبی اکرمؐ نے سیدہ حفصہؓ کے رضاعی چچا کے بارے میں یہ بات فرمائی۔ تو سیدہ عائشہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! اگر میرا فلاں رضاعی چچا زندہ ہوتا، تو کیا وہ بھی میرے یہاں اندر آجاتا؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جی ہاں۔

تشریح: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عمرہؒ کو بتایا کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تھے اور انہوں نے ایک آدمی کی آواز سنی جو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں آنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا یہ ایک (اجنبی) آدمی ہے جو آپ کے گھر میں آنے کی اجازت مانگ رہا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے خیال میں وہ فلاں شخص ہے جو حفصہؓ کا رضاعی چچا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا: اگر فلاں آدمی زندہ ہوتا، جو میرا رضاعی چچا تھا، تو کیا وہ میرے گھر میں آسکتا تھا؟ آپ نے فرمایا: جی ہاں! (آسکتا تھا)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح نسبی باپ، یا چچا، یا بھائی محرم ہے، اس سے نکاح درست نہیں، ایسا ہی رضاعی باپ، چچا، یا بھائی بھی محرم ہے، ان سے نکاح کرنا درست نہیں۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ دِينَارٍ، عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ، عَنْ عَائِشَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ الْوِلَادَةِ.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دودھ پینے کی وجہ سے وہ رشتے حرام ہوجاتے ہیں، جو پیدائش کی وجہ سے حرام ہیں۔

تشریح: ”رضاعت“ دودھ شریک دو بچوں کے درمیان نسبت کا نام

ہے۔ رضاعت: اصل میں دودھ پینے کے معنی میں ہے۔ رضاعت کا صیغہ باب فتح وکرم وسمع سے آتا ہے۔ ''رضیع'' دودھ پینے والے بچے کو کہتے ہیں۔ اور مرضعہ دودھ پلانے والی عورت کو کہتے ہیں۔ مدتِ رضاعت دو سال ہے، جس پر فتویٰ ہے۔ اب اس بات میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے کہ کتنی مقدار دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہوتی ہے جس سے نسب کی حرمت کی طرح حرمت آتی ہے۔

چنانچہ اس سلسلے میں تین مذاہب ہیں:

فقہائے کرام کا اختلاف

امام احمدؒ اور اہل ظواہر کا مذہب: یہ ہے کہ تین مرتبہ بچہ دودھ چوسے گا تب حرمت ثابت ہوگی، اس سے کم نہیں۔

امام شافعیؒ کا مذہب: یہ ہے کہ پانچ مرتبہ دودھ چوسے گا تب حرمت ثابت ہوگی **وَ هُوَ روايةٌ عن أحمد، ومَذهبٌ لابن حَزم.**

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا مذہب: یہ ہے کہ اگر عورت کا دودھ مدتِ رضاعت دو سال کے اندر اندر یقینی طور پر بچے کے حلق سے نیچے اُتر گیا تو یہ دودھ قلیل ہو یا کثیر، حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی، مرضعہ پر اس بچے کے فروع حرام ہو جائیں گے۔ اور رضیع بچے پر مرضعہ اور اس کے اصول و فروع سب حرام ہو جائیں گے۔

امام احمدؒ کی دلیل: حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لَا تُحرِمُ المَصَّةُ وَ لَا المَصَّتَان.** (ترمذی، ج:۱، ص:۱۳۷) **مَصَّ** بمعنی چوسنا۔ اور ''تا'' اس میں مَرَّةٌ (ایک مرتبہ) کے لئے ہوا ہے، یعنی بچہ کا اپنی ماں کے پستان کو ایک یا دو مرتبہ چوسنا موجبِ حرمت نہیں ہے۔ یہ تو منطوقِ حدیث ہوا

اور مفہومِ حدیث یہ ہوا کہ تین بار چوسنا موجب حرمت ہے۔

دلیل کا جواب: اس طرح ہے کہ ہم مفہومِ مخالف کے قائل ہی نہیں تو اس کے پابند بھی نہیں، نیز منطوق کے مقابلے میں مفہوم کی طرف جانا بھی مناسب نہیں اور اس کو ماننا بھی مناسب نہیں۔

دوسرا جواب: مذکورہ حدیث منسوخ ہے، ناسخ حضرت علیؓ کی روایت ہے:

يَحرُمُ مِنَ الرِّضَاعِ مَا يَحرُمُ مِنَ النَّسَبِ، قَلِيلُهُ وَ كَثِيرُهُ.

(جامع المسانید للخوارزمی، ج:۲، ص:۹۷)

تیسرا جواب: مذکورہ حدیث اس پر محمول ہے کہ جب دودھ بچہ کے پیٹ میں نہ پہنچا ہو، جیسا کہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض مرتبہ ماں بچہ کو دودھ پلانا چاہتی ہے اور پستان اس کے منہ میں داخل بھی کر دیتی ہے لیکن وہ پینا نہیں چاہتا۔

(الدر المنضود، ج:۴، ص:۲۱)

امام شافعیؒ کی دلیل: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ قرآن میں آیا ہے کہ دس مرتبہ چوسنا حرام کرتا ہے، پھر منسوخ ہو کر پانچ مرتبہ چوسنا رہ گیا، پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہوئے اور وہ ویسے ہی ہے جو قرآن میں پڑھا جاتا ہے۔

(مسلم شریف، ج:۱، ص:۴۶۹)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پانچ مرتبہ چوسنے سے پہلے حرمت ثابت نہیں ہوگی۔

دلیل کا جواب: حدیث میں "خَمس رَضعات" (پانچ مرتبہ چوسنا) کے الفاظ آئے ہیں، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چند ہی دن پہلے منسوخ ہوئے، اس لیے بعض صحابہ کو اُن کے نسخ کا پتہ نہ چل سکا، چنانچہ بعض صحابہؓ آپ کی وفات تک بطور قرآن ان الفاظ کی تلاوت کرتے رہے۔ علامہ نوویؒ نے اس کے

یہی معنی بیان کیے ہیں۔ (شرح نووی علی مسلم، ج:۱، ص:۴۶۸) نیز مصاحف عثمانیہ میں کہیں بھی "خمس رضعات" کے الفاظ موجود نہیں، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ الفاظ بھی بعد میں منسوخ ہو گئے تھے۔

دوسرا جواب: حضرت عائشہؓ کی حدیث خبر واحد ہے اور خبر واحد سے قرآن کی قرآنیت ثابت نہیں ہو سکتی ہے، لہٰذا قرآن کی آیت کی موجوگی میں اس روایت کو ترک کرنا ہوگا، یا تاویل کرنی ہوگی؛ کیونکہ قرآنِ کریم ایک محفوظ آسمانی صحیفہ ہے، اس محفوظ کتاب میں پانچ رضعات والی آیت نہیں ہے، نہ مشہور اور نہ متواتر قرأت میں اس کا کوئی ذکر ہے۔ اب اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری وقت میں وہ آیت پڑھی جاتی اور حضورؐ کی وفات کے بعد منسوخ ہو گئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ العیاذ باللہ یہ قرآن محفوظ نہیں اور یہ نظریہ "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" کے منافی ہے۔

حنفیہ کی دلیل: وَاُمَّهَاتُكُمُ اللّٰتِىْٓ اَرْضَعْنَكُمْ (آیت:۱۳، سورۃ النساء) اور تمہاری مائیں جنھوں نے تم کو دودھ پلایا۔ اس آیت کریمہ میں "اَرْضَعْنَ" مطلق ہے، قلیل وکثیر کی کوئی تفریق نہیں کی گئی۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: يَحرُمُ مِن الرِّضَاعِ مَا يَحرُمُ مِن النَّسَبِ. (سنن نسائی، ج:۲، ص:۱۸) حرام ہو جاتا ہے رضاعت سے جو حرام ہو جاتا ہے نسب سے۔ اس میں بھی مطلق رضاعت کو مُحَرِّم قرار دیا گیا ہے، لہٰذا مطلقاً دودھ پینا حرمت کا سبب ہوگا۔

دلیل عقلی: یہ ہے کہ حرمت کی اصل علت جزئیت ہے کہ دودھ کی وجہ سے ایک دوسرے کے جسم میں اجزاء کا اختلاط آ جاتا ہے اور اپنے جزء سے استمتاع کرنا

جائز نہیں ہے۔اور یہ جزئیت ایک قطرہ دودھ سے بھی حاصل ہوجاتی ہے، لہٰذا حرمت ثابت ہوجائے گی؛ خواہ کم ہو، یا زیادہ ہو۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ الْقَاسِمِ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ، أَنَّهُ كَانَ يَدْخُلُ عَلَيْهَا مَنْ أَرْضَعَتْهُ أَخَوَاتُهَا وَبَنَاتُ أَخِيهَا، وَلا يَدْخُلُ عَلَيْهَا مَنْ أَرْضَعَتْهُ نِسَاءُ إِخْوَتِهَا.

ترجمہ: عبدالرحمٰن بن قاسم اپنے والد کے حوالے سے سیدہ عائشہؓ کے بارے میں یہ بات نقل کرتے ہیں کہ: جن بچوں کو سیدہ عائشہؓ کی بہنوں نے، یا بھانجیوں نے، یا بھتیجیوں نے دودھ پلایا ہوتا تھا وہ سیدہ عائشہؓ کے یہاں اندر آجایا کرتے تھے؛ لیکن سید عائشہؓ کے بھائیوں کی بیویوں (بھابھیوں) نے جن بچوں کو دودھ پلایا ہوتا تھا وہ سیدہ عائشہؓ کے یہاں اندر نہیں آسکتے تھے۔

تشریح: شاید یہ حضرت عائشہؓ کا مذہب ہوگا کہ رضاعت کی حرمت عورت سے ثابت ہوتی ہے، نہ کہ مرد سے۔ مگر جمہور علماء کے نزدیک اگر بھاوج کا دودھ بھائی سے ہو تو وہ لڑکا محرم ہوجائے گا؛ کیونکہ یہ عورت اس کی پھوپھی ہوئی، لہٰذا وہ لڑکا ان کے گھر آجاسکتا ہے۔

اشکال یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ ہر اس بچہ کو اپنے یہاں آنے جانے کی اجازت دے دیا کرتی تھیں جس نے اُن کی بھانجیوں اور بھتیجیوں کا دودھ پیا ہوتا؛ لیکن جس بچہ کو اس کی بھاوج نے دودھ پلایا ہوتا، آپ اسے اجازت نہ دیتیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ دودھ میں سیدہ عائشہؓ مرد کی تاثیر کی قائل نہ تھیں، کیونکہ مؤخر الذکر صورت میں دودھ پلانے والی بھاوج کا خاندان کا بھائی ہوا اور بھائی کے رشتہ

سے دودھ پینے والا بچہ بھتیجا قرار پایا، حقیقی بھتیجا سے تو کوئی حجاب نہیں؛ لیکن رضاعی بھائی سے پردہ کیا جارہا ہے، یہ اس امر کی دلیل ہے کہ عائشہؓ کے نزدیک مرد کے حوالے سے دودھ میں تاثیر نہیں ہے؟

جواب: سیدہ عائشہؓ کو اختیار تھا کہ محرم لوگوں میں سے اگر کسی کو آنے جانے کی اجازت نہ دیں تو وہ آپ کے گھر میں اجازت کے بغیر اور پردہ کا خیال رکھتے ہوئے داخل نہ ہو، لہٰذا کسی کو صرف اپنے گھر میں آنے جانے سے روکنے کی وجہ سے اس کے محرم ہونے سے انکار نہیں ہوسکتا۔

نوٹ: علامہ باجی نے لکھا ہے کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس روایت میں راوی کو وہم ہوا ہے۔ (المنتقیٰ، ج:۴، ص:۱۵۴) لہٰذا معلوم ہوا کہ اوّل یہ روایت ہی ایسی ہے کہ جس میں راوی کو وہم ہوا ہے۔ اور اگر اسے تسلیم نہ کیا جائے، تو پھر اتنی بات ضرور ہے کہ اُمّ المومنینؓ کو یہ اختیار تھا کہ وہ محارم میں سے جسے چاہیں اندر آنے کی اجازت دیں اور جسے چاہیں اندر آنے کی اجازت نہ دیں۔ اس اختیار کے پیش نظر آپ رضاعی بھتیجوں کو اندر آنے کی اجازت نہ دیتیں؛ حالانکہ وہ محرم تھے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنِي الزُّهْرِيُّ، عَنْ عَمْرِو بْنِ الشَّرِيدِ، أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ سُئِلَ عَنْ رَجُلٍ كَانَتْ لَهُ امْرَأَتَانِ، فَأَرْضَعَتْ إِحْدَاهُمَا غُلَامًا، وَالْأُخْرَى جَارِيَةً، فَسُئِلَ هَلْ يَتَزَوَّجُ الْغُلَامُ الْجَارِيَةَ؟ قَالَ: لَا، اللِّقَاحُ وَاحِدٌ.

ترجمہ: عمرو بن شرید بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جس کی دو بیویاں ہوں، ان میں

سے ایک نے لڑکے کو دودھ پلایا اور دوسری نے لڑکی کو دودھ پلایا۔ تو سوال یہ کیا گیا کہ وہ لڑکا اس لڑکی کے ساتھ شادی کرسکتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: نکاح درست نہیں ہے؛ کیونکہ دونوں کا باپ ایک ہی ہے۔

تشریح: مذکورہ واقعہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور ایک نے لڑکے کو دودھ پلایا اور دوسری بیوی نے لڑکی کو دودھ پلایا تو ان دونوں کا آپس میں نکاح درست نہیں ہوگا؛ کیونکہ وہ دونوں آپس میں بھائی بہن بن گئے، اور بھائی بہن کا آپس میں نکاح درست نہیں ہوتا۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ عُقْبَةَ، أَنَّهُ سَأَلَ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيِّبِ عَنِ الرَّضَاعَةِ؟ فَقَالَ: مَا كَانَ فِي الْحَوْلَيْنِ، وَإِنْ كَانَتْ مَصَّةً وَاحِدَةً فَهِيَ تُحَرِّمُ، وَمَا كَانَ بَعْدَ الْحَوْلَيْنِ فَإِنَّمَا طَعَامٌ يَأْكُلُهُ.

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ عُقْبَةَ، أَنَّهُ سَأَلَ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ فَقَالَ لَهُ مِثْلَ مَا قَالَ سَعِيدُ بْنُ الْمُسَيِّبِ.

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا ثَوْرُ بْنُ زَيْدٍ، أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ، كَانَ يَقُولُ: مَا كَانَ فِي الْحَوْلَيْنِ وَإِنْ كَانَتْ مَصَّةً وَاحِدَةً فَهِيَ تُحَرِّمُ.

ترجمہ: ابراہیم بن عقبہ بیان کرتے ہیں: انہوں نے سعید بن مسیّبؒ سے رضاعت کے بارے میں دریافت کیا، تو انھوں نے فرمایا: جو دو سال کے اندر ہو (وہ حرمت ثابت کردے گی) خواہ وہ ایک گھونٹ ہی کیوں نہ ہو۔ اور جو دو سال کے بعد ہو تو وہ ایک خوراک ہے جس کو اس نے کھالیا (یعنی اسکے ذریعہ حرمت ثابت نہیں ہوگی)۔

ابراہیم بن عقبہ بیان کرتے ہیں: انھوں نے عروہ بن زبیرؓ سے یہی سوال

کیا، تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا جو سعید بن مسیّبؒ نے دیا تھا۔

ثور بن زید بیان کرتے ہیں: حضرت عبداللہ بن عباسؓ یہ فرماتے ہیں: دو سال کے اندر جو رضاعت ہوگی وہ حرمت ثابت کردے گی، خواہ وہ ایک گھونٹ ہی کیوں نہ ہو۔

تشریح: رضاعت وہ معتبر اور مؤثر ہے جو مدتِ رضاعت میں ہو، جس میں فی الجملہ اختلاف ہے، اس مدت کے گذر جانے کے بعد جو رضاعت ہوگی وہ معتبر نہیں، اس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی، خواہ تھوڑی ہو، یا زیادہ ہو، کیونکہ وہ تو عام کھانے کی طرح ہے۔

مدتِ رضاعت سے متعلق اختلافِ ائمہ

جمہور کا مذہب: یہ ہے کہ کل مدتِ رضاعت دو سال ہے۔ صاحبین کا بھی یہی مذہب ہے۔

حنفیہ کا مذہب: یہ ہے کہ مدتِ رضاعت ڈھائی سال ہے۔

جمہور کی دلیل: "وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ". (البقرۃ: ۲۳۳) مائیں اپنی اولاد کو مکمل دو سال دودھ پلائیں۔ اس آیت میں ہے کہ دو سال دودھ پلائیں، نیز حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے، فرماتے ہیں: قَالَ رَسُولُ اللّٰه صَلَّى اللّٰهُ عليه وسلَّم: لَا رَضَاعَ إِلَّا مَا كَانَ فِي الحَوْلَيْنِ. (دارقطنی، ج:۴، ص:۱۰۳) آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں ہے رضاعت مگر دو سال کے اندر۔

حنفیہ کی دلیل: "وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُوْنَ شَهْرًا" (اور حمل میں رہنا

اور اس کا دودھ چھڑانا تیس ماہ میں ہے)۔صاحب ہدایہ نے اس استدلال کو اس طرح بیان کیا ہے کہ باری تعالیٰ نے اس آیت میں دو چیزوں کا ذکر کر کے ان کی مدت بیان کی ہے، جس کا تقاضہ یہ تھا کہ حمل اور رضاعت ہر ایک کے لیے تیس ماہ کی مدت ہوتی؛ لیکن حمل کے حق میں کم کر دینے والی دلیل موجود ہے اور وہ دلیل حضرت عائشہؓ کا قول: "الولَدُ لاَ يبقىٰ فِي بطنِ أمِّه أكثرَ مِن سَنَتَين، وَ لَو بِقَدر فُلكَةِ مَغزَلٍ". (فتح القدیر) بچہ اپنی ماں کے پیٹ میں دو سال سے زیادہ باقی نہیں رہتا؛ اگر چہ وہ تکلے کے دمڑے کی مقدار ہی کیوں نہ ہو۔لہٰذا فصال اپنے ظاہر پر رہے گا اور وہ تیس ماہ ہے۔

فائدہ: جمہور اور صاحبین کا مذہب دلائل کی رو سے نہایت قوی اور راجح ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں کہ: وَ لاَ يخفىٰ قُوَّة دَليلها.

(البحر الرائق، ج:۳،ص:۲۳۹)

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ مَوْلَى عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، أَنَّ سَالِمَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ، أَخْبَرَهُ، أَنَّ عَائِشَةَ أُمَّ الْمُؤْمِنِينَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَرْسَلَتْ بِهِ وَهُوَ يَرْضَعُ إِلَى أُخْتِهَا أُمِّ كُلْثُومٍ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ، فَقَالَتْ: أَرْضِعِيهِ عَشْرَ رَضَعَاتٍ حَتَّى يَدْخُلَ عَلَيَّ، فَأَرْضَعَتْنِي أُمُّ كُلْثُومٍ بِنْتُ أَبِي بَكْرٍ ثَلاثَ رَضَعَاتٍ، ثُمَّ مَرِضَتْ، فَلَمْ تُرْضِعْنِي غَيْرَ ثَلاثِ مِرَارٍ، فَلَمْ أَكُنْ أَدْخُلُ عَلَى عَائِشَةَ مِنْ أَجْلِ أَنَّ أُمَّ كُلْثُومٍ لَمْ تُتِمَّ لِي عَشْرَ رَضَعَاتٍ.

ترجمہ: نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت سالم بن عبداللہؒ کو جب وہ شیر خوار بچے تھے اپنی بہن اُمّ کلثوم کے پاس بھیجا اس لیے کہ

دس بار اس کو دودھ پلائیں تو بغیر پردہ کے میرے سامنے آجائیں۔ سالم نے کہا: اُمّ کلثوم نے مجھے تین بار دودھ پلایا، اس کے بعد وہ بیمار ہوگئیں، پھر وہ مجھے مزید دودھ نہیں پلاسکیں، اس لیے میں حضرت عائشہؓ کے سامنے نہیں جاتا تھا، کیونکہ میں نے اُمّ کلثوم کا دس بار دودھ نہیں پیا تھا۔

تشریح: بالغ مرد (مدتِ رضاعت گذر جانے کے بعد) اگر کسی عورت کا دودھ خواہ کتنی مرتبہ پی لے اس سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی، اس کی تفصیل ماقبل میں آچکی ہے، لیکن مذکورہ روایت کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے:

ایک سوال اور اس کا جواب

سوال: حضرت عائشہؓ کا یہ عمل تھا کہ آپ سالم کے واقعہ کو سامنے رکھ کر یہ فتویٰ دیا کرتی تھیں کہ بالغ مرد کے دودھ پینے سے بھی رضاعت ثابت ہوجاتی ہے۔ سالم کے واقعہ کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ سالم متبنٰی تھے اور اُن کو پالنے والے دونوں میاں بیوی یعنی ابو حذیفہ اور اُن کی بیوی سہلہ بنت سہیل نے متبنٰی کے حقوق میں اُترنے والی آیت کے بعد اُن کو گھر میں آنے جانے سے روک دیا، جب اُن کی بیوی نے یہ مسئلہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں پیش کیا تو آپ نے اس کا طریقہ ارشاد فرمایا کہ سہلہ بنت سہیل پانچ مرتبہ سالم کو دودھ پلادے، تو پھر اُس کے آنے جانے میں کوئی قباحت نہیں رہے گی، تو معلوم ہوا کہ بالغ مرد کے دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہوتی ہے۔ سیدہ عائشہؓ کے فتویٰ کی بنیاد پر ابن تیمیہ اور ان کے متبعین بھی بالغ مرد کے دودھ پینے سے حرمت کے قائل ہیں۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ، ج:۳۴، ص:۶۰)

جواب: ابن تیمیہ اور اُن کے متبعین نے سیدہ عائشہؓ کا قول نقل کر کے بالغ

مرد کے دودھ پینے سے حرمت ہونے کا جو قول ذکر کیا ہے، اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ سیدہ عائشہؓ کے علاوہ دیگر اُمہات المومنین نے اس کا انکار کیا، جب تمام اُمہات المومنین رضی اللہ عنہن اور صحابۂ کرام اور تابعین اس کا انکار کرتے ہیں، تو پھر ابن تیمیہ اور اس کے متبعین ومقلدین کا سیدہ عائشہؓ کے تنہا فتویٰ کو نقل کر کے اسے دلیل بنا کر بالغ کے دودھ پینے سے اثباتِ حرمت کو لینا اور اس کو اپنا مسلک قرار دینا کہاں تک درست ہے؟

دوسرا جواب: سہلہ بنت سہیل زوجہ ابوحذیفہؓ کا واقعہ صرف ان کے ساتھ مخصوص تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خصوصی اختیار سے صرف انہیں اجازت دی تھی، لہٰذا اس پر قیاس کرنا درست نہیں۔ کتب احادیث میں اس تخصیص کی صراحت موجود ہے، چنانچہ سیدہ اُم سلمیٰؓ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام ازواجِ مطہرات نے اس طرح کی رضاعت پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور فرماتی ہیں کہ یہ رخصت مخصوص تھی، سہلہ بنت سہیل کے ساتھ۔

(مصنف عبدالرزاق، ج:۷، ص:۴۶۰)

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، عَنْ صَفِيَّةَ ابْنَةِ أَبِي عُبَيْدٍ، أَنَّهَا أَخْبَرَتْهُ، أَنَّ حَفْصَةَ أَرْسَلَتْ بِعَاصِمِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سَعْدٍ إِلَى فَاطِمَةَ بِنْتِ عُمَرَ تُرْضِعُهُ عَشْرَ رَضَعَاتٍ لِيَدْخُلَ عَلَيْهَا، فَفَعَلَتْ، فَكَانَ يَدْخُلُ عَلَيْهَا وَهُوَ يَوْمَ أَرْضَعَتْهُ صَغِيرٌ يَرْضَعُ.

ترجمہ: صفیہ بنت ابوعبید بیان کرتی ہیں کہ سیدہ حفصہؓ نے عاصم بن عبداللہؓ کو فاطمہ بنت عمر کے پاس بھجوایا؛ تاکہ فاطمہ انہیں دس مرتبہ دودھ پلا دیں اور عاصم سیدہ حفصہؓ کے یہاں آیا جایا کریں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا، تو عاصم

سیدہ حفصہ کے یہاں چلے جایا کرتے تھے، جب انہیں دودھ پلایا گیا تھا، اس وقت وہ کم سن شیر خوار بچے تھے۔

تشریح: بعض علماء کے نزدیک ایک یا دو مرتبہ دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی، جب تک دس بار نہ پیئے۔ اور بعضوں کے نزدیک جب تک پانچ بار نہ پیئے۔ شافعی اور احمدؒ کا قول یہی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک تھوڑا یا بہت دودھ پینے سے حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔

نوٹ: مذکورہ روایت کی مزید تفصیل ماقبل میں آچکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أَبِي بَكْرٍ، عَنْ عَمْرَةَ، عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: كَانَ فِيمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالَى مِنَ الْقُرْآنِ: عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَعْلُومَاتٍ يُحَرِّمْنَ، ثُمَّ نُسِخْنَ بِخَمْسٍ مَعْلُومَاتٍ، فَتُوُفِّيَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُنَّ مِمَّا يُقْرَأُ مِنَ الْقُرْآنِ.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ قرآنِ کریم میں یہ حکم نازل ہوا تھا کہ دس بار دودھ پینا (جب کہ اس کے پینے کا کامل یقین ہو) نکاح کو حرام کرتا ہے۔ پھر یہ حکم پانچ بار پینے کے ساتھ کہ جس کے پینے کا کامل یقین ہو، منسوخ ہوگیا (یعنی جب بعد میں یہ حکم نازل ہوا کہ پانچ بار دودھ پینا کہ اس کے پینے کا کامل یقین ہو، حرمت رضاعت کو ثابت کرتا ہے تو پہلا حکم منسوخ ہوگیا، اس کے بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے اور یہ آیت قرآنِ کریم میں تلاوت کی جاتی رہی۔

تشریح: مذکورہ روایت کی تشریح ترجمہ سے واضح ہے، لیکن مذکورہ

روایت پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے۔ اور وہ اشکال یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ قرآنِ کریم میں دس رضعات نازل ہوئیں، پھر پانچ منسوخ ہوگئیں اور پانچ رضعات کا لفظ حضور ﷺ کے وصال تک قرآنِ کریم میں رہا، لہٰذا پانچ رضعات کا ذکر جب قرآنِ کریم میں باقی ہے تو اس سے کم رضاعت پر حرمت کا حکم لگانا قرآنِ کریم کے خلاف ہوگا جو قابل قبول نہیں؟

جواب: حضرت عائشہؓ کا فرمانا کہ "خَمْس رَضعات" کے الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک قرآنِ کریم میں رہے، ان الفاظ کا قرآن ہونا صرف اتنی بات سے ثابت نہیں ہوسکتا، قرآنِ کریم کے اثبات کے لیے خبر متواتر ہونا ضروری ہے۔ سیدہ عائشہؓ اِن الفاظ کو قرآن کہہ رہی ہیں، ان کے قرآن ہونے کی خبر نہیں دے رہی ہیں۔ اور اگر خبر بھی تسلیم کر لی جائے تو خبر واحد ہی ہوگی، جس سے کسی لفظ کا قرآن ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔ ادھر قرآنِ کریم میں جو الفاظ موجود ہیں وہ "اَرْضَعْنَکُمْ" اور "الرَّضَاعَۃ" ہیں، جو مقید نہیں ہیں، اس مطلق نص قطعی کو خبر واحد کے ساتھ مقید کرنا جائز نہیں۔ ہاں! اگر قرآنِ کریم میں الفاظ مجمل ہوتے، تو پھر اجمال کی تفصیل کے لیے خبر واحد کارآمد ہوسکتی تھی۔ پانچ مرتبہ چوسنے کے الفاظ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک موجود تھے تو پھر کیسے نکالے گئے؟ یہاں تحریف قرآن کا مسئلہ بن جائے گا، جس کے رافضی معتقد ہیں، ہمارے یہاں تحریف قرآن کا عقیدہ کفر ہے، اس لیے ماننا پڑے گا کہ "خَمْس رَضعات" قرآنِ کریم کے الفاظ نہ تھے۔

دوسرا جواب: "عَشر رَضعات" اور "خَمْس رَضعات" والی روایت منسوخ ہے۔ (مزید تفصیل کیلئے دیکھئے: مصنف عبدالرزاق، ج:۴، ص:۴۶۷)

پھر منسوخ ہونے کی تین صورتیں ہوتی ہیں: (۱) الفاظ منسوخ ہوں (۲) معنی منسوخ ہوں (۳) الفاظ اور معنی دونوں منسوخ ہوں۔ اگر "خمس رَضعات" کو قرآنِ کریم میں پہلے ہونا تسلیم کرلیا جائے، تو اب بہرحال نہیں ہے اور پہلی دو اقسام تو بن نہیں سکتیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ تیسری قسم میں داخل ہے، کیونکہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اُن کو منسوخ مانا جائے، تو یہ باطل ہے، کیونکہ ناسخ و منسوخ اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں، جب وحی منقطع ہوگئی، تو وصال کے بعد منسوخ ہونے کا قول کہنا تحریفِ قرآن اور کفر ہے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ دِينَارٍ، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ، وَأَنَا مَعَهُ عِنْدَ دَارِ الْقَضَاءِ، يَسْأَلُهُ عَنْ رَضَاعَةِ الْكَبِيرِ، فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، فَقَالَ: كَانَتْ لِي وَلِيدَةٌ فَكُنْتُ أُصِيبُهَا، فَعَمَدَتِ امْرَأَتِي إِلَيْهَا، فَأَرْضَعَتْهَا، فَدَخَلْتُ عَلَيْهَا، فَقَالَتِ امْرَأَتِي: دُونَكَ، وَاللّٰهِ قَدْ أَرْضَعْتُهَا، قَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهِ عَنْهُ: أَوْجِعْهَا وَائْتِ جَارِيَتَكَ، فَإِنَّمَا الرَّضَاعَةُ رَضَاعَةُ الصَّغِيرِ۔

ترجمہ: عبداللہ بن دینارؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آیا، میں اس وقت حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ دارالقضاء کے پاس موجود تھا، اس شخص نے حضرت عبداللہ سے بڑی عمر کے شخص کے دودھ پینے کا مسئلہ دریافت کیا، تو حضرت عبداللہ نے فرمایا: ایک شخص حضرت عمر بن خطابؓ کے پاس آیا اور بولا: میری کنیز ہے، میں اس کے ساتھ صحبت کرتا ہوں تو میری بیوی نے اسے دودھ پلادیا، جب میں اپنی کنیز کے پاس جانے لگا تو میری بیوی نے کہا: تم اس کے پاس نہ جاؤ، اللہ کی قسم! میں تو

اسے دودھ پلا چکی ہوں، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: تم اپنی بیوی کی پٹائی کرواور اپنی کنیز کے ساتھ صحبت کرلو، کیونکہ رضاعت وہ ہوتی ہے جو کم سنی میں ہو۔

تشریح: مذکورہ روایت سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ مدتِ رضاعت گذر جانے کے بعد اگر بچہ کو دودھ پلایا تو اس عورت سے حرمت ثابت نہیں ہوگی، مثلاً: بچہ کی عمر دو سال سے زیادہ ہو جائے، اب کسی عورت کا دودھ پیئے تو اس سے حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی، اس لیے کہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فإنَّمَا الرَّضاعةُ عَنِ المَجاعَةِ. کیونکہ رضاعت تو وہ ہے جب بچے کا دارومدار دودھ پر ہو، یہ حالت چوں کہ صرف مدتِ رضاعت میں ہوتی ہے، لہٰذا قابل اعتماد بات یہی ہے جو جمہور کا مذہب ہے کہ حرمت ایامِ رضاعت میں ثابت ہوتی ہے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا ابْنُ شِهَابٍ، وَسُئِلَ عَنْ رَضَاعَةِ الْكَبِيرِ؟ فَقَالَ: أَخْبَرَنِي عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ، أَنَّ أَبَا حُذَيْفَةَ بْنَ عُتْبَةَ بْنِ رَبِيعَةَ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ شَهِدَ بَدْرًا، وَكَانَ تَبَنَّى سَالِمًا الَّذِي يُقَالُ لَهُ: مَوْلَى أَبِي حُذَيْفَةَ، كَمَا كَانَ تَبَنَّى رَسُولُ اللَّهِ زَيْدَ بْنَ حَارِثَةَ، فَأَنْكَحَ أَبُو حُذَيْفَةَ سَالِمًا وَهُوَ يَرَى أَنَّهُ ابْنُهُ أَنْكَحَهُ ابْنَةَ أَخِيهِ فَاطِمَةَ بِنْتَ الْوَلِيدِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ رَبِيعَةَ، وَهِيَ مِنَ الْمُهَاجِرَاتِ الْأُوَلِ وَهِيَ يَوْمَئِذٍ مِنْ أَفْضَلِ أَيَامَى قُرَيْشٍ، فَلَمَّا أَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى فِي زَيْدٍ مَا أَنْزَلَ: "اُدْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ" رُدَّ كُلُّ أَحَدٍ تُبُنِّيَ إِلَى أَبِيهِ، فَإِنْ لَمْ يَكُنْ يُعْلَمُ أَبُوهُ رُدَّ إِلَى مَوَالِيهِ، فَجَاءَتْ سَهْلَةُ بِنْتُ سُهَيْلٍ امْرَأَةُ أَبِي حُذَيْفَةَ وَهِيَ مِنْ بَنِي عَامِرِ بْنِ لُؤَيٍّ إِلَى

رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِيمَا بَلَغَنَا، فَقَالَتْ: كُنَّا نَرَى سَالِمًا وَلَدًا، وَكَانَ يَدْخُلُ عَلَيَّ وَأَنَا فُضُلٌ وَلَيْسَ لَنَا إِلا بَيْتٌ وَاحِدٌ، فَمَا تَرَى فِي شَأْنِهِ؟ فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِيمَا بَلَغَنَا: أَرْضِعِيهِ خَمْسَ رَضَعَاتٍ، فَيَحْرُمَ بِلَبَنِكَ، أَوْ بِلَبَنِهَا، وَكَانَتْ تَرَاهُ ابْنًا مِنَ الرَّضَاعَةِ، فَأَخَذَتْ بِذَلِكَ عَائِشَةُ فِيمَنْ تُحِبُّ أَنْ يَدْخُلَ عَلَيْهَا مِنَ الرِّجَالِ، فَكَانَتْ تَأْمُرُ أُمَّ كُلْثُومٍ، وَبَنَاتِ أَخِيهَا يُرْضِعْنَ مَنْ أَحْبَبْنَ أَنْ يَدْخُلَ عَلَيْهَا، وَأَبَى سَائِرُ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَدْخُلَ عَلَيْهِمْ بِتِلْكَ الرَّضَاعَةِ أَحَدٌ مِنَ النَّاسِ، وَقُلْنَ لِعَائِشَةَ: وَاللَّهِ مَا نَرَى الَّذِي أَمَرَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَهْلَةَ بِنْتَ سُهَيْلٍ إِلا رُخْصَةً لَهَا فِي رَضَاعَةِ سَالِمٍ وَحْدَهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، لا يَدْخُلُ عَلَيْنَا بِهَذِهِ الرَّضَاعَةِ أَحَدٌ، فَعَلَى هَذَا كَانَ رَأْيُ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي رَضَاعَةِ الْكَبِيرِ.

ترجمہ: امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ ابن شہاب سے بڑی عمر کے شخص کے دودھ پینے کے بارے میں دریافت کیا گیا، تو وہ بولے: عروہ بن زبیر نے مجھے یہ بات بتائی ہے کہ حضرت ابوحذیفہ بن عتبہؓ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ہیں اور جنہیں غزوۂ بدر میں شرکت کا شرف حاصل ہے، انھوں نے سالم کو منہ بولا بیٹا بنالیا تھا، سالم کو مولیٰ ابی حذیفہ بھی کہا جاتا تھا۔ یہ بالکل اسی طرح تھا جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہؓ کو منہ بولا بیٹا بنالیا تھا، پھر ابوحذیفہ نے سالم کا نکاح بھی کروادیا، حضرت ابوحذیفہ سالم کو اپنا بیٹا ہی سمجھتے تھے، انہوں نے سالم کی شادی اپنی بھتیجی فاطمہ بنت ولیدؓ کے

ساتھ کی تھی، جو ہجرت کرنے والی ابتدائی خواتین میں سے ایک تھیں اور اس وقت قریش کی معزز بیوہ تھیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت زید کے بارے میں وہ حکم نازل کیا جس میں اس نے فرمایا: ''اس طرح کے لوگوں کو تم اُن کے حقیقی باپ کے حوالے سے بلاؤ، اللہ کے نزدیک یہ چیز انصاف کے زیادہ قریب ہے''۔

ہر وہ شخص جو اپنے منہ بولے باپ کی طرف منسوب ہوتا تھا اس کا یہ تعلق ختم کر دیا گیا، اگر کسی کے باپ کا پتہ نہیں تھا تو اسے اپنے آزاد کرنے والے آقا کی طرف منسوب کیا گیا۔

حضرت ابوحذیفہؓ کی اہلیہ سہلہ بنت سہیل جن کا تعلق بنو عامر سے تھا وہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، انہوں نے عرض کی: ہم تو سالم کو اپنا بچہ ہی سمجھتے تھے اور وہ میرے یہاں آجایا کرتے تھے، جب کہ میں نے سر پر کوئی چادر وغیرہ بھی نہیں لی ہوتی تھی، تو ہمارا تو گھر بھی ایک ہی ہے، تو آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا (راوی کہتے ہیں کہ جس طرح ہم تک یہ روایت پہنچی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں) ''تم اُسے پانچ مرتبہ دودھ پلا دو، تو وہ تمہارے دودھ کی وجہ سے تمہارے لیے حرام ہو جائے گا''۔ تو سیدہ سہلہ بنت سہیلؓ اس لڑکے کو اپنا رضاعی بیٹا سمجھتی تھیں۔ سیدہ عائشہؓ نے اس روایت کے مطابق فتویٰ دیا ہے، جس شخص کے بارے میں یہ پسند کرتی تھیں کہ وہ شخص ان کے یہاں اندر آیا جایا کرے تو وہ سیدہ اُمّ کلثوم کو یا اپنی کسی بھتیجی کو یہ ہدایت کرتی تھی کہ وہ اسے دودھ پلا دے تا کہ وہ شخص سیدہ عائشہؓ کے یہاں اندر آجایا کرے۔ دیگر ازواجِ مطہرات کہتی ہیں: ہم نے عائشہؓ سے یہ کہا: اللہ کی قسم! ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے سہلہ بنت سہیل کو جو حکم دیا تھا وہ صرف خصوصی اجازت تھی جو اُن کے لیے سالم کو دودھ پلانے کے

حوالے سے تھی اور یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تھی، اس طرح کی رضاعت کے ذریعہ کوئی ہمارے یہاں اندر نہیں آسکتا۔ بڑی عمر کے شخص کی رضاعت کے بارے میں دیگر ازواجِ مطہرات کا نظریہ یہ تھا۔

تشریح : اس روایت سے معلوم ہوا کہ عورت کا دودھ حلال ہے، علی الخصوص بیماری کی وجہ سے اگر کوئی دوا کے طور پر اس کو پیئے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑا آدمی بھی جب کسی عورت کا دودھ پی لے تو وہ اس کی محرم ہو جاتی ہے، مگر ائمہ اور جمہور علماء نے اس حدیث پر عمل نہیں کیا اور کہتے ہیں کہ یہ حکم خاص تھا سہلہ کے لیے نہ کہ اور کسی کے لیے۔ اب اس میں اختلاف ہے کہ سہلہ نے اپنی چھاتی سے سالم کو دودھ پلایا، یا نچوڑ کر۔ لیکن راجح یہی ہے کہ چھاتی سے پلایا اور ظاہر حدیث بھی اسی پر دال ہے۔ واللہ اعلم

حضرت عائشہؓ کے مذکورہ موقف سے باقی تمام اُمہات المومنین رضوان اللہ تعالیٰ علیہن اجمعین نے اتفاق نہیں کیا، اور اس طرح جس کو دودھ پلا کر محرم بنایا جاتا وہ اسے اپنے پاس آنے کی اجازت نہیں دیا کرتی تھیں۔ اور بات وہی زیادہ درست ہے جو انہوں نے فرمائی کہ رسول اللہ ﷺ نے جو سہلہ بنت سہیل کو اجازت مرحمت فرمائی کہ سالم مولیٰ حذیفہ کو دودھ پلا دو کیونکہ اب تک اسے بیٹا بنا کر رکھا تھا، لہٰذا یوں حرمت ثابت ہو جائے گی، تو یہ اجازت صرف ان کے ساتھ ہی خاص تھی اور ان کے نزدیک یہ عام قانون نہیں تھا۔ رضاعت کے اس مسئلے میں جمہور کا مذہب ہی اس پُرفتن دور کے اندر تقویٰ وطہارت اور صحت وسلامتی کا ضامن ہے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ، أَنَّهُ سَمِعَهُ يَقُولُ: لا رَضَاعَةَ إِلا فِي الْمَهْدِ، وَلا رَضَاعَةَ إِلا مَا أَنْبَتَ اللَّحْمَ وَالدَّمَ.

ترجمہ: سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں کہ رضاعت صرف وہی ہوتی ہے جو گہوارے میں ہو۔ اور رضاعت صرف وہ ہوتی ہے جو گوشت اور خون کی نشو ونما کرتی ہے۔

دودھ پینے کا حکم کب لگے گا؟

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دودھ پینے کے احکام اس وقت جاری ہوتے ہیں جب یہ دودھ بطور غذا جسم میں اُتر گیا ہو۔ اور یہ اُسی وقت ہوگا کہ جب یہ دودھ (گہوارہ) بچپن کی عمر میں پیا گیا ہو، کیونکہ اسی زمانہ میں دودھ جزو بدن بنتا ہے اور اسی سے حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: لا يُحَرِّمُ الرَّضَاعُ إِلا مَا كَانَ فِي الْحَوْلَيْنِ، فَمَا كَانَ فِيهَا مِنَ الرَّضَاعِ، وَإِنْ كَانَ مَصَّةً وَاحِدَةً فَهِيَ تُحَرِّمُ كَمَا قَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبَّاسٍ، وَسَعِيدُ بْنُ الْمُسَيِّبِ، وَعُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ، وَمَا كَانَ بَعْدَ الْحَوْلَيْنِ لَمْ يُحَرِّمْ شَيْئًا لأَنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ قَالَ: وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ فَتَمَامُ الرَّضَاعَةِ الْحَوْلانِ، فَلا رَضَاعَةَ بَعْدَ تَمَامِهِمَا تُحَرِّمُ شَيْئًا، وَكَانَ أَبُو حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللَّهُ يَحْتَاطُ بِسِتَّةِ أَشْهُرٍ بَعْدَ الْحَوْلَيْنِ، فَيَقُولُ: يُحَرِّمُ مَا كَانَ فِي الْحَوْلَيْنِ وَبَعْدَهُمَا إِلَى تَمَامِ سِتَّةِ أَشْهُرٍ، وَذَلِكَ ثَلاثُونَ شَهْرًا، وَلا يُحَرِّمُ مَا كَانَ بَعْدَ ذَلِكَ، وَنَحْنُ لا نَرَى أَنَّهُ يُحَرِّمُ، وَنَرَى أَنَّهُ لا يُحَرِّمُ مَا كَانَ بَعْدَ الْحَوْلَيْنِ، وَأَمَّا لَبَنُ الْفَحْلِ فَإِنَّا نَرَاهُ يُحَرِّمُ، وَنَرَى أَنَّهُ يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ، فَالأَخُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مِنَ الأَبِ تَحْرُمُ عَلَيْهِ أُخْتُهُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مِنَ الأَبِ، وَإِنْ كَانَتِ الأُمَّانِ مُخْتَلِفَتَيْنِ إِذَا كَانَ لَبَنُهُمَا مِنْ رَجُلٍ

وَاحِدٍ، كَمَا قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: اللِّقَاحُ وَاحِدٌ، فَبِهَذَا نَأْخُذُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَةُ اللّٰهِ تَعالٰى عَلَيهِ.

ترجمہ: امام محمدؒ کہتے ہیں کہ: دودھ پینے سے اس وقت حرمت آئے گی جب دو سال کے اندر اندر دودھ پیا جائے۔ ان دو سالوں میں اگرچہ کسی نے ایک ہی مرتبہ دودھ چوسا تب بھی حرمت آجائے گی، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، سعید بن مسیبؒ اور عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے فرمایا ہے۔ اور دودھ جو دو سال کے بعد پیا جائے اس سے کسی قسم کی حرمت نہ آئے گی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''مائیں اپنے بچوں کو دو سال مکمل دودھ پلائیں۔ یہ اس کے لیے حکم ہے جو دودھ مکمل عرصہ تک پلانا چاہتا ہے''۔ تو معلوم ہوا کہ دودھ کی پوری مدت دو سال ہے۔ اس کے مکمل ہونے کے بعد رضاعت ثابت نہیں ہوتی، جو کسی چیز کی حرمت کو ثابت کردے۔

امام ابوحنیفہؒ نے احتیاط کے پیش نظر دو سال کے بعد مزید چھ ماہ کا حکم دیا ہے، اس اعتبار سے یہ مجموعہ تیس ماہ ہوجائے گا، اس کے بعد کی رضاعت حرمت ثابت نہیں کرے گی۔ اور ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ دو سال تک تو حرمت ثابت ہوگی، اس کے بعد کے چھ ماہ میں دودھ پینے سے حرمت ثابت نہ ہوگی۔ رہا ''لَبَنُ الفَحل'' (مرد کے دودھ) کا مسئلہ)، تو ہماری رائے یہ ہے کہ اس سے بھی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ اور ہماری یہ رائے ہے کہ رضاعت سے ہر وہ رشتہ حرام ہوجاتا ہے جو نسب سے حرام ہوجاتا ہے۔ لہٰذا رضاعی بھائی جو باپ کی طرف سے ہو، اس کے لیے رضاعی بہن سے رشتہ کرنا حرام ہے جو باپ کی طرف سے ہو، اگرچہ ان دونوں کی مائیں علیحدہ علیحدہ ہوں، لیکن جب ان دونوں عورتوں کے دودھ کا سبب ایک شخص ہوگا تو یہی حکم ہوگا، جیسا کہ حضرت

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''دودھ ایک ہی مرد کا ہے''۔ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں اور امام ابو حنیفہ بھی اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ نے مذکورہ ''قال'' میں جو بات بیان کی ہے، اس کی مکمل تفصیل ماقبل میں آچکی ہے کہ دودھ پینے سے اس وقت حرمت آتی ہے جب دودھ مفتی بہ قول کے مطابق (مدتِ رضاعت) دوسال کے اندر پیا جائے، اگرچہ ایک ہی گھونٹ کیوں نہ ہو، اس کے بعد پینے سے حرمت ثابت نہ ہوگی، کیونکہ قرآن میں ہے کہ: ''مائیں مکمل دوسال تک اپنے بچوں کو دودھ پلائیں''۔ (مزید تفصیل پیچھے ملاحظہ فرمائیں)

لَبَنُ الفَحل کا مطلب

أمَّا لَبَنُ الفَحل: لبن الفحل ایک فقہی اصطلاح ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ دودھ کی نسبت جس طرح عورت کی طرف ہوتی ہے اور ہونی چاہیے، اسی طرح اُس کی نسبت مرد کی طرف بھی ہوتی ہے، سبب ہونے کی حیثیت سے، اس لیے کہ عورت کے پستان میں دودھ کا تحقق اللہ کی قدرت سے بچہ کی پیدائش کے بعد ہوتا ہے، جس میں ظاہر ہے کہ مرد کا دخل ہے۔ جمہور علماء اور ائمہ اربعہ لَبَنُ الفَحل کے قائل ہیں، چنانچہ جس طرح رضاعی بیٹے کی شادی رضاعی ماں سے ناجائز ہے، اسی طرح رضاعی بیٹی کی شادی رضاعی ماں کے شوہر سے ناجائز ہے؛ گویا کہ دودھ پلانے والی عورت جس طرح رضاعی ماں قرار دی گئی، اسی طرح اس کا شوہر رضیع کے لئے باپ قرار دیا گیا ہے۔ وهٰذا هُو مَعنَى لَبَنُ الفَحل عِند الفُقَهاء.

صورتِ مسئلہ مثال سے سمجھیں، مثلاً: عائشہ نے زینب کو دودھ پلایا، تو عائشہ کا شوہر راشد جس کی صحبت سے عائشہ کو دودھ اُترا ہے، اس شوہر کے لیے زینب سے

دودھ پینے والی بچی حرام ہوگئی۔ اسی طرح شوہر راشد کا باپ بچی کے لیے دادا بن گیا، اس لیے راشد کا باپ زینب سے شادی نہیں کرسکتا۔ راشد کا نسبی بیٹا خالد، زینب کا رضاعی بھائی بن گیا، اس لیے زینب اس رضاعی بھائی سے شادی نہیں کرسکتی۔

مَا یَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ: اس جملہ سے ایک اصول بیان کیا ہے، وہ یہ ہے کہ جو عورتیں نسب کی وجہ سے حرام ہیں، رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہوں گی، چنانچہ مرضعہ کی ماں اور اس کی بہن اور اس کی بیٹی اور پوتی، اسی طرح رضاعی باپ کی بیٹی (دوسری بیوی سے) اور اس کی پوتی اور سا کی ماں اور اس کی بہن یہ سب رشتے رضاعت کی وجہ سے حرام ہوجائیں گے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **نَعَم، الرَّضَاعَةُ تُحَرِّمُ ما تُحَرِّمُ الوِلَادَةُ.** (بخاری، ج:۲، ص:۷۶۳) ہاں! رضاعت حرام کرتی ہے ان کو جن کو نسب حرام کرتا ہے۔ مگر مذکورہ اصول سے دو صورتیں مستثنیٰ ہیں:

(۱) پہلی صورت یہ ہے کہ رضاعی بہن کی رضاعی ماں سے نکاح کرنا جائز ہے، کیوں کہ وہ اجنبیہ ہوگئی، اس لیے اس سے نکاح کرنا جائز ہے۔ مثال: خالد اور زینب نے ہندہ کا دودھ پیا اور صرف زینب نے اُمّ سلمہ کا بھی دودھ پیا، تو اب خالد کا نکاح اُمّ سلمہ سے جائز ہے، حالانکہ اُمّ سلمہ خالد کی رضاعی بہن زینب کی رضاعی ماں ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ رضاعی بیٹے کی رضاعی بہن سے نکاح جائز ہے، کیونکہ وہ اجنبی ہے۔ مثال: ساجد اور خالدہ نے رابعہ کا دودھ پیا اور صرف ساجد نے راشدہ کا دودھ پیا، تو راشدہ کا شوہر خالد اپنے رضاعی بیٹے ساجد کی رضاعی بہن خالدہ سے نکاح کرسکتا ہے۔

نقشہ:

خالد	راشدہ	ساجد	رابعہ	خالدہ
شوہر	بیوی			

﴿ کِتَابُ الضَّحَایَا ﴾

قربانی کے احکام و مسائل

قربانی ایک عظیم الشان عبادت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے شروع ہوئی اور اُمت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام تک شروع سے چلی آرہی ہے۔ ہر مذہب وملت کا اس پر عمل رہا ہے۔ قرآنِ کریم میں ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ﴾ (سورۂ حج:۳۴)

ترجمہ: ''ہم نے ہر اُمت کے لیے قربانی مقرر کی؛ تا کہ وہ چوپایوں کے مخصوص جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے''۔

قربانی کا عمل اگرچہ ہر اُمت میں جاری رہا ہے؛ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں خصوصی حیثیت اختیار کر گیا، اسی وجہ سے اسے ''سنت ابراہیمی'' کہا گیا ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محض رضائے الٰہی کے لیے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربانی کیلئے پیش کیا تھا، اسی عمل کی یاد میں ہر سال مسلمان قربانیاں کرتے ہیں۔

نیز قربانی کرتے وقت یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ قربانی کی طرح دیگر تمام عبادات میں مقصود رضائے الٰہی رہے، غیر کیلئے عبادت کا شائبہ ذرّہ برابر بھی دل میں نہ رہے۔

قربانی کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر مداومت فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس سال (مدینہ میں) قیام فرمایا، (اس قیام کے دوران) آپؐ قربانی کرتے رہے۔

قربانی کے فضائل

احادیث میں قربانی کے فضائل بکثرت وارد ہیں، بطور اختصار چند فضائل ذکر کیے جاتے ہیں:

(۱) حضرت زید بن ارقمؓ نے بیان فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے سوال کیا: یارسول اللہؐ! یہ قربانی کیا ہے؟ (یعنی قربانی کی حیثیت کیا ہے؟) آپؐ نے فرمایا: تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا کہ: ہمیں اس قربانی کرنے میں کیا ملے گا؟ فرمایا: ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے پھر سوال کیا: یارسول اللہؐ! اون (کے بدلے میں کیا ملے گا؟) فرمایا: اون کے ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی ملے گی۔ (ابن ماجہ، ص:۲۲۶)

(۲) حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ: عید الاضحیٰ کے دن کوئی نیک عمل اللہ کے نزدیک قربانی کا خون بہانے سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ نہیں۔ اور قیامت کے دن قربانی کا جانور اپنے بالوں، سینگوں اور کھروں سمیت آئے گا۔ اور قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ کی بارگاہ میں شرفِ قبولیت حاصل کر لیتا ہے، لہٰذا تم خوش دلی سے قربانی کیا کرو۔ (ترمذی شریف، ج:۱، ص:۲۷۵)

(۳) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو قربانی دینے کی وسعت اور گنجائش ہو، اور پھر قربانی نہ دے تو وہ ہرگز ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے۔

(ابن ماجہ: ۲۳۳)

(۴) حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینگوں والا مینڈھا قربانی میں دیا، جو سیاہی میں کھاتا، سیاہی میں چلتا، اور سیاہی میں دیکھتا تھا۔ (یعنی اسکے پاؤں منہ اور آنکھ سیاہ تھے، بقیہ سفید تھا)

(ابن ماجہ: ۲۳۳)

(۵) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قربانی دینے کا ارادہ فرماتے تو دو بڑے بڑے، موٹے تازے، سینگوں والے، چتکبرے اور خصی بکرے خریدتے، اُن میں سے ایک اپنی اُمت کے اُن افراد کی طرف سے کرتے جو اللہ کی توحید اور حضور ﷺ کے احکامِ الٰہیہ پہنچانے کی گواہی دینے والے ہوتے۔ اور دوسرا آپ اپنی اور اپنی اولاد کی طرف سے ذبح کرتے۔

<u>مذکورہ پانچ عدد روایات سے درج ذیل مسائل معلوم ہوئے:</u>

(۱) قربانی واجب ہے؛ کیونکہ اُس کے ترک پر شدید وعید آئی ہے۔

(۲) عید کے دن قربانی سے زیادہ محبوب اور کوئی عمل نہیں۔ اس سے ان تمام نام نہاد دانشوروں کی تردید ہوتی ہے جو قربانی کے بجائے اس پر اٹھنے والی رقم کو غرباء میں تقسیم کرنے کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔

(۳) سینگوں والا، خوب موٹا تازہ، مینڈھا قربانی کرنا بہت اچھا ہے۔

(۴) حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ قربانیاں کیا کرتے تھے ایک اپنی امت کی طرف

سے اور دوسرا اپنی اور اپنی اولاد کی طرف سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غیر کی طرف سے قربانی کرنا اچھا عمل ہے۔

نوٹ: غیر کی طرف سے قربانی کرتے وقت اپنی طرف سے قربانی کرنا پہلے واجب ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اپنی واجب قربانی چھوڑ دے اور دوسرے کی طرف سے قربانی کر کے گناہ اپنے سر مول لے لیا۔

قربانی واجب ہے یا سنت؟

قربانی کو واجب یا سنت مؤکدہ کا نام دینے میں زمانۂ قدیم سے اختلاف چلا آ رہا ہے۔ احناف نے قرآن و حدیث کی روشنی میں ہر صاحب حیثیت پر اس کے وجوب کا فیصلہ فرمایا ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ بھی وجوب کے قائل ہیں۔

البتہ بعض دوسرے حضرات نے قربانی کے سنت مؤکدہ ہونے کا فیصلہ فرمایا ہے۔ اُن کی دلیل وہی حدیث ہے جس میں صحابۂ کرامؓ کے سوال وجواب میں آپ نے ارشاد فرمایا: قربانی تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔

دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہاں سنت سے مراد: ''راستہ اور طریقہ'' ہے، جو وجوب کی نفی کرتا ہے۔ اور نہ ہی مخالفین کے لیے حضور ﷺ کے ارشاد ''لَم تُكتَبْ عَلَيكُم'' ''تم پر فرض نہیں کی گئی'' میں حجت ہے؛ کیونکہ فرضیت کے ہم بھی قائل نہیں ہیں، ہم وجوب کے قائل ہیں۔ اور فرض کا منکر کافر ہوتا ہے۔

قربانی کے وجوب کے متعدد دلائل

(۱) اللہ نے قرآن میں ارشاد فرمایا ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَ انْحَرْ﴾ نماز پڑھئے اپنے رب کے لیے اور قربانی کیجیے۔ (الکوثر:۱-۲) اس آیت میں اللہ نے قربانی کرنے کا حکم دیا ہے۔

عربی زبان میں امر کا صیغہ عموماً وجوب کے لئے ہوا کرتا ہے۔ "وَانْحَرْ" کے متعدد مفہوم مراد لئے گئے ہیں؛ مگر سب سے زیادہ راجح قول قربانی کرنے کا ہی ہے۔ چنانچہ جس طرح "فَصَلِّ لِرَبِّكَ" سے نمازِ عید کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے، اسی طرح سے قربانی کا واجب ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

(۲) آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "جس شخص میں قربانی کرنے کی وسعت ہو، پھر بھی قربانی نہ کرے، تو (ایسا شخص) ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے۔ (مسند احمد، ج:۲،ص:۳۳۱) عصر قدیم سے عصر حاضر کے جمہور محدثین نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور اس حدیث میں آپ ؐ نے سخت وعید کا اعلان کیا ہے۔ اور اس طرح کی وعید عموماً ترکِ واجب پر ہی ہوتی ہے۔

(۳) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مَن ذَبح قَبلَ الصَّلاةِ فلْيَذبحْ شَاةً مَكانَهَا" جس شخص نے نمازِ عید سے قبل قربانی کر لی، تو اسے اس کی جگہ دوسری قربانی کرنی ہوگی۔

اگر قربانی واجب نہ ہوتی تو حضور ﷺ نمازِ عید سے قبل قربانی کرنے کی صورت میں دوسری قربانی کرنے کا حکم نہیں دیتے، باوجودیکہ اس زمانہ میں تمام حضرات کے پاس مال کی فراوانی نہیں تھی۔

ان تمام احادیث سے معلوم ہوا کہ قربانی واجب ہے۔

قربانی کس پر واجب ہے؟

جس مرد و عورت میں قربانی کے ایام میں درجِ ذیل باتیں پائی جاتی ہوں، اس پر قربانی واجب ہے:

(۱) مسلمان ہو۔ دلیل: ”لِأنَّها قُربةٌ، والكافِرُ لَيسَ مِن أهلِ القُربِ“.
قربانی عبادت وقربت کا نام ہے، اور کافر عبادت وقربت کا اہل نہیں۔
(بدائع الصنائع، ج:۴، ص:۱۹۵)

(۲) آزاد ہو۔ دلیل: ”لأنَّ العَبدَ لاَ يَملِكُ“. قربانی غلام پر واجب نہیں، کیونکہ وہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ (البحر الرائق، ج:۲، ص:۱۷۱)

(۳) صاحب نصاب ہو۔ دلیل: آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کو وسعت ہو اس کے باوجود قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قربانی کے لیے صاحب وسعت ہونا ضروری ہے، جسے ”صاحبِ نصاب“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۴) مقیم ہو، مسافر پر قربانی واجب نہیں۔ دلیل: عَن عَليٍّ قالَ: ليسَ عَلَى المُسافِرِ أضحِيَّةٌ. حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ مسافر پر قربانی واجب نہیں۔
(المحلى بالآثار، ج:۶، ص:۳۷)

قربانی کا نصاب

قربانی واجب ہونے کا نصاب وہی ہے، جو نصاب صدقۃ الفطر کے واجب ہونے کا ہے، پس جس مرد یا عورت کی ملکیت میں ساڑھے سات تولہ سونا، یا ساڑھے باون تولہ چاندی، یا نقدی مال، یا تجارت کا سامان، یا ضرورت سے زائد سامان میں سے کوئی ایک چیز، یا اِن پانچ چیزوں، یا بعض کا مجموعہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو تو ایسے مرد وعورت پر قربانی کرنا واجب ہے۔
(الجوہرۃ النیرۃ، ج:۱، ص:۱۶)

یاد رہے کہ وہ اشیاء جو ضرورت وحاجت کی نہ ہوں؛ بلکہ محض نمود ونمائش کی ہوں، یا گھروں میں رکھی ہوئی ہوں اور سارا سال استعمال میں نہ آتی ہوں، تو وہ بھی نصاب میں شامل ہوں گی۔ (بدائع الصنائع، ج:۲، ص:۱۵۹)

(ب:۴۸) كِتَابُ الضَّحَايَا وَمَا يُجْزِئُ مِنْهَا

قربانی میں کون کون سے جانور ذبح کرنا جائز ہے؟

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ، كَانَ يَقُولُ: فِي الضَّحَايَا وَالْبُدْنِ الثَّنِيُّ فَمَا فَوْقَهُ.

ترجمہ: نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ قربانی کے جانور میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ: اس میں بدنہ، ثنی، یا اس سے بڑا جانور ہونا چاہیے۔

قربانی کے جانور کی عمریں کتنی ہونی چاہیے؟

تشریح: باب میں مذکور چند الفاظ کی تعریف ملاحظہ ہو:

الضَّحَايَا: عام قربانی کے جانور کے لیے بولا جاتا ہے۔

البـــدن: گائے اور اونٹ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

الثِنـــي: اونٹ، گائے اور بکری وغیرہ جانوروں میں سے ہر ایک میں "ثنی" پایا جاتا ہے، اسلئے اس کی عمر الگ الگ مراد ہوگی۔

اونٹ میں پانچ سال کی عمر۔ گائے، بیل، بھینس اور بھینسا میں مکمل دو سال کی عمر۔ بکرا، بکری، بھیڑ اور دُنبہ میں مکمل ایک سال کی عمر "ثنی" کہلاتا ہے۔ اس سے کم عمر والے جانور کی قربانی جائز نہیں۔ البتہ چھ ماہ کا دُنبہ اگر اس قدر فربہ ہو کہ وہ

سال بھر کا معلوم ہوتا ہو تو اس کی قربانی درست ہے۔

حدیث مذکور میں "ضحایا" کے بعد لفظ "بدن" ذکر کیا گیا، پھر "ثنی" اور "مافوق" مذکور ہوئے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ بدن کے ساتھ ثني مخصوص نہیں؛ بلکہ تین اقسام کے جانور جن کی قربانی دی جاتی ہے، اُن میں سے ہر ایک کا ثنی ہونا شرط ہے، (یعنی اونٹ، گائے اور بکری)۔ اور یہ بھی ذہن نشین رہے کہ مذکورہ تین اقسام کے جانوروں میں نر اور مادہ دونوں شامل ہیں۔ اور گائے میں بھینس، بھینسا، اور بکری میں بھیڑ اور مینڈھا شامل ہیں۔

اعتراض: بکری کے بارے میں تم ایک سال کی عمر کی شرط لگاتے ہو، اور اس سے کم عمر والے کی قربانی ممنوع قرار دیتے ہو؛ حالانکہ بعض صحابہ کرامؓ نے بکری کا چھ ماہ کا بچہ بھی قربان کیا ہے۔

جواب: جن صحابہؓ نے چھ ماہ کا بچہ قربان کیا ہے وہ قانون وقاعدۂ مذکورہ سے مستثنیٰ ہیں، یہ صرف ان کو خصوصی اجازت ملی تھی، لہٰذا اس تخصیص کی بناء پر مذکورہ قاعدہ اور ضابطہ میں کوئی خرابی نہیں۔ (صحیح مسلم، ج:۲، ص:۱۵۴)

اعتراض(۲): پیچھے عبارت میں یہ بات آئی کہ بھیڑ اور مینڈھا بکری کے حکم میں ہیں، جس سے بکری، بکرے کی عمر ایک سال کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح بھیڑ کی بھی عمر ایک سال کا ہونا ضروری ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک سال سے کم عمر کا بھیڑ قربانی میں دینا جائز نہیں؛ حالانکہ بھیڑ کا چھ ماہ کا بچہ تم جائز قرار دیتے ہو؟

جواب: قیاس کی حد تک یہ بات درست نظر آتی ہے؛ لیکن یہ مسئلہ قیاسیہ نہیں؛ بلکہ حضور ﷺ نے بھیڑ کا چھ ماہ کا بچہ جائز قرار دیا ہے، اسکے لیے کوئی تخصیص نہیں فرمائی۔

اور بعض نے ایک شرط رکھی ہے کہ چھ ماہ کا بھیڑ کا بچہ اس وقت جائز ہے جب سال بھر کا نہ ملتا ہو، یا موجود نہ ہو؛ لیکن یہ بات درست نہیں؛ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا شرط وقید "جَذَعٌ مِن الضَّأن أضحِیَّة" کو جائز قرار دیا ہے۔

(ابن ماجہ، ص:۲۳۴)

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخبَرَنَا نَافِعٌ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، أَنَّهُ كَانَ يَنْهَى عَمَّا لَمْ تُسِنَّ مِنَ الضَّحَايَا وَالْبُدْنِ، وَعَنِ الَّتِي نَقَصَ مِنْ خَلْقِهَا.

ترجمہ: نافع بیان کرتے ہیں: حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایسے جانور کو قربان کرنے سے منع کیا کرتے تھے جو مُسِنّ نہ ہو۔ اور ایسے جانور کو بھی قربان کرنے سے منع کیا کرتے تھے جس میں کوئی نقص موجود ہو۔

عیب دار جانور کی قربانی درست نہیں

تشریح: مذکورہ روایت میں حضرت عمرؓ کے حوالے سے یہ بات ذکر کی گئی کہ آپ نقص والے جانور کی قربانی سے منع فرمایا کرتے تھے۔ نقص یا تو پیدائشی ہوگا، یا پھر بعد میں کسی عارضہ کی بناء پر پیدا ہو گیا ہوگا۔ پیدائشی نقص سے مراد یہاں یہ ہے کہ جانور میں ایسی خرابی کہ جس کی وجہ سے اس کی قیمت اور اس کے گوشت پوست اور چربی میں کمی واقع ہو جائے۔

امام زرقانیؒ لکھتے ہیں: تمام فقہائے کرامؒ نے ایسے جانور کی قربانی کے جواز پر اتفاق کیا جس کے پیدائشی سینگ نہ ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور میں نقص مکروہ وہ ہے جس سے جانور کو اذیت ہوتی ہے اور اس سے اس کی قیمت اور چربی میں کمی آجاتی ہے۔ (البتہ پیدائشی وہ نقص کہ جس سے قربانی جائز نہ ہو سکتی ہو، وہ

کسی جانور کے کٹے ہوئے کان ہونا ہے، یعنی پیدائشی کان نہیں ہیں)۔

(زرقانی شرح مالک، ج:۳، ص:۲۰۷)

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ ایسے جانور کی قربانی جائز قرار دیتے ہیں جس کا سینگ ٹوٹا ہوا ہو۔ اور امام مالکؒ نے فرمایا کہ: اگر سینگ ٹوٹنے کے ساتھ خون نکل آیا، تو اس جانور کی قربانی جائز نہیں؛ ورنہ جائز ہے۔

معلوم ہوا کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک سینگ مکمل طور پر ٹوٹے ہوئے جانور کی قربانی جائز ہے، بشرطیکہ اس کی جڑ (مینخ) باقی ہو، جو دماغ سے متصل ہوتی ہے۔ اگر وہ حصہ بھی ضائع ہو گیا، تو پھر قربانی جائز نہیں۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، أَنَّهُ ضَحَّى مَرَّةً بِالْمَدِينَةِ فَأَمَرَنِي أَنْ أَشْتَرِيَ لَهُ كَبْشًا فَحِيلاً أَقْرَنَ، ثُمَّ أَذْبَحَهُ لَهُ يَوْمَ الأَضْحَى فِي مُصَلَّى النَّاسِ فَفَعَلْتُ، ثُمَّ حُمِلَ إِلَيْهِ، فَحَلَقَ رَأْسَهُ حِينَ ذُبِحَ كَبْشُهُ، وَكَانَ مَرِيضًا لَمْ يَشْهَدِ الْعِيدَ مَعَ النَّاسِ، قَالَ نَافِعٌ: وَكَانَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ يَقُولُ: لَيْسَ حِلاقُ الرَّأْسِ بِوَاجِبٍ عَلَى مَنْ ضَحَّى إِذَا لَمْ يَحُجَّ، وَقَدْ فَعَلَهُ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ.

ترجمہ: نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں قربانی دینی چاہی تو انہوں نے مجھے فرمایا کہ: ان کے لیے میں ایک مینڈھا خریدوں، جو سینگوں والا ہو، پھر میں اُن کی طرف سے قربانی کے دن عیدگاہ میں ذبح کروں۔ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی، پھر اس ذبح شدہ جانور کو آپ کے پاس پہنچایا گیا، تو آپ نے اپنا سر منڈایا، جبکہ وہ مینڈھا ذبح کیا گیا۔ آپ بیمار تھے اور لوگوں کے ساتھ عیدگاہ تک نہیں جاسکتے تھے۔

نافعؒ بیان کرتے ہیں: حضرت عبداللہ بن عمرؓ یہ فرمایا کرتے تھے کہ: قربانی کرنے والے پر سر منڈانا ضروری نہیں ہے، جب کہ اس نے حج نہ کیا ہو۔ راوی کہتے ہیں: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یوں ہی برکت کے لیے سر منڈوایا۔

تشریح: اس روایت سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) پہلی بات یہ کہ عید کی نماز پڑھ کر عید گاہ کے قریب قربانی کے جانور کو ذبح کرنا افضل ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول شریف یہی تھا۔ امام زرقانیؒ لکھتے ہیں: يَوم الأضحٰى فِي مُصلَّى النَّاس اِتِّباعًا للمُصطفى. عید کے دن عید گاہ میں قربانی کے جانور کو ذبح کرنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں ہے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ قربانی کر لینے کے بعد حجامت بنوانا افضل ہے، واجب نہیں۔ ہاں! صرف ان لوگوں پر ایسا کرنا واجب ہے جو حج کا احرام باندھے ہوئے قربانی کرتے ہیں۔

(۳) تیسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ خصی کی قربانی درست ہے؛ بلکہ افضل ہے، اور خصی ہونا کوئی عیب نہیں؛ لیکن بعض لوگ اسے نقص شمار کر کے اعتراض کرتے ہیں، جو بے جا اور خلافِ سنت ہے، کیونکہ حضرت انس بن مالکؓ کی ایک روایت ہے جس میں خصی کی قربانی دینا حضور ﷺ سے ثابت ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا كُلِّهِ نَأْخُذُ إِلا فِي خَصْلَةٍ وَاحِدَةٍ، الْجَذَعُ مِنَ الضَّأْنِ إِذَا كَانَ عَظِيمًا أَجْزَأَ، فِي الْهَدْيِ وَالأُضْحِيَةِ، بِذَلِكَ جَاءَتِ الآثَارُ: الْخَصِيُّ مِنَ الأُضْحِيَةِ يُجْزِءُ مِمَّا يُجْزِءُ مِنْهُ الْفَحْلُ، وَأَمَّا

الْحِلاقُ فَنَقُولُ فِيهِ بِقَوْلِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ: إِنَّهُ لَيْسَ بِوَاجِبٍ عَلٰى مَنْ لَمْ يَحُجَّ فِي يَوْمِ النَّحْرِ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا

ترجمہ: امام محمدؒ کہتے ہیں کہ ہم ان تمام باتوں پر عمل کرتے ہیں، صرف ایک بات میں ہمارا اختلاف ہے، وہ یہ کہ اگر چھ ماہ کا مینڈھا قد وقامت میں بڑا ہو تو اس کی بھی قربانی دینا جائز ہے۔ اس بارے میں بہت سے آثار بھی وارد ہیں۔ اور جہاں فحل (غیر خصی) جائز ہے، وہاں خصی بھی جائز ہے۔ اور سر منڈوانے کے بارے میں ہم وہی کہتے ہیں جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے۔ اور ہمارے عام فقہائے کرام بھی یہی فرماتے ہیں (یعنی جس شخص نے حج نہیں کیا، اس کے لیے قربانی کے دن سر منڈوانا واجب نہیں ہے)۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ چھ ماہ کا دُنبہ اگر اتنا موٹا تازہ ہو کہ سال بھر کا معلوم ہوتا ہو اور سال بھر والے بھیڑ دنبوں میں اگر چھوڑ دیں تو فرق معلوم نہ ہوتا ہو، تو چھ مہینے کے ایسے دنبے اور بھیڑ کی قربانی درست ہے، ورنہ درست نہیں۔

نوٹ: مزید تفصیل ماقبل میں آچکی ہے، وہاں دیکھ لیا جائے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ، لَمْ يَكُنْ يُضَحِّي عَمًّا فِي بَطْنِ الْمَرْأَةِ، قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ لا يُضَحّٰى عَمَّا فِي بَطْنِ الْمَرْأَةِ.

ترجمہ: نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ماں کے پیٹ میں موجود بچے کی طرف سے قربانی نہیں کرتے تھے۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں: ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ عورت

کے پیٹ میں موجود بچے کی طرف سے قربانی نہیں کی جائے گی۔

تشریح: اس روایت میں حضرت ابن عمرؓ کا عمل مذکور ہوا کہ آپ ’’جنین‘‘ کی طرف سے قربانی نہیں فرمایا کرتے تھے۔ جنین وہ بچہ جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہو۔ وجہ یہ ہے کہ قربانی ایک عبادت ہے اور اس کی ادائیگی اصلاً یا نیابۃً زندہ سے متعلق ہوتی ہے، وہ بچہ جو ابھی اپنی والدہ کے شکم میں ہے، اس کے پیدا ہونے یا نہ ہونے کا یقین نہیں، لہٰذا جس کی زندگی مشکوک ہو، اس کی طرف سے قربانی نہیں ہو سکتی۔ امام محمدؒ نے اسی کو اپنا مسلک قرار دیا ہے۔

(ب:۴۹) بَابُ مَا يُكرَه مِن الضَّحَايَا

قربانی میں جو جانور مکروہ ہیں، اُن کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا عَمْرُو بْنُ الْحَارِثِ، أَنَّ عُبَيْدَ بْنَ فَيْرُوزَ، أَخْبَرَهُ، أَنَّ الْبَرَاءَ بْنَ عَازِبٍ، سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَاذَا يُتَّقَى مِنَ الضَّحَايَا؟ فَأَشَارَ بِيَدِهِ، وَقَالَ: أَرْبَعٌ، وَكَانَ الْبَرَاءُ بْنُ عَازِبٍ يُشِيرُ بِيَدِهِ وَيَقُولُ: يَدِي أَقْصَرُ مِنْ يَدِهِ وَهِيَ الْعَرْجَاءُ الْبَيِّنُ ظَلْعُهَا، وَالْعَوْرَاءُ الْبَيِّنُ عَوَرُهَا، وَالْمَرِيضَةُ الْبَيِّنُ مَرَضُهَا، وَالْعَجْفَاءُ الَّتِي لا تُنْقِي.

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا: قربانی میں کن چیزوں سے بچا جائے؟ تو آپؐ نے اشارے کے ذریعہ اُنہیں جواب دیا کہ: چار چیزوں سے۔ حضرت براء بن عازبؓ نے اپنے ہاتھ کے ذریعے اشارہ کر کے یہ بات بتائی اور بولے: میرا ہاتھ نبی اکرم ﷺ کے دست

مبارک سے چھوٹا ہے۔ (وہ چار قسم کے جانور یہ ہیں) ایسا لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن واضح ہو۔ ایسا کانا جانور جس کا کانا ہونا واضح ہو۔ ایسا بیمار جانور جس کی بیماری واضح ہو۔ اور ایسا کمزور جانور جس کے جسم پر کچھ بھی باقی نہ رہا ہو۔

کن عیب دار جانوروں کی قربانی درست نہیں؟

تشریح: اس مذکورہ روایت میں امام محمدؒ نے حضرت براء بن عازبؓ سے ان چار نقائص وعیوب کو بیان فرمایا جن کی موجودگی میں جانور کی قربانی جائز نہیں۔ لنگڑا، کانا، بیمار اور انتہائی لاغر۔ اس کے بعد انہوں نے ان چاروں نقائص کی اپنے طور پر کچھ وضاحت فرمائی۔

وہ یہ کہ لنگڑے سے مراد وہ جانور ہے جو اپنے پاؤں سے چل نہ سکے، اگر لنگڑا چل سکتا ہے تو اس کی قربانی جائز ہے۔ اسی طرح کانا، وہ کہ جس کی نصف بینائی سے زیادہ جاتی رہی ہو، وہ ناجائز ہے اور اس سے کم میں جائز ہے۔

بیمار اور لاغر کے متعلق اگرچہ یہاں کوئی تفصیل مذکور نہیں؛ لیکن اس سے مراد وہ بیمار ہے کہ جس مرض سے اس جانور کی زندگی بیکار ہو کر رہ جائے۔

ملا علی قاریؒ نے فرمایا کہ: یہ ایسا جانور ہے جو چارہ نہ کھاتا ہو۔ بعض دیگر کتبِ فقہ میں مریض سے مراد وہ جانور ہے کہ جس کے صحت مند ہونے کی اُمید نہ رہے۔

ان چار نقائص کے علاوہ اور بھی نقائص وعیوب ہیں جن کا ذکر مختلف احادیث میں وارد ہے۔ چنانچہ "سنن ابی داؤد" میں مزید کچھ نقائص بیان کیے ہیں۔ ان میں سے ایک وہ جانور کہ جس کے دو یا چار دانت نکلے ہوئے ہوں، اسے یزید بصری نے قربانی میں دینا جائز نہ سمجھا، لیکن حضرت عقبہ نے اسے جائز قرار دیا۔ ناجائز جانوروں کی انہوں نے نشاندہی فرمائی، ان میں سے مصفرہ، مستأصلہ، بخقہ،

مشیئہ، اور قصرہ ہیں، جن کی تفصیل ذکر کی جارہی ہے:

(۱) **مصفرہ:** سے مراد وہ جانور ہے کہ جس کا کان اتنا کٹا ہوا ہو کہ جس سے اس کا سوراخ کھل جائے۔

(۲) **مستأصلہ:** وہ ہے جس کا سینگ جڑ سے نکل گیا ہو۔

(۳) **بھقہ:** سے مراد وہ جانور ہے جس کی بینائی جاتی رہی ہو۔

(۴) **مشیئہ:** ایسا لاغر اور کمزور جانور، جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ چل پھر نہ سکتا ہو۔

(۵) **قصرہ:** وہ جانور جس کا ہاتھ پاؤں کٹ گیا ہو۔

اس کے علاوہ دیگر اقسام کے جانور قربانی میں جائز ہیں۔

کان کٹے اور سینگ ٹوٹے جانور میں فرق

سینگ اگر پورا ٹوٹ گیا، لیکن جڑ باقی ہے، تو اس کی قربانی جائز ہے۔ لیکن کان اگر پچھلی طرف سے کٹا ہوا ہے، یا چر گیا، چرنا خواہ گولائی میں ہو یا لمبائی میں، یہ اگر نصف کان یا اس سے زیادہ میں ہو، وہ نا جائز ہے۔

سینگ اور کان میں فرق کی ایک وجہ یہ ہے کہ سینگ کے ٹوٹنے سے جانور کو تکلیف نہیں ہوتی؛ کیونکہ اس میں خون نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے ٹوٹنے سے قیمت میں یا چربی میں کمی واقع ہوتی ہے۔ لیکن کان کے کاٹنے سے جانور کو تکلیف ہوتی ہے۔ جانور کی سماعت میں بھی فرق آجاتا ہے، کیونکہ کان میں تہہ اور سلوٹیں آواز کو ہوا کے ساتھ ملا کر اندر داخل کرتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ جس کے پیدائشی کان نہیں اس کی قربانی جائز نہیں۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، فَأَمَّا الْعَرْجَاءُ فَإِذَا مَشَتْ عَلَى رِجْلِهَا

فَهِيَ تُجْزِئُ، وَإِنْ كَانَتْ لَا تَمْشِي لَمْ تُجْزِءْ، وَأَمَّا الْعَوْرَاءُ فَإِنْ كَانَ بَقِيَ مِنَ الْبَصَرِ الأَكْثَرُ مِنْ نِصْفِ الْبَصَرِ أَجْزَأَتْ، وَ إِنْ ذَهَبَ النِّصْفُ فَصَاعِدًا لَمْ تُجْزِئْ، وَأَمَّا الْمَرِيضَةُ الَّتِي فَسَدَتْ لِمَرَضِهَا، وَالْعَجْفَاءُ الَّتِي لا تُنْقِي فَإِنَّهُمَا لا يُجْزِئَان.

ترجمہ: امام محمدؒ کہتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ بہرحال لنگڑا جو اپنے پاؤں سے چل سکتا ہو، تو ایسے لنگڑے جانور کی قربانی جائز ہے۔ اور اگر چلنے سے عاجز ہے تو پھر اس کی قربانی ناجائز ہے۔ اور کانا اگر اس کی نظر نصف سے کم خراب ہو، تو جائز ہے۔ اور اگر اس سے زیادہ خراب ہو، تو ناجائز ہے۔ اور وہ بیمار کہ جو بیماری سے بالکل ناکارہ ہو گیا ہو۔ اور کمزور کہ جس کی چربی تک نہ رہی ہو، یہ دونوں ناجائز ہیں۔

تشریح: یہاں سے امام محمدؒ حدیث میں مذکور نقائص کی تشریح فرمارہے ہیں:

فَأَمَّا العَرجَاءُ: لنگڑا جانور اگر ایک پاؤں پر چل سکتا ہو تو اس کی قربانی جائز ہے۔ لیکن اگر ایک پاؤں پر بھی چل نہ سکتا ہو تو اس کی قربانی جائز نہیں۔

العَورَاءُ: جہاں تک کانے جانور کا تعلق ہے، اس کی بصارت کا اکثر حصہ باقی ہے یعنی جو نصف حصے سے زائد ہو، تو اس کی قربانی جائز ہوگی؛ لیکن اگر اس کی نصف بصارت رخصت ہو چکی ہے تو اس کی قربانی جائز نہیں ہوگی۔

المَرِيضَة: بیمار جانور سے مراد یہ ہے کہ جو اپنی بیماری سے بالکل لاغر ہو چکا ہو اور اس کے اندر چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہی ہو، تو ایسے جانور کی قربانی جائز نہیں ہے۔

العَجفاء: جانور کے کمزور ہونے سے مراد یہ ہے کہ جس کی چربی بالکل ختم ہو چکی ہو، تو ایسے جانور کی قربانی جائز نہیں ہے۔

(ب:۵۰) بَابُ لُحُومِ الأَضَاحِي

قربانی کے گوشت کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ أَبِي بَكْرٍ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ وَاقِدٍ، أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ أَخْبَرَهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ أَكْلِ لُحُومِ الضَّحَايَا بَعْدَ ثَلاثٍ، قَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ أَبِي بَكْرٍ: فَذَكَرْتُ ذَلِكَ لِعَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، فَقَالَتْ: صَدَقَ، سَمِعْتُ عَائِشَةَ أُمَّ الْمُؤْمِنِينَ تَقُولُ: دَفَّ نَاسٌ مِنْ أَهْلِ الْبَادِيَةِ حَضْرَةَ الأَضْحَى فِي زَمَانِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: ادَّخِرُوا الثُّلُثَ، وَتَصَدَّقُوا بِمَا بَقِيَ، فَلَمَّا كَانَ بَعْدَ ذَلِكَ قِيلَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، لَقَدْ كَانَ النَّاسُ يَنْتَفِعُونَ فِي ضَحَايَاهُمْ، يُحَمِّلُونَ مِنْهَا الْوَدَكَ وَيَتَّخِذُونَ مِنْهَا الأَسْقِيَةَ، قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَمَا ذَاكَ؟ كَمَا قَالَ، قَالُوا: نَهَيْتَ عَنْ إِمْسَاكِ لُحُومِ الأَضَاحِي بَعْدَ ثَلاثٍ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّمَا نَهَيْتُكُمْ مِنْ أَجْلِ الدَّافَّةِ الَّتِي كَانَتْ دَفَّتْ حَضْرَةَ الأَضْحَى، فَكُلُوا وَتَصَدَّقُوا وَادَّخِرُوا.

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا أَبُو الزُّبَيْرِ الْمَكِّيُّ، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ أَنَّهُ أَخْبَرَهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ أَكْلِ لُحُومِ

الضَّحَايَا بَعْدَ ثَلَاثٍ، ثُمَّ قَالَ بَعْدَ ذٰلِكَ: كُلُوا وَتَزَوَّدُوا وَادَّخِرُوا.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن کے بعد قربانی کا گوشت کھانے سے منع فرما دیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن ابوبکر نامی راوی روایت کرتے ہیں کہ: میں نے اس بات کا تذکرہ عمرہ بنت عبدالرحمٰنؒ سے کیا تو وہ بولیں: حضرت عبداللہ نے سچ کہا ہے۔ میں نے سیدہ عائشہؓ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ اقدس میں کچھ دیہاتی عیدالاضحیٰ کے موقع پر (مدینہ منورہ) آ گئے تو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک تہائی حصہ جمع رکھو اور اس کے علاوہ جو بچ جائے اسے صدقہ کر دو۔ جب اگلا سال آیا تو عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! لوگ تو پہلے اپنے قربانی کے جانوروں سے نفع حاصل کیا کرتے تھے، اس کی چربی کو سنبھال کر رکھا کرتے تھے، اس کے مشکیزے بنایا کرتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اب کیا ہوا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: آپ نے پچھلے سال قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ رکھنے سے منع کر دیا تھا۔ تو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ تو میں نے تمہیں اس لیے منع کیا تھا کہ کچھ نادار لوگ آ گئے تھے جو عیدالاضحیٰ کے موقع پر یہاں آئے تھے۔ اب تم اسے کھا بھی سکتے ہو، صدقہ بھی کر سکتے ہو اور جمع بھی کر سکتے ہو۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ رکھنے سے منع کیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے یہ بات ارشاد فرمائی: تم اسے کھا بھی سکتے ہو اور زادِ راہ کے طور پر استعمال بھی کر سکتے ہو اور ذخیرہ بھی کر سکتے ہو۔

قربانی کا گوشت کتنے دن رکھ سکتے ہیں؟

تشریح: اس روایت میں ایک ایسا مسئلہ ذکر کیا گیا ہے جو ابتداء میں حکم شرعی تھا، لیکن بعد میں خود صاحبِ شرعؐ نے منسوخ فرمادیا۔

مسئلہ یہ ہے کہ قربانی کے جانوروں کا گوشت ابتدا میں صرف تین دن تک کے لیے رکھنے کی اجازت تھی، اس سے زائد جمع کرنے سے حضور ﷺ نے منع فرمادیا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ کچھ دیہاتی لوگ قربانی کے دنوں میں آجاتے جو یہ خواہش لے کر آتے کہ ہمیں بھی کچھ گوشت مل جائے گا، تو اُن کی خاطر حضور ﷺ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو صرف تین دن تک کے لیے گوشت رکھنے اور باقی ماندہ ان غرباء پر صدقہ کرنے کا حکم دیا، لیکن بعد میں جب اس کی ضرورت نہ رہی تو آپ نے تین دن سے زائد کے لیے گوشت رکھنے کی اجازت عطا فرما کر پہلے حکم کو منسوخ فرمادیا۔

لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ بعض حضرات کو صرف ابتدائی حکم نبوی کا علم تھا، اس لیے وہ بعد میں بھی اس کے مطابق عمل پیرا رہے۔ امام بیہقیؒ نے ان کا یہ عمل ذکر کیا ہے، چنانچہ حضرت سالم حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن سے زائد قربانی کا گوشت کھانے سے منع فرمادیا تھا۔ حضرت سالم بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ تین دن کے بعد قربانی کا گوشت نہیں کھایا کرتے تھے۔

(بیہقی، ج:۹، ص:۲۹۰)

ان دو صحابۂ کرامؓ کے علاوہ باقی تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب اور عمل ہے کہ ابتداء میں تین دن سے زائد قربانی کا گوشت رکھنا ممنوع تھا، لیکن بعد میں اس کی اجازت دے دی گئی۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ، لا بَأْسَ بِالادِّخَارِ بَعْدَ ثَلاثٍ وَالتَّزَوُّدِ، وَقَدْ رَخَّصَ فِي ذَلِكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ أَنْ كَانَ نَهَى عَنْهُ، فَقَوْلُهُ الآخَرُ نَاسِخٌ لِلأَوَّلِ، فَلا بَأْسَ بِالادِّخَارِ وَالتَّزَوُّدِ مِنْ ذَلِكَ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ تین دن کے بعد بھی قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے میں یا زادِراہ کے طور پر اسے ساتھ لے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے پہلے اس سے منع کیا تھا، لیکن بعد میں آپ نے اس کی اجازت دے دی تھی، تو آپ کا بعد والا فرمان پہلے حکم کیلئے ناسخ کی حیثیت رکھے گا، اس لئے قربانی کے گوشت کو ذخیرہ کرنے، یا اُسے زادِراہ کے طور پر ساتھ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں اگرچہ تین دن سے زیادہ قربانی کے گوشت کی ذخیرہ اندوزی سے منع کیا گیا تھا؛ مگر یہ ممانعت ایک عارضی تھی، بعد میں آپ ﷺ نے اس کی اجازت مرحمت فرمادی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "كُلُوْا وَادَّخِرُوْا وَتَصَدَّقُوْا". اس لئے سابقہ ممانعت بعد کی اجازت سے منسوخ ہوگئی۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا أَبُو الزُّبَيْرِ الْمَكِّيُّ، أَنَّ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ أَخْبَرَهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَنْهَى عَنْ أَكْلِ لُحُومِ الضَّحَايَا بَعْدَ ثَلاثٍ، ثُمَّ قَالَ بَعْدَ ذَلِكَ: كُلُوا وَادَّخِرُوا وَتَصَدَّقُوا، قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ، لا بَأْسَ بِأَنْ يَأْكُلَ الرَّجُلُ مِنْ

أُضْحِيَتِهِ وَيَدَّخِرَ وَيَتَصَدَّقَ، وَمَا نُحِبُّ لَهُ أَنْ يَتَصَدَّقَ بِأَقَلَّ مِنَ الثُّلُثِ، وَإِنْ تَصَدَّقَ بِأَقَلَّ مِنْ ذَلِكَ جَازَ.

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن کے بعد قربانی کا گوشت کھانے سے منع فرما دیا تھا۔ اسکے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا: تم اسے کھاؤ، اسے ذخیرہ کرو اور اسے صدقہ کرو۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں: ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے قربانی کے گوشت کو کھائے، یا اسے ذخیرہ کرے، یا اسے صدقہ کرے؛ تاہم اس کے لیے یہ بات پسند نہیں کریں گے کہ وہ قربانی کے گوشت کے تیسرے حصے سے کم کو صدقہ کرے؛ لیکن اگر وہ اس سے کم حصہ کو صدقہ کرتا ہے یہ صدقہ جائز ہوگا۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ: اگر صاحب اُضحیہ اپنی قربانی کے جانور میں سے کچھ کھائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ بلکہ اگر کھائے تو یہ اس کے لئے مستحب ہے، اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر تناول فرمایا تھا۔ اور اگر قربانی کے گوشت کو ذخیرہ کر کے رکھنا چاہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ صاحب قربانی کے لئے مستحب ہے کہ وہ اپنی قربانی کے گوشت کے تین حصے کرلے، ان میں سے ایک حصہ غریب فقراء میں تقسیم کر دے، اس لیے کہ اللہ فرماتے ہیں: "فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوْا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ". اور دوسرا حصہ اپنے رشتے داروں میں تقسیم کر دے۔ تیسرا حصہ اپنے کھانے کے لئے رکھ لے۔ اور اگر کچھ بھی صدقہ نہ کرے، یا تہائی سے کم صدقہ کرے، تو یہ بھی اس کے لئے جائز ہے۔

(ب:۵۱) بَابُ الرَّجُلِ يَذْبَحُ أُضْحِيَتَهُ قَبْلَ أَنْ يَغْدُوَ يَوْمَ الأَضْحَى

عید کے دن صبح سویرے کسی کا (نماز پڑھنے سے قبل) قربانی کر دینا

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنِي يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ، عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيمٍ، أَنَّ عُوَيْمِرَ بْنَ أَشْقَرَ، ذَبَحَ أُضْحِيَتَهُ قَبْلَ أَنْ يَغْدُوَ يَوْمَ الأَضْحَى، وَأَنَّهُ ذَكَرَ ذَلِكَ لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَأَمَرَهُ أَنْ يَعُودَ بِأُضْحِيَةٍ أُخْرَى.

ترجمہ: عویمر بن اشقر نے عیدالاضحیٰ کے دن اپنے قربانی کے جانور کو عید کے دن نمازِ عید ادا کرنے کے لیے جانے سے پہلے ذبح کر دیا، بعد میں انہوں نے اس بات کا تذکرہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، تو نبی اکرمؐ نے انہیں یہ ہدایت کی کہ وہ اس کی جگہ دوسری قربانی کریں۔

دیہات میں عید کی نماز سے پہلے قربانی کرنا کیسا ہے؟

تشریح: روایت میں ذکر کردہ مسئلہ واضح ہے۔ مسئلہ کا شرعی حکم یہ ہے کہ دیہات میں عید کی نماز ادا نہیں کی جا سکتی ہے، اس حوالے سے دیہات کے رہنے والے لوگوں کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ عید کے دن صبح صادق ہو جانے کے بعد کسی بھی وقت قربانی کر سکتے ہیں، لیکن جس جگہ عید کی نماز ہوتی ہو، وہاں عید کی نماز ادا کرنے سے پہلے اگر کوئی شخص قربانی کر لیتا ہے، تو اس کی قربانی شرعی طور پر قربانی شمار نہیں ہوگی؛ بلکہ یہ ایک عام ذبح شدہ جانور شمار ہوگا۔

اس حکم کی بنیاد یہ ہے کہ قربانی کی نسبت عیدالاضحیٰ کے دن کی طرف کی گئی ہے

اور عیدالاضحیٰ کا دن صبح صادق ہونے کے بعد شروع ہو جاتا ہے، لیکن شہر میں اس کے جواز کے لیے نماز کی ادائیگی کو شرط قرار دیا گیا ہے، تو جب نماز کا ادا کرنا قربانی کے لئے شرط ہوگا، تو لازمی طور پر یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ شہر میں جہاں عید کی نماز ادا کی جاتی ہے وہاں نمازِ عید ادا کرنا واجب ہے، وہاں عید کی نماز پڑھنے سے قبل قربانی نہیں کی جا سکتی، البتہ گاؤں یا دیہات میں رہنے والے شخص پر عید کی نماز واجب ہی نہیں ہے، تو عید کی نماز ادا کرنے سے پہلے اگر وہ قربانی کر لیتے ہیں، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔

یاد رہے کہ ہمارے زمانے میں اصول یہ ہوگا کہ جس آبادی اور بستی میں عید کی نماز ادا کی جاتی ہے وہاں عید کی نماز ادا کرنے سے پہلے قربانی نہیں کی جا سکتی، کیونکہ ہمارے زمانے میں گاؤں بھی چھوٹے شہر کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور وہاں بھی عید کی نماز پڑھنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ، إِذَا كَانَ الرَّجُلُ فِي مِصْرٍ يُصَلَّى الْعِيدُ فِيهِ، فَذَبَحَ قَبْلَ أَنْ يُصَلِّيَ الإِمَامُ فَإِنَّمَا هِيَ شَاةُ لَحْمٍ، وَلا يُجْزِءُ مِنَ الأُضْحِيَةِ، وَمَنْ لَمْ يَكُنْ فِي مِصْرٍ وَكَانَ فِي بَادِيَةٍ أَوْ نَحْوِهَا مِنَ الْقُرَى النَّائِيَةِ عَنِ الْمِصْرِ فَإِذَا ذَبَحَ حِينَ يَطْلُعُ الْفَجْرُ وَحِينَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ أَجْزَأَهُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ جب کوئی شخص کسی ایسے شہر میں رہتا ہوں جہاں عید کی نماز ادا کی جاتی ہو اور پھر وہ شخص امام کے عید کی نماز ادا کرنے سے پہلے قربانی کے جانور کو ذبح کر لے، تو وہ صرف عام گوشت کی طرح ہوگا، شرعی قربانی اس کی طرف سے ادا نہیں

ہوگی۔لیکن جو شخص شہر میں نہ رہتا ہو؛ بلکہ دیہات میں رہتا ہو، یا اس طرح کی کسی ایسی بستی میں رہتا ہو جو شہر سے الگ ہو، تو اگر وہ صبح صادق ہو جانے کے بعد قربانی کے جانور کو ذبح کر دیتا ہے، یا سورج نکلنے کے بعد اسے ذبح کر لیتا ہے تو ایسا کرنا اس کے لیے جائز ہوگا۔امام ابوحنیفہؒ بھی اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر آدمی شہر میں ہے تو اس کے لئے عید کی نماز سے پہلے قربانی کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر اس نے عید کی نماز سے پہلے قربانی کر دی، تو یہ واجب قربانی کی طرف سے کافی نہیں ہوگی بلکہ نماز کے بعد اس کو دوبارہ دوسری قربانی کرنا واجب ہوگا، لیکن اگر کوئی آدمی شہر سے دور جنگل یا دیہات میں رہتا ہے، اگر وہ صبح صادق کے طلوع ہونے کے بعد یا سورج نکلنے کے وقت اپنا قربانی کا جانور ذبح کر لے، تو یہ اس کی واجب قربانی ادا ہو جائے گی۔یہی امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے۔

(ب:۵۲) بَابُ مَا يُجْزِئُ مِنَ الضَّحَايَا عَنْ أَكْثَرَ مِنْ وَاحِدٍ

ایک سے زائد افراد کی قربانی میں شرکت کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا عُمَارَةُ بْنُ صَيَّادٍ، أَنَّ عَطَاءَ بْنَ يَسَارٍ أَخْبَرَهُ، أَنَّ أَبَا أَيُّوبَ، صَاحِبَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخْبَرَهُ، قَالَ: كُنَّا نُضَحِّي بِالشَّاةِ الْوَاحِدَةِ يَذْبَحُهَا الرَّجُلُ عَنْهُ وَعَنْ أَهْلِ بَيْتِهِ، ثُمَّ تَبَاهَى النَّاسُ بَعْدَ ذَلِكَ، فَصَارَتْ مُبَاهَاةً.

ترجمہ: عطاء بن یسارؒ بیان کرتے ہیں کہ: نبی اکرم ﷺ کے صحابی حضرت ابوایوب انصاریؓ نے یہ بات بتائی ہے کہ ہم لوگ ایک بکری ذبح کیا کرتے تھے، کوئی شخص اس بکری کو اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ذبح کرلیا کرتا تھا، لیکن بعد میں لوگوں نے اس حوالے سے ایک دوسرے کے سامنے فخر کا اظہار کرنا شروع کردیا، تو اب یہ صرف فخر کے اظہار کی رسم رہ گئی ہے۔

ایک بکری میں کتنے آدمی شریک ہوسکتے ہیں؟

تشریح: مذکورہ باب میں دو مسئلے بیان ہوئے ہیں: پہلا مسئلہ یہ ہے کہ بکری (نر اور مادہ) مینڈھا اور بھیڑ صرف ایک آدمی کی طرف سے قربانی ہوسکتی ہے، اس میں متعدد افراد کی شرکت ناجائز ہے۔ اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کے قول کا بھی یہی معنی ہے کہ کوئی غریب صحابی جب اپنی طرف سے ایک قربانی ذبح کرتا تو اس کا گوشت وہ کسی اور کو نہ دیتے؛ بلکہ خود گھر والے ہی کھالیتے۔ اپنی طرف سے اور اہل خانہ کی طرف سے قربانی دینے کا یہ مطلب ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایک بکری کی بہت سے آدمیوں کی طرف سے قربانی کرنا جائز ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: كَانَ الرَّجُلُ يَكُونُ مُحْتَاجًا فَيَذْبَحُ الشَّاةَ الْوَاحِدَةَ يُضَحِّي بِهَا عَنْ نَفْسِهِ، فَيَأْكُلُ وَيُطْعِمُ أَهْلَهُ، فَأَمَّا شَاةٌ وَاحِدَةٌ تُذْبَحُ عَنِ اثْنَيْنِ، أَوْ ثَلَاثَةٍ أُضْحِيَةً فَهَذَا لَا يُجْزِيُ، وَلَا تَجُوزُ شَاةٌ إِلَّا عَنِ الْوَاحِدِ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ: اگر کوئی شخص غریب ہو تو وہ ایک بکری کو ذبح کرے گا، وہ اس بکری کو اپنی طرف سے ذبح کرے گا، وہ اسے کھائے

گا، اپنے گھر والوں کو کھلائے گا۔

جہاں تک ایک بکری کے دو یا تین آدمیوں کی طرف سے ذبح کرنے کا تعلق ہے، تو یہ قربانی درست نہیں ہوگی، کیونکہ بکری کی قربانی صرف ایک آدمی کی طرف سے ہوسکتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی فقیر یا محتاج جس پر قربانی واجب نہیں ہے، اگر وہ ایک بکری اپنی طرف سے قربانی میں ذبح کرے اور اس کے گوشت میں اپنے تمام اہل خانہ کو شریک کرلے تو یہ جائز ہے، لیکن ایک بکری واجب قربانی میں ایک سے زائد افراد کی طرف سے جائز نہیں؛ بلکہ ایک بکری ایک شخص کی طرف سے ہی جائز ہوگی، اس لئے کہ اشتراک خلافِ قیاس ہے۔ اور گائے اور اونٹ کی واجب قربانی میں ایک سے زائد افراد کی شرکت کو جائز قرار دیا گیا ہے، تو وہ نص کے بکثرت طرق سے مروی ہونے کی وجہ سے ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے دور میں گائے اور اونٹ میں ایک سے زائد افراد واجب قربانی میں شریک ہوتے تھے، اور بکری میں اشتراک کے سلسلے میں کوئی نص نہیں ہے، اس لیے یہ اپنی اصل پر باقی رہے گی۔ اور یہی امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا أَبُو الزُّبَيْرِ الْمَكِّيُّ، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ، قَالَ: نَحَرْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحُدَيْبِيَةِ الْبَدَنَةَ عَنْ سَبْعَةٍ، وَالْبَقَرَةَ عَنْ سَبْعَةٍ.

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ: ہم نے حدیبیہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات آدمیوں کی طرف سے ایک اونٹ اور سات آدمیوں کی طرف سے ایک گائے قربان کی تھی۔

اونٹ اور گائے میں کتنے افراد شریک ہو سکتے ہیں؟

تشریح: اس روایت میں دوسرا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اونٹ اور گائے (نر اور مادہ، بھینس نر اور مادہ) میں سات آدمی شرکت کر سکتے ہیں، اس سے زائد جائز نہیں۔ ہاں! اگر کم ہوں تو کوئی حرج نہیں۔

اعتراض: کچھ حضرات کہتے ہیں کہ: گائے میں تو سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں، لیکن اونٹ میں دس آدمی تک شریک ہو سکتے ہیں۔ دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے سال خانۂ کعبہ کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے اور آپ نے اپنے ساتھ ستر اونٹ بطور ہدی لے لیے، آپ کے ساتھ سات سو آدمی تھے، اس طرح ایک اونٹ دس آدمیوں کی طرف سے قربان کیا گیا؟ (طحاوی شریف، ج:۴، ص:۱۷۶)۔

جواب: مذکورہ روایت کا جواب یہ ہے کہ اس کے پہلے دونوں راوی (عمران بن حکم، مسور بن مخرمہ) واقعہ حدیبیہ میں موجود نہ تھے۔ اور مؤخر الذکر ویسے ہی صحابی نہیں کہ اسے ان واقعات کا علم ہو، اس لئے ان دونوں کی نسبت حدیبیہ میں قربانی کی روایات ان حضرات کی معتبر ہیں جو اس میں شریک تھے، وہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اونٹ میں بھی سات سے زیادہ شریک نہیں ہو سکتے۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ جس طرح گائے، بیل کے لیے "بدنہ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اسی طرح اونٹ کو بھی "بدنہ" کہا جاتا ہے، لہٰذا دونوں کا حکم ایک ہی ہونا ضروری ہوگا۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، الْبَدَنَةُ وَالْبَقَرَةُ تُجْزِئُ عَنْ سَبْعَةٍ فِي الْأُضْحِيَةِ وَالْهَدْيِ مُتَفَرِّقِينَ كَانُوا، أَوْ مُجْتَمِعِينَ مِنْ أَهْلِ بَيْتٍ وَاحِدٍ،

أَوْ غَيْرِهِ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا رَحِمَهُمُ اللّٰهُ.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ اونٹ اور گائے کی قربانی سات آدمیوں کی طرف سے کرنا جائز ہے، خواہ ایک ساتھ ہوں یا الگ الگ ہوں، خواہ اُن کا تعلق ایک ہی گھر سے ہو، یا الگ الگ خاندان سے ہو۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ اضحیہ اور ہدی میں ایک ''بدنہ''، یا ایک گائے سات افراد کی طرف سے کافی ہو سکتی ہے۔ یہ سات افراد چاہے مختلف علاقے کے رہنے والے ہوں، یا کسی ایک علاقے کے ہوں۔ ایک خاندان کے ہوں، یا ایک سے زائد خاندان کے ہوں۔ یہی امام ابو حنیفہؒ اور اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔

(ب:۵۳) بَابُ الذَّبَائِح

ذبیحہ کا بیان

امام محمدؒ نے اس باب کے تحت اُن جانوروں کا ذکر فرمایا ہے جو حلال یا حرام ہیں اور حلت و حرمت کی اقسام بیان فرمائیں۔ چونکہ یہ بہت اہم مسئلہ ہے جس کا اجمالی ذکر امام محمدؒ نے بھی کیا ہے، اس لئے اس کی تفصیل ذکر کرنا ضروری ہے۔

قرآنِ کریم میں چند مقامات پر حلال و حرام جانوروں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے کچھ آیات درجِ ذیل ہیں:

پہلی آیت: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ الآية. ترجمہ: تم پر حرام ہے مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت

اور وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، اور جو گلا گھٹنے سے مرجائے، اور دَب کر مرا ہوا، یعنی بے دھار کی چیز سے مرا ہو، اور جو گر کر مرا ہو، اور جس کو کسی جانور نے سینگ مار کر مارا ہو، اور جس کو درندے نے کچھ کھالیا ہو؛ مگر وہ نہیں جس کو تم ذبح کرلو، اور جو کسی تھان پر ذبح کیا گیا ہو۔ اور تیروں سے تقدیر کا معلوم کرنا یہ گناہ کا کام ہے۔ (المائدہ:۳)

آیت کریمہ کے چند مشکل الفاظ کی وضاحت:

الْمُنْخَنِقَةُ: ایسا جانور جس کا گلا گھونٹ کر ماردیا جائے۔

الْمَوْقُوْذَةُ: وہ جانور جو چوٹ آنے سے مرا ہو، یا کسی دھاردار آلہ لگنے سے مر جائے جیسا کی لاٹھی، پتھر وغیرہ، یا مکان کے نیچے دب کر مرجائے۔

الْمُتَرَدِّيَةُ: اونچی جگہ سے گر کر مرنے والا جانور۔

النَّطِيْحَةُ: کسی دوسرے جانور نے سینگ مار کر جس کو ماردیا ہو۔

مَا اَكَلَ السَّبُعُ: کسی درندے نے دبوچا اور مرگیا، یا دبوچ کر اس میں سے کچھ کاٹ کھایا اور مرگیا۔

اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ: مگر جنہیں تم ذبح کرلو۔ اس کا تعلق مذکورہ پانچوں اقسام سے ہے، یعنی ان پانچ اقسام کے جانوروں میں سے اگر کسی میں روح موجود ہو، اسے ذبح کر لیا جائے، ذبح کرنے سے وہ بے جان ہوا، تو اب اس کا کھانا حلال ہے۔

مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ: وہ جانور جو بتوں کے پاس لا کر بتوں کی عبادت کے طور پر ذبح کیے جائیں۔

اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ: وہ جانور جن کی تقسیم تیروں سے کی گئی ہو۔

یہ طریقہ کفارِ مکہ میں رائج تھا۔ انہوں نے کچھ تیر رکھے ہوئے تھے، جن میں سے

بعض پر حرف "لَا" اور کچھ پر نصف، ثلث غیرہ حصے لکھے ہوئے تھے۔ ان تیروں کو کفار بھی کام کرنے یا نہ کرنے کے لئے استعمال کرتے تھے، مثلاً: کسی کام کو کرنے کا ارادہ کیا اور پھر تیر نکال کر "فال" معلوم کی تو وہ تیر نکل آیا جس پر "لَا" لکھا ہوا تھا، تو اس "لَا" کی وجہ سے وہ کام نہ کرتے۔ اور کبھی جانوروں کے گوشت اور ذبح کے بارے میں ان کی تیروں سے مدد لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ سے منع فرمادیا۔

دوسری آیت: ﴿فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَأْكُلُوْا﴾ الآية.

ترجمہ: کھاؤ اس میں سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا، اگر تم اللہ کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو۔ اور تمہیں کیا ہوا کہ اس میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا۔ اس نے تو مفصل بیان کردیا جو کچھ تم پر حرام ہے، مگر جب تم اس کی طرف مجبور ہو۔

مذکورہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جن حلال جانوروں کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو، انھیں حلال سمجھ کر کھاؤ، اگر تم صاحب ایمان ہو، یعنی ذبح کرنے والے کا مؤمن ہونا شرط ہے۔ یا اہل کتاب ہو، جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے: "وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ" اور اہل کتاب کا طعام تمہارے لئے حلال ہے۔ اس جگہ طعام سے مراد "ذبیحہ" ہے، گویا اہل کتاب کا ذبیحہ ہم مسلمانوں کے لیے اور ہمارا ذبیحہ اُن کے لیے حلال ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ذبیحہ کے حلال و حرام ہونے کا دارومدار ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینے یا غیر کا نام لے کر ذبح کرنے پر ہے۔ اگر اللہ کا نام لے کر ذبح کیا اور وہ جانور ٹھنڈا ہوگیا تو حلال اور اگر از خود مرگیا، تو وہ حرام ہوگا۔ اس لیے ایک اور جگہ اللہ نے بحیرہ، سائبہ اور حام وغیرہ جانوروں کا ذکر کیا ہے اور فرمایا کہ اُن کو اللہ کے

نام پر ذبح کیا جائے تو یہ حلال ہیں، باوجود اس کے کہ یہ جانور ایسے تھے جو بتوں کے نام پر چھوڑے جاتے تھے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا زَيْدُ بْنُ أَسْلَمَ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، أَنَّ رَجُلا كَانَ يَرْعَى لِقْحَةً لَهُ بِأُحُدٍ، فَجَاءَ هَا الْمَوْتُ فَذَكَّاهَا بِشِظَاظٍ، فَسَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ أَكْلِهَا، فَقَالَ: لا بَأْسَ بِهَا كُلُوهَا.

ترجمہ: عطاء بن یسارؒ بیان کرتے ہیں کہ: ایک شخص اُحد میں اپنی اونٹنی کو چرا رہا تھا، اس کی اونٹنی مرنے کے قریب ہوئی تو اس نے نوکدار لکڑی کے ذریعہ اُسے ذبح کر دیا، بعد میں اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا گوشت کھانے کے بارے میں دریافت کیا، تو نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ: اس میں کوئی حرج نہیں ہے، تم اسے کھالو۔

تشریح: "ذَبَائِح" یہ ذَبِیحَةٌ کی جمع ہے۔ عمل ذبح کو کہتے ہیں۔ پھر ذبیحہ دو قسم پر ہے: ایک ذبح اختیاری ہے، دوسرا ذبح اضطراری ہے۔ ذبح اختیاری میں یہ ضروری ہے کہ حلقوم کی اکثر رگیں کٹ جائیں اور بسم اللہ ساتھ ہو۔ ذبح اضطراری میں جانور یا پرندہ کے جس حصہ پر زخم لگ جائے وہ ذبح کے لئے کافی ہے، بشرطیکہ مارتے وقت بسم اللہ اور تکبیر کہی ہو۔

مذکورہ روایت میں جانور کو ذبح کرنے کے آلات میں سے ایک آلہ ذکر فرمایا ہے کہ تیز دھار لکڑی کے ذریعہ اگر جانور کو ذبح کیا جائے تو اس کا کھانا حلال ہے، چنانچہ روایت میں ہے کہ جو اونٹنی مرنے کے قریب تھی اس چرواہے نے نوکدار لکڑی

کے ذریعہ اسے ذبح کر دیا۔ آپ ﷺ نے اسے حلال فرمایا۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، عَنْ رَجُلٍ مِنَ الأَنْصَارِ، أَنَّ مُعَاذَ بْنَ سَعْدٍ، أَوْ سَعْدَ بْنَ مُعَاذٍ أَخْبَرَهُ، أَنَّ جَارِيَةً لِكَعْبِ بْنِ مَالِكٍ كَانَتْ تَرْعَى غَنَمًا لَهُ بِسَلْعٍ فَأُصِيبَتْ مِنْهَا شَاةٌ، فَأَدْرَكَتْهَا، ثُمَّ ذَبَحَتْهَا بِحَجَرٍ، فَسُئِلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذَلِكَ فَقَالَ: لا بَأْسَ بِهَا كُلُوهَا.

ترجمہ: نافعؒ ایک انصاری کے حوالے سے یہ بات نقل کرتے ہیں کہ حضرت معاذ بن سعدؓ (راوی کو شک ہے، شاید یہ الفاظ ہیں) حضرت سعد بن معاذؓ نے انہیں بتایا ہے کہ حضرت کعب بن مالکؓ کی کنیز اُن کی بکریاں ''سلع'' نامی پہاڑ کے قریب چرا رہی تھی، ان میں سے ایک بکری مرنے لگی، تو اس کنیز نے پتھر کے ذریعہ اسے ذبح کرلیا، بعد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں دریافت کیا گیا، تو آپ نے فرمایا کہ: اس میں کوئی حرج نہیں ہے، تم اسے کھالو۔

تشریح: اس روایت میں جانور کو ذبح کرنے کے آلات میں سے دوسرا آلہ ذکر فرمایا ہے کہ، تیز پتھر کے ذریعہ سے جانور کو ذبح کرنا جائز ہے؛ کیونکہ حضرت کعب بن مالکؓ کی باندی نے ایک بکری کو جو کہ مرنے والی تھی پتھر کے ذریعہ سے ذبح کر دیا تھا، **پھر** کعبؓ نے نبی کریم ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا کہ: اس صورت میں اس بکری **کا گوشت کھانا حلال** ہے یا نہیں؟ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس بکری **کے گوشت کو کھانے کا** حکم دیا۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ، كُلُّ شَيْءٍ أَفْرَى الأَوْدَاجَ وَأَنْهَرَ الدَّمَ فَذَبَحْتَ بِهِ فَلا بَأْسَ بِذَلِكَ إِلا السِّنَّ وَالظُّفُرَ وَالْعَظْمَ، فَإِنَّهُ مَكْرُوهٌ أَنْ تَذْبَحَ بِشَيْءٍ مِنْهُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا رَحمَةُ اللّٰهِ عَلَيهِم.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں، ہر وہ چیز جو رگوں کو کاٹ دیتی ہے اور خون کو بہا دیتی ہے، تو اس طرح سے ذبح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ البتہ دانت، ناخن اور ہڈی کے ذریعہ ذبح کرنے کا حکم مختلف ہے؛ کیونکہ ان کے ذریعہ ذبح کرنا حرام ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

ذبح کے سلسلے میں قاعدہ کلیہ

تشریح: اس عبارت میں ذبح کے سلسلے میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جس سے رگیں کٹ جائیں اور خون بہہ جائے تو اس سے ذبح کرنا درست ہے۔

"السن" یعنی دانت تو ہڈی ہے اور ہڈی سے ذبح کرنا درست نہیں ہے، لہٰذا دانت سے ذبح کرنا درست نہیں ہے۔

"الظفر" یعنی ناخن تو اہل حبش کی چھری ہیں، وہ اس کو استعمال کرتے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کو کافروں کا طریقہ نہیں اپنانا چاہیے۔ ہر دھار دار چیز جس سے انہارِ دم آجائے تو ذبح جائز ہے۔ اب دانت اور ناخن اگر جسم کے ساتھ لگے ہوئے ہوں تو بالاتفاق اس سے ذبح کرنا ناجائز ہے، لیکن اگر الگ اُکھڑے ہوئے ہوں، تو اس سے ذبح کرنے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

فقہائے کرام کا اختلاف

جمہور فقہاء کے نزدیک دانت اور ناخن سے ذبح کرنا مطلقاً ناجائز ہے، خواہ جسم سے الگ ہوں یا پیوست ہوں۔ ائمہ احناف کے نزدیک اگر دانت اور ناخن جسم کے ساتھ پیوست ہوں تو اس سے ذبح کرنا ناجائز، لیکن اگر الگ ہوں اور استعمال سے خون بہہ جائے تو اس سے ذبح کرنا کراہت کے ساتھ جائز ہے۔

جمہور کی دلیل: حضرت رافع بن خدیج کی روایت ہے، فرماتے ہیں کہ: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہؐ! ہم کل دشمن کے مقابلے میں جانے والے ہیں، ہمارے پاس چاقو نہیں ہے، تو کیا ہم بانس کی کھپچ یا کسی دوسری چیز سے ذبح کر سکتے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (جواب میں) فرمایا کہ: جلدی سے کوئی ایسی چیز لے کر جس سے خون بہہ جائے، خدا کا نام لے کر ذبح کردو اور اس کا گوشت کھاؤ (وہ حلال ہے)۔ البتہ جس چیز سے ذبح کرتے ہو وہ دانت اور ناخن نہ ہو۔ اس کی وجہ بھی بتا دیتا ہوں، دانت سے ذبح کرنا اس لئے جائز نہیں کہ وہ ہڈی ہے۔ اور ناخن سے اس لیے کہ وہ حبشیوں کا چاقو ہے۔ معلوم ہوا کہ حبشیوں کی مشابہت سے بچنے کے لیے فقہاء نے دانت اور ناخن سے ذبح کرنے کو منع کیا ہے۔ (مشکوٰۃ)

دلیل کا جواب: احناف مذکورہ روایت کو غیر مقلوع دانت اور غیر مقلوع ناخن پر حمل کرتے ہیں، کیونکہ حبشہ کے لوگ جانور کو اسی طرح ذبح کرتے تھے۔

یا یہ جواب ہے کہ زیر بحث حدیث کی ممانعت کراہت کے درجے میں ہے، وہ احناف کے ہاں بھی مکروہ ہے، لیکن ذبیحہ حلال ہے۔

احناف کی دلیل: احناف نے حضرت عدی بن حاتمؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے، جس میں یہ الفاظ آئے ہیں: امرر الدمَ بِمَ شِئتَ. یعنی جس چیز سے چاہو خون بہادو۔ یہ حدیث عام ہے دانتوں اور ناخنوں کو بھی شامل ہے۔ اصل مقصود خون بہانا ہے۔ اگر مقلوع دانت اور ناخن سے دباؤ نہیں پڑتا اور خون بہہ جاتا ہے، تو ذبیحہ حلال ہونا چاہئے؛ البتہ فعل میں کراہت ہے، کیونکہ دانت اور تیز ہڈی ایک چیز ہے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ، أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: مَا ذُبِحَ بِهِ إِذَا بَضَعَ فَلا بَأْسَ بِهِ إِذَا اضْطُرِرْتَ إِلَيْهِ.

ترجمہ: سعید بن میبّبؒ فرماتے ہیں کہ: جس چیز کے ذریعے ذبح کرتے وقت (رگوں کو) کاٹ دیا جائے، تو ضرورت کے وقت اس سے ذبح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

تشریح: اس روایت میں حضرت سعید بن میبّبؒ کا عمل وارشاد ذکر کیا ہے کہ بوقت ضرورت ہر اس چیز سے ذبح کرنا جائز ہے جو رگیں کاٹ سکتی ہو۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، لا بَأْسَ بِذٰلِكَ كُلِّهِ عَلَى مَا فَسَّرْتُ لَكَ، وَإِنْ ذُبِحَ بِسِنٍّ أَوْ ظُفْرٍ مَنْزُوعَيْنِ فَأَفْرَى الأَوْدَاجَ وَ أَنْهَرَ الدَّمَ أُكِلَ أَيْضًا، وَذٰلِكَ مَكْرُوهٌ، فَإِنْ كَانَا مَنْزُوعَيْنِ فَإِنَّمَا قَتَلَهَا قَتْلًا فَهِيَ مَيْتَةٌ لا تُؤْكَلُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالَى.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں: ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ ان تمام صورتوں میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ ہم نے آپ کے سامنے واضح کردیا ہے، لیکن اگر دانت یا ناخن کے ذریعہ ذبح کیا جاتا ہے اور یہ چیز اس

کی رگوں کو کاٹ دیتی ہے اور خون کو بہادیتی ہے، تو ایسے جانور کا گوشت کھالیا
جائے گا؛ تاہم یہ کھانا مکروہ ہے۔ لیکن اگر وہ دانت (جانور کے) جسم سے الگ
نہ ہو تو وہ اگر اس جانور کو ماردیتا ہے تو وہ جانور مردار شمار ہوگا، ایسا گوشت نہیں
کھایا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ بھی اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: یہاں سے امام محمدؒ اس مسئلہ کی وضاحت فرمارہے ہیں کہ سابق
میں ہم نے جو ناخن اور دانت سے ذبح کرنے کو کراہت کے ساتھ جائز قرار دیا ہے،
تو وہ ان ناخن اور دانت کے سلسلے میں ہے جو اُکھڑے ہوئے ہوں، لیکن اگر یہ ناخن
اور دانت اُکھڑے ہوئے نہ ہوں، پھر اُن سے ذبح کرے، تو پھر مذبوحہ جانور مردار
ہوگا، اس کے کھانے کی اجازت نہیں ہوگی، اسلئے کہ یہ خنق (گلا گھونٹنا) اور عض
(دانت سے کاٹنا) ہوگا، نہ کہ ذبح۔ یہی امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔

(ب:۵۴) بَابُ الصَّيْدِ وَمَا يُكْرَهُ أَكْلُهُ مِنَ السِّبَاعِ وَغَيْرِهَا

شکار اور جنگلی جانور میں سے کون سے جانور مکروہ ہیں؟

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا ابْنُ شِهَابٍ، عَنْ أَبِي إِدْرِيسَ الْخَوْلَانِيِّ، عَنْ أَبِي ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ أَكْلِ كُلِّ ذِي نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ.

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ أَبِي حَكِيمٍ، عَنْ عَبِيدَةَ بْنِ سُفْيَانَ الْحَضْرَمِيِّ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: أَكْلُ كُلِّ ذِي نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ حَرَامٌ.

ترجمه: حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ بیان کرتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نوکیلے دانتوں والے درندوں (کا گوشت کھانے) سے منع کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں یہ بات نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ہر نوکیلے دانت والا درندہ حرام ہے۔

کن جانوروں کا کھانا مکروہ اور حرام ہے؟

تشریح: جانوروں کی حلت وحرمت کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے اور اس میں اجتہاد کی راہ بہت کشادہ ہے، کیونکہ قرآنِ کریم میں محدود جانوروں کی حرمت مذکور ہوئی اور آپ کی احادیث میں ان کی حلت وحرمت کے کچھ قواعد مذکور ہوئے، جن کی مدد سے ائمہ مجتہدین نے از روئے قیاس جانوروں کی حلت وحرمت میں مختلف اقوال فرمائے۔

حضور ﷺ نے جن قواعد کا ذکر فرمایا وہ یہ ہیں:

(۱) حرام وہ ہے جسے اللہ نے حرام قرار دیا۔ حلال وہ ہے جسے اللہ نے حلال کیا۔ اور جن کی حلت وحرمت بیان نہ فرمائی وہ مباح کے درجے میں ہیں۔

(۲) ہر ذی ناب درندہ حرام ہے، یعنی جو درندے کچلی والے دانت رکھتے ہیں جس سے وہ دوسرے جانور کا شکار کر کے کھاتے ہیں، جیسے شیر چیتا بھیڑیا وغیرہ، یہ سب جانور حرام ہیں۔

(۳) امام محمدؒ نے ایک اور قسم کا ذکر فرمایا ہے، یعنی وہ پرندے جو پنجوں سے شکار کرنے والے ہیں، یعنی دوسرے چھوٹے پرندوں کا شکار کرتے ہیں، جیسے شکرہ، باز، چیل وغیرہ، اس کا کھانا بھی حرام ہے۔ یہ قول اگرچہ امام محمدؒ نے کسی اثر میں نقل نہیں کیا ہے؛ بلکہ خود اس کا ذکر فرمایا، لیکن اس کا ذکر بہت سی احادیث میں ہے، لہٰذا

یہ بھی ایک ضابطہ حضور ﷺ کا ارشاد فرمودہ ہے: نَهٰی رسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ علیه وسلَّم کُلَّ ذِي مِخلَبٍ مِن الطَّیرِ.

"ذِي ناب" اس درندے کو کہتے ہیں جس کی کچلیاں ہوں، یعنی رباعی دانتوں کے پاس دائیں بائیں لمبے لمبے نوکدار دانت ہوں، اور اس کے ساتھ دوسرے جانوروں کا شکار کر کے پھاڑتے ہوں، جیسے شیر، چیتا، بھیڑیا، ریچھ، بندر، خنزیر، لومڑی اور بجو وغیرہ۔

"مِن السِّباع" اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے ذریعہ چیر پھاڑ کا کام کرتا ہو اور دیگر جانوروں کو پھاڑتا ہو۔ "مِن السِّباع" کا یہ لفظ جس طرح درندوں کے ساتھ لگتا ہے، اسی طرح ذی مخلب پرندوں کے ساتھ بھی لگتا ہے۔

"مِن السِّباع" (درندہ) کی قید اس لئے لگائی کہ اونٹ نکل جائے، اس لیے کہ اگرچہ اس میں ناب ہوتا ہے، لیکن وہ درندوں میں سے نہیں ہے، اس لیے اس کا گوشت حلال ہے۔ صاحب ہدایہ نے فرمایا کہ سبع سے وہ جانور اور پرندے مراد ہے جن میں پانچ اوصافِ ذمیمہ موجود ہوں:

(۱) حملہ کرنا (۲) قتل کرنا (۳) اُچک لینا (۴) غارت کرنا (۵) زخمی کرنا۔

درندوں کو حرام کرنے کی حکمت یہ ہے کہ انسان میں یہ اوصافِ ذمیمہ پیدا نہ ہوں کیونکہ اخلاق میں غذا کا اثر بہت قوی ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، يُكْرَهُ أَكْلُ كُلِّ ذِی نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ، وَكُلِّ ذِی مِخْلَبٍ مِنَ الطَّيْرِ، وَيُكْرَهُ مِنَ الطَّيْرِ أَيْضًا مَا يَأْكُلُ الْجِيَفَ مِمَّا لَهُ مِخْلَبٌ، أَوْ لَيْسَ لَهُ مِخْلَبٌ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِی حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا، وَإِبْرَاهِيمَ النَّخَعِيِّ.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں: ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ ہر نوکیلے دانت والا درندہ اور ہر نوکیلے پنجے والا پرندہ کھانا مکروہ ہے۔ اور ہر پنجے والا ایسا پرندہ کھانا بھی مکروہ ہے، جو مردار کھاتا ہو، خواہ ان کے ناخن والے پنجے ہوں، یا ناخن والے پنجے نہ ہوں۔ امام ابو حنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔ ابراہیم نخعیؒ بھی اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: حضرت امام محمدؒ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ ہر نوکیلے دانت والے اور پنجوں سے شکار کرنے والے پرندے کا کھانا حرام ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: "كُلُّ ذِي نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ، وَكُلُّ ذِي مِخلَبٍ مِنَ الطَّيرِ". اسی طرح اس پرندے کا کھانا بھی حرام ہے جو مردار کھاتا ہو، چاہے وہ ذی مخلب ہو یا نہ ہو، اس لئے کہ یہ اللہ کے فرمان "وَيُحَرِّمُ الْخَبَائِثَ" (خبیث چیزیں حرام کر دی گئی) کے عموم میں داخل ہے۔ یہی امام ابو حنیفہؒ اور اکثر فقہاء کا قول ہے۔

(ب:۵۵) بَابُ أَكْلِ الضَّبِّ

گوہ کھانے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا ابْنُ شِهَابٍ، عَنْ أَبِي أُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيدِ بْنِ الْمُغِيرَةِ، أَنَّهُ دَخَلَ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْتَ مَيْمُونَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأُتِيَ بِضَبٍّ مَحْنُوذٍ فَأَهْوَى إِلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَهُ، فَقَالَ بَعْضُ النِّسْوَةِ اللاتِي كُنَّ فِي بَيْتِ مَيْمُونَةَ: أَخبِرُوا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا

يُرِيدُ أَنْ يَأْكُلَ مِنْهُ، فَقُلْنَ: هُوَ ضَبٌّ، فَرَفَعَ يَدَهُ، فَقُلْتُ: أَحَرَامٌ هُوَ؟ قَالَ: لا، وَلَكِنَّهُ لَمْ يَكُنْ بِأَرْضِ قَوْمِي، فَأَجِدُنِي أَعَافُهُ، قَالَ: فَاجْتَرَرْتُهُ فَأَكَلْتُ وَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْظُرُ.

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت خالد بن ولیدؓ کا یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ: ایک مرتبہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نبی اکرم کی زوجہ محترمہ سیدہ میمونہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو وہاں بھنی ہوئی گوہ پیش کی گئی۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا، تو گھر میں موجود خواتین میں سے کسی خاتون نے کہا: نبی اکرمؐ کو یہ بتادو کہ آپ کیا کھانے لگے ہیں، تو خواتین نے بتایا: یہ گوہ ہے۔ تو نبی اکرمؐ نے اپنا دست مبارک کھینچ لیا۔ حضرت خالدؓ کہتے ہیں، میں نے عرض کی: کیا یہ حرام ہے؟ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! یہ میرے علاقے کی خوراک نہیں ہے، اسی لیے میں اسے نہیں کھانا چاہوں گا۔ راوی کہتے ہیں: میں نے اسے اپنی طرف کرلیا اور کھانا شروع کردیا۔ اور آپ حالانکہ مجھے کھاتا دیکھ رہے تھے۔

تشریح: اس باب کے اندر آپ نے ایک حرام درندے کا ذکر کیا ہے جس کا نام ''گوہ'' ہے۔ اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ گوہ کا گوشت فی نفسہٖ حلال ہے، لیکن آپؐ اس کو کھاتے نہیں تھے؛ کیونکہ ہر حلال چیز کا کھانا ضروری نہیں ہے۔ آپ کو گوہ کھانے سے گھن آتی تھی، چنانچہ آپؐ نے اس کی وضاحت بھی کردی کہ گوہ میرا کھانا نہیں ہے، مجھے اس سے گھن آتی ہے، لہٰذا جس کو گھن لگے اس کے لئے نہ کھانا ہی بہتر ہے۔

قَالَ لَا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ گوہ

حرام نہیں ہے؛ بلکہ اس کا کھانا جائز ہے، اس لیے آپ ﷺ نے حضرت خالد کو کھانا کھاتے دیکھ کر منع بھی نہیں کیا۔

أَعَافُـهُ: مجھے طبعی طور پر گوہ سے گھن آتی ہے، لہٰذا میں اس کو نہیں کھاتا ہوں۔ احناف کہتے ہیں کہ اُمت کے لئے بھی یہی مناسب ہے کہ وہ نہ کھائے، لہٰذا گوہ کے حوالے سے احناف کا نظریہ جواز مع الکراہت کا ہے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ دِينَارٍ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، أَنَّهُ قَالَ: نَادَى رَجُلٌ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، كَيْفَ تَرَى فِي أَكْلِ الضَّبِّ؟ قَالَ: لَسْتُ بِآكِلِهِ، وَلَا مُحَرِّمِهِ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عامرؓ بیان کرتے ہیں کہ: ایک شخص نے بلند آواز میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارا۔ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! گوہ کھانے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اسے کھاتا نہیں ہوں، لیکن میں حرام بھی قرار نہیں دیتا۔

تشریح: "الضَبُّ" اس کو گوہ بھی کہتے ہیں۔ اور سانڈ بھی کہتے ہیں۔ اور گور پھوڑ بھی کہتے ہیں۔ یہ عجیب حیوان ہے۔ شارحین نے لکھا ہے کہ گوہ کے دو ذکر ہوتے ہیں اور سات سو سال تک اس کی عمر ہو سکتی ہے۔ پانی کے قریب نہیں جاتی ہے، صرف شبنم سے گذارا کرتی ہے۔ اور چالیس دن کے بعد ایک قطرہ پیشاب کرتی ہے۔ اور کبھی بھی اس کے دانت نہیں گرتے ہیں۔

اس دوسری روایت میں صاف صاف مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ گوہ کو حلال قرار دیا ہے اور نہ حرام قرار دیا ہے، اس لیے کہ اس وقت تک آپ کے

پاس اس سلسلہ میں وحی نہیں آئی تھی؛ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طبعی ناپسندیدگی کی وجہ سے کراہت کا اظہار کر دیا ہے؛ کیونکہ آپ کا نہ کھانا ناپسندیدگی کی دلیل ہے۔ لہٰذا مذکورہ دونوں روایتیں گوہ کے حلال ہونے اور قابل خوردنی ہونے کی گواہی دیتی ہیں۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: قَدْ جَاءَ فِي أَكْلِهِ اخْتِلَافٌ، فَأَمَّا نَحْنُ، فَلا نَرَى أَنْ يُؤْكَلَ.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کو کھانے کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے؛ تاہم ہم اسے کھانے کو پسند نہیں کرتے۔

گوہ کا گوشت اور اختلافِ ائمہ

جمہور کا مذہب: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک گوہ کا گوشت مباح ہے۔
امام ابوحنیفہ کا مذہب: امام صاحب اور صاحبین کے نزدیک مکروہِ تحریمی ہے۔
جمہور کی دلیل: جمہور کی دلیل باب کی شروع کی دو روایات ہیں جس میں یہ مذکور ہے کہ آپ نے اس کو حرام نہیں کیا، جو کہ اباحت کی دلیل ہے۔
دوسری دلیل: آپؐ کے دسترخوان پر صحابہؓ نے کھایا؛ لیکن آپ نے منع نہیں فرمایا، چنانچہ بخاری میں ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے عرض کیا: "أَ حَرَامٌ هُوَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟" اے اللہ کے رسولؐ! کیا گوہ حرام ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: حرام تو نہیں ہے؛ مگر میری قوم کی سرزمین میں نہیں ہوتی ہے، اس لئے مجھ کو نفرت سی معلوم ہوتی ہے۔ یہ سن کر حضرت خالدؓ کہتے ہیں کہ: میں نے اس کو اپنی طرف اٹھالیا اور آپ کے سامنے کھاتا رہا۔ (بخاری شریف، ج:۱،ص:۸۳۱)

جواب: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منع نہ کرنا اس وقت تھا جب کہ آپؐ کے پاس اس سلسلے میں وحی نہیں آئی تھی۔

دوسرا جواب: حضور ﷺ نے اگر چہ اس کو واضح طور پر حرام قرار نہیں دیا، لیکن آپ نے خود اس کو استعمال نہیں کیا اور طبعی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور یہ چیز کراہت کے لیے کافی ہے، لہٰذا احادیث نہی کو کراہت پر محمول کیا جائے۔ اور یہی حنفیہ کا مذہب بھی ہے۔

حنفیہ کی دلیل: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک گوہ بطور ہدیہ دی گئی، تو آپؐ نے اسے نہ کھایا۔ پھر ایک سائل آیا اور عائشہؓ نے وہ گوہ اسے دینی چاہی، تو انہیں حضور ﷺ نے فرمایا: " أتعطینه مَا لَا تأكُلين؟". کیا وہ چیز سائل کو دینا چاہتی ہو جو خود نہیں کھاتی؟ امام محمدؒ کہتے ہیں کہ یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حضور ﷺ نے نہ تو خود گوہ کھانا اپنے لیے پسند فرمایا اور نہ ہی دوسرے کے لئے۔ مزید فرمایا کہ ہمارا یہی مسلک ہے۔ معلوم ہوا کہ گوہ کھانا مکروہِ تحریمی ہے۔ (طحاوی شریف، ج:۴، ص:۲۸۱)

دوسری دلیل: ابوداؤد کی روایت ہے: "نَهٰى عَن أكلِ لَحمِ الضَّبِّ". کہ آپؐ نے گوہ کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔ (ابوداؤد، ج:۲، ص:۱۷۶)

أَخْبَرَنَا أَبُو حَنِيفَةَ، عَنْ حَمَّادٍ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ النَّخَعِيِّ، عَنْ عَائِشَةَ، أَنَّهُ أُهْدِيَ لَهَا ضَبٌّ، فَأَتَاهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَسَأَلَتْهُ عَنْ أَكْلِهِ فَنَهَاهَا عَنْهُ، فَجَاءَ تْ سَائِلَةٌ فَأَرَادَتْ أَنْ تُطْعِمَهَا إِيَّاهُ، فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: أَتُطْعِمِينَهَا مِمَّا لا تَأْكُلِينَ؟.

أَخْبَرَنَا عَبْدُ الْجَبَّارِ بْنُ عَبَّاسٍ الْهَمْدَانِيِّ، عَنْ عَزِيزِ بْنِ مَرْثَدٍ، عَنِ الْحَارِثِ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ كَرَّمَ اللَّهُ وَجْهَهُ، أَنَّهُ نَهَى عَنْ أَكْلِ الضَّبِّ وَالضَّبُعِ،

قَالَ مُحَمَّدٌ: فَتَرْكُهُ أَحَبُّ إِلَيْنَا، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ.

ترجمہ: سیدہ عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ انہیں تحفے کے طور پر گوہ پیش کی گئی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے یہاں تشریف لائے، تو انہوں نے آپؐ سے اس کو کھانے کے بارے میں دریافت کیا؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں گوہ کھانے سے منع کر دیا۔ پھر اسی دوران کوئی عورت آئی جس نے کھانے کے لیے کچھ مانگا، تو سیدہ عائشہؓ نے یہ ارادہ کیا کہ اسے وہ کھانے کے لیے دے دیں، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: کیا تم اسے وہ چیز کھلانا چاہتی ہو جو تم خود نہیں کھاتی ہو؟

حضرت علی بن ابو طالبؓ نے گوہ اور بِجُّو کھانے سے منع فرمایا ہے۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں ہمارے نزدیک اسے نہ کھانا زیادہ پسندیدہ ہے۔ امام ابو حنیفہؒ بھی اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: اوپر ذکر کردہ دونوں روایات احناف کا مستدل ہیں، جیسا کہ ماقبل میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ کو اس کے کھانے سے منع فرمایا۔ اور آخری روایت میں حضرت علی المرتضیٰؓ نے اس کے کھانے سے منع فرمایا ہے، لہٰذا یہ دونوں روایتیں اس سے بچنے اور اس کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اور حضرت علیؓ کے اثر میں گوہ کے ساتھ بِجُّو کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اور امام محمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

(ب:۵۶) بَابُ مَا لَفَظَهُ الْبَحْرُ مِنَ السَّمَكِ الطَّافِي وَغَيْرِهِ

مری ہوئی بیمار مچھلی وغیرہ کہ جس کو دریا کا پانی باہر پھینک دے، کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، حَدَّثَنَا نَافِعٌ، أَنَّ ابْنَ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي هُرَيْرَةَ، سَأَلَ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ عَمَّا لَفَظَهُ الْبَحْرُ؟ فَنَهَاهُ عَنْهُ، ثُمَّ انْقَلَبَ فَدَعَا بِمُصْحَفٍ فَقَرَأَ: (أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ)، قَالَ نَافِعٌ: فَأَرْسَلَنِي إِلَيْهِ أَنْ لَيْسَ بِهِ بَأْسٌ فَكُلْهُ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ کے صاحبزادے عبدالرحمٰنؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے اس جانور کے بارے میں دریافت کیا جسے سمندر باہر پھینک دیتا ہے؟ تو انہوں نے اسے کھانے سے منع کر دیا۔ پھر وہ مڑے اور انہوں نے قرآن منگوایا اور یہ آیت تلاوت کی: ''تمہارے لیے سمندر کے شکار کو اور اس کی خوراک کو حلال قرار دیا گیا ہے''۔ نافع کہتے ہیں: پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مجھے عبدالرحمٰن کی طرف بھیجا اور پیغام دیا کہ اسے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے، تم اسے کھالو۔

تشریح: مذکورہ روایت سے امام محمدؒ نے چند مسائل بیان فرمائے، وہ یہ کہ دریا سے مچھلی حاصل ہونے کی صورت میں دیکھا جائے گا کہ یہ مچھلی کس طرح دستیاب ہوئی؟ اگر کسی نے اسے پکڑنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہو کر ہاتھ آ گئی، تو بہر صورت اس کا کھانا حلال ہے؛ خواہ وہ جال لگا کر پکڑے یا کسی

دوائی کے ذریعہ انہیں مار کر باہر نکالا۔ اور اگر پکڑنے کی کوشش کے بغیر دریا نے باہر پھینک دیا اور خشکی پر آ کر مرگئی، یا پانی خشک ہوگیا اور دریا میں ریت پر پڑی مرگئی، یا سردی یا گرمی کی وجہ سے مر کر پانی میں تیرنے لگی، ان تمام صورتوں میں اس کا کھانا جائز ہے۔ ہاں! اگر کسی بیماری کی وجہ سے پانی میں مر کر تیرنے لگی تو اس کا کھانا مکروہِ تحریمی ہے۔

معلوم ہوا کہ مچھلی کے حرام ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے، وہ یہ ہے کہ جب اپنی موت مر کر پانی پر تیر جائے، اس کے سوا مچھلی کی تمام صورتیں جائز اور حلال ہیں۔

اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سمندر کی ''سمک طافی'' حلال ہے یا نہیں؟ تو اس مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے، جس کی تفصیل آگے ذکر کی جائے گی۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِقَوْلِ ابْنِ عُمَرَ الآخِرِ نَأْخُذُ، لا بَأْسَ بِمَا لَفَظَهُ الْبَحْرُ وَبِمَا حَسَرَ عَنْهُ الْمَاءُ إِنَّمَا يُكْرَهُ مِنْ ذَلِكَ الطَّافِي، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا رَحِمَهُمُ اللَّهُ.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں: حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آخری قول کے مطابق ہم فتویٰ دیتے ہیں۔ سمندر جس چیز کو باہر پھینک دیتا ہے یا پانی جس چیز سے ہٹ جاتا ہے اسے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مکروہ صرف وہ مچھلی کھانا ہے جو مرنے کے بعد سمندر کے اوپر تیرنے لگتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

سمک طافی اور اختلافِ ائمہ

<u>ائمہ ثلاثہ کا مذہب:</u> ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یہ مچھلی حلال ہے، اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

<u>امام ابوحنیفہؒ کا مذہب:</u> امام صاحبؒ کے نزدیک سمک طافی حلال نہیں ہے۔

<u>ائمہ ثلاثہ کی دلیل:</u> آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "الحِلُّ مَیتتُہ" سمندر کا مردار حلال ہے۔

<u>دوسری دلیل:</u> "حدیث عنبر" یہ مچھلی صحابۂ کرام کو مری ہوئی ملی تھی، اس کے باوجود انہوں نے اس کو کافی عرصہ تک کھایا تھا۔ (بخاری، ج:٢، ص:٦٢٦)

جواب: یہ ہے کہ "الحِلُّ مَیتتُہ" میں "الحل" سے مراد حلال نہیں ہے؛ بلکہ طاہر ہونا مراد ہے، یا پھر سمک طافی جابرؓ کی روایت کی وجہ سے اس عام ضابطہ سے مستثنیٰ ہے۔

<u>دوسری دلیل کا جواب:</u> یہ ہے کہ اس مچھلی کے طافی ہونے کی صراحت کہیں نہیں ہے، مردہ ہونے کی صراحت ہے اور مرنا اگر کسی خارجی سبب سے ہو تو اس کے حلال ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اکثر کے نزدیک یہ حدیث حضرت جابرؓ پر موقوف ہے، اگر حدیث موقوف ہو تب بھی حنفیہ کے مسلک پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اس لیے کہ غیر مدرک بالقیاس مسئلہ میں حدیث موقوف حدیث مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے۔ (درسِ ترمذی)

<u>حنفیہ کی دلیل:</u> حضرت جابرؓ کی روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَن مَاتَ فِیہِ وَ طَفَا فَلَا تَأکُلُوہُ" کہ جو سمندر میں طبعی موت مر کر اوپر آجائے اس کو مت کھاؤ۔

(ب:٥٧) بَابُ السَّمَكِ يَمُوتُ فِي الْمَاءِ
پانی میں مری ہوئی مچھلی کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا زَيْدُ بْنُ أَسْلَمَ، عَنْ سَعِيدِ بنِ الْجَارِيِّ، قَالَ: سَأَلْتُ ابْنَ عُمَرَ عَنِ الْحِيتَانِ يَقْتُلُ بَعْضُهَا بَعْضًا، وَيَمُوتُ صَرَدًا وَفِي أَصْلِ ابْنِ الصَّوَّافِ: وَيَمُوتُ بَرْدًا، قَالَ: لَيْسَ بِهِ بَأْسٌ، قَالَ: وَكَانَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ يَقُولُ مِثْلَ ذَلِكَ.

ترجمه: سعید بن جاری بیان کرتے ہیں کہ: میں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے دوطرح کی مچھلیوں کے بارے میں دریافت کیا، جن میں سے ایک دوسرے کو قتل کر دیتی ہے، یا وہ مچھلی جو سردی کی وجہ سے مر جاتی ہے (ایک روایت میں الفاظ کچھ مختلف ہیں) تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

تشریح: جو مچھلی پانی میں مر جاتی ہے اس کے اسباب مختلف ہوتے ہیں، ان میں سے جو مچھلی طبعی موت مرتی ہے اسے ''طافی'' کہا جاتا ہے۔ طافی مچھلی کو کھانا جائز نہیں ہے، اس کے علاوہ کسی اور وجہ سے مرنے والی مردہ مچھلی کو کھانا حلال ہے، جیسا کی فقہاء نے یہ بات بیان کی ہے کہ: اگر کوئی شخص دریا یا سمندر کے کنارے تالاب بنا لیتا ہے اور پھر کچھ مچھلیاں اس تالاب میں داخل ہو کر مر جاتی ہیں، تو اب اسے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ، إِذَا مَاتَتِ الْحِيتَانُ مِنْ حَرٍّ أَوْ بَرْدٍ أَوْ قَتْلِ بَعْضِهَا بَعْضًا، فَلا بَأْسَ بِأَكْلِهَا، فَأَمَّا إِذَا مَاتَتْ مِيتَةَ نَفْسِهَا فَطَفَتْ

فَهٰذَا يُكْرَهُ مِنَ السَّمَكِ، فَأَمَّا سِوَى ذٰلِكَ، فَلَا بَأْسَ بِهِ.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اس روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں، جب کوئی مچھلی گرمی یا سردی کی وجہ سے مرجائے، یا کوئی ایک مچھلی دوسری کو ماردے، تو اسے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن جو مچھلی خود ہی مرکر پانی پر تیرنے لگے، تو اسے کھانا مکروہ ہے۔ اس کے علاوہ مچھلی کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ نے مچھلی کے پانی میں مرنے کے مختلف اسباب ذکر فرمائے ہیں، مچھلی پانی میں مرگئی، لیکن وہ خود بخود طبعی موت نہ مری ہو؛ بلکہ پانی کی حرارت یا ٹھنڈک کی وجہ سے مری، اسے کھانا حلال ہے؛ خواہ اس طریقہ سے مرکر وہ پانی کے اوپر تیرتی ہو، یا پانی نے اسے باہر خشکی پر پھینک دیا ہو، یا پانی ہٹ گیا ہو اور دریا میں ریت پر پڑی ہو۔ صرف اپنی موت مرنے والی جسے ''طافی'' کہتے ہیں، اس کا کھانا جائز نہیں ہے، اس کے علاوہ ہر مری ہوئی مچھلی حلال ہے اور اس کا کھانا جائز ہے۔

سمندری جانور اور اختلافِ ائمہ

اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سمندر کے کون سے جانور حلال ہیں؟ اور کون سے حرام ہیں؟ تو اس مسئلہ میں ائمہ کا قدرے اختلاف ہے جن کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

امام مالکؒ کا مذہب: خنزیر کے علاوہ سمندر کے سب جانور حلال ہیں۔

امام شافعیؒ کا مذہب: سوائے ضفدع (مینڈک) کے تمام بحری جانور حلال

ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کا مذہب: سمندر کے جانوروں میں صرف مچھلی حلال ہے اور باقی سارے جانور حرام ہیں اور مچھلی بھی ''غیر طافی'' ہونی چاہیے۔

(ابن ماجہ، ص: ۲۳۴)

امام مالکؒ کی دلیل: خنزیر کے حرام ہونے پر آیت کریمہ : ''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ'' کو پیش کرتے ہیں۔ اور باقی جانوروں کی حلت پر آیت کریمہ : ''اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ'' کو دلیل میں پیش کرتے ہیں، کہ تمہارے لیے سمندر کے جانور حلال کر دیے گئے ہیں۔ اور ''صَید'' یہاں مطلق ہے، جس میں سے کسی کا استثناء نہیں کیا گیا ہے، اس لئے علاوہ خنزیر کے سمندر کے سارے جانور حلال ہوں گے۔

جواب یہ ہے کہ ''صید'' کے معنی جانور کے نہیں ہیں؛ بلکہ صید مصدری معنی میں ہے، یعنی شکار کرنا۔ اور مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے سمندر میں شکار کرنا جائز ہے۔ رہا مسئلہ جانوروں کا، کہ کن کا شکار کرنا جائز ہے؟ اور کن کا نہیں؟ تو آیت میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ صرف اتنا بتلایا گیا ہے کہ شکار کرنا جائز ہے، اس لیے اس آیت کریمہ سے سمندری جانوروں کی حلت ثابت کرنا درست نہیں ہے۔

امام شافعیؒ کی دلیل: ضفدع کی حرمت اس حدیث سے مستنبط کی ہے جس میں ضفدع کے مارنے پر نہی وارد ہوئی ہے اور بقیہ جانوروں کی حلت پر ایک دلیل تو وہی دیتے ہیں جو مع جواب کے اوپر گذری۔

دوسری دلیل: حدیث شریف ''الحِلُّ مَيتتُهٗ'' پیش کرتے ہیں، کہ دیکھو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سمندر کے مردار جانوروں کو حلال فرمایا ہے۔

جواب: حضرت شیخ الہندؒ نے "الحِلُّ مَیْتَتُہٗ" کا نہایت آسان جواب مرحمت فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ الحِلُّ سے مراد حلال نہیں ہے، جس سے آپ میتہ کی حلت ثابت کر رہے ہیں؛ بلکہ یہاں الحِلُّ: الطَّاھِرُ کے معنی میں ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ سمندر کا میتہ پاک ہوتا ہے، لہٰذا آپ اس سے حلت ثابت نہیں کر سکتے۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل: آیت کریمہ "حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃُ". اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر میتہ حرام ہے، سوائے اس میتہ کے جس کی تخصیص دلیل شرعی سے ثابت ہوگئی ہو، اور وہ سمندری جانوروں میں صرف مچھلی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے: "اُحِلَّتْ لَنَا المَیتَتَان: السَّمَکُ والجَرَادُ".

(المختار، ج:۹، ص:۴۴۶)

دوسری دلیل: "وَ یُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبَائِثَ" ہے، یعنی اُن پر خبیث چیزیں حرام کر دی گئی ہیں اور مچھلی کے علاوہ سمندر کے سارے جانور خبیث ہیں، اس لیے کہ "خبیث" کہتے ہیں جس سے طبیعت انسانی گھن کرتی ہو۔اور مچھلی کے علاوہ سمندر کے باقی جانوروں سے طبیعت گھن محسوس کرتی ہے، اس لئے سب خبائث میں داخل ہیں۔

......☆☆☆......

(ب:۵۸) بَابُ زَكٰوةِ الجَنِينِ زَكٰوةُ أُمِّهٖ

ماں کے ذبح ہونے سے اسکے پیٹ کا بچہ بھی ذبح کیا تصور ہوگا، کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ، كَانَ يَقُولُ: إِذَا نُحِرَتِ النَّاقَةُ فَذَكَاةُ مَا فِي بَطْنِهَا ذَكَاتُهَا إِذَا كَانَ قَدْ تَمَّ خَلْقُهُ، وَنَبَتَ شَعْرُهُ فَإِذَا خَرَجَ مِنْ بَطْنِهَا ذُبِحَ حَتَّى يَخْرُجَ الدَّمُ مِنْ جَوْفِهِ.
أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا يَزِيدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ قُسَيْطٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: ذَكَاةُ مَا كَانَ فِي بَطْنِ الذَّبِيحَةِ ذَكَاةُ أُمِّهِ إِذَا كَانَ قَدْ نَبَتَ شَعْرُهُ، وَتَمَّ خَلْقُهُ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جب اونٹنی کو ذبح کر دیا جائے، تو اس کے پیٹ میں موجود بچہ بھی ذبح شمار ہوگا، جب کہ اس کی تخلیق مکمل ہو چکی ہو اور بال اُگ چکے ہوں۔ لیکن اگر وہ اس کے پیٹ سے زندہ نکل آتا ہے، تو پھر اس کو الگ سے ذبح کیا جائے گا، یہاں تک کہ اس کے پیٹ میں سے خون نکل آئے۔

سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں کہ ذبیحہ کے پیٹ میں جو چیز موجود ہوتی ہے اس کی ماں کو ذبح کرنا ہی اس کا ذبح کرنا شمار ہوگا، اس وقت جب کہ پیٹ میں موجود بچے کے بال اُگ چکے ہوں اور اس کی تخلیق مکمل ہو چکی ہو۔

مذبوحہ جانور کے پیٹ میں سے بچہ نکلے تو اس کا کیا حکم ہے؟

تشریح: اس باب کے تحت امام محمدؒ نے دو روایات ذکر فرمائی ہیں، جن

کا خلاصہ یہ ہے کہ: کسی مادہ کو ذبح کرنے کے بعد اُس کے پیٹ میں موجود بچہ طبعًا ذبح ہو گیا، لہٰذا اسے کھانا جائز ہے۔ پہلی روایت میں اتنی بات زائد مذکور ہے کہ: اگر وہ اپنی ماں کے ذبح ہو جانے کے بعد اس کے پیٹ سے زندہ نکلا تو اب اُسے بھی ذبح کیا جائے گا۔

مسئلہ مذکورہ کی حقیقت

کسی مادہ کو جب ذبح کیا جائے، تو اس کے پیٹ میں موجود بچے کی عام طور پر دو حالتیں ہو سکتی ہیں: یا تو وہ زندہ ہوگا، یا مرا ہوا ہوگا۔ اگر وہ زندہ ہے، تو اس کے بارے میں تمام ائمہ کے درمیان اتفاق پایا جاتا ہے کہ، جب اُسے ذبح کیا جائے گا، تو وہ حلال شمار ہوگا؛ ورنہ وہ حرام شمار ہوگا، یعنی اگر زندہ باہر آنے کے بعد ذبح کیے بغیر مر گیا تو اب اس کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے مردہ باہر آتا ہے، تو پھر اس میں علمائے کرام کا اختلاف ہے۔ اختلاف کی تفصیل آگے ذکر کی جائے گی۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ إِذَا تَمَّ خَلْقُهُ، فَذَكَاتُهُ فِي ذَكَاةِ أُمِّهِ، فَلا بَأْسَ بِأَكْلِهِ، فَأَمَّا أَبُو حَنِيفَةَ فَكَانَ يَكْرَهُ أَكْلَهُ حَتّٰى يَخْرُجَ حَيًّا فَيُذَكّٰى، وَكَانَ يَرْوِي، عَنْ حَمَّادٍ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ، أَنَّهُ قَالَ: لا تَكُونُ ذَكَاةُ نَفْسٍ ذَكَاةَ نَفْسَيْنِ۔

ترجمہ: امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ہم اس روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں، جب جانور کے پیٹ میں موجود بچے کی تخلیق مکمل ہو چکی ہو، تو اُس کی ماں کو ذبح کرنا ہی اسے ذبح کرنا شمار ہوگا، ایسے جانور کو کھانے میں

کوئی حرج نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہؒ نے ایسے جانور کے کھانے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ وہ تب حلال و جائز کہتے تھے جب وہ اپنی ماں کے پیٹ سے زندہ باہر آ جائے، پھر اسے ذبح بھی کیا جائے۔ انہوں نے حماد کے حوالے سے ابراہیم نخعیؒ کے بارے میں یہ بات نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ: کسی ایک جانور کو ذبح کیا جانا دوسرے کا ذبح کرنا شمار نہیں ہوگا۔

تشریح: امام محمدؒ نے اپنا موقف و مسلک وہی بیان فرمایا ہے جو بظاہر ان روایات سے ماخوذ ہے کہ بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے زندہ نکلے یا مردہ بہردو صورت وہ حلال شمار ہوگا۔ لیکن حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مسلک اس کے خلاف بیان فرمایا اور اس کو امام اعظمؒ کے استاذ حضرت حماد اور اُن کے شیخ حضرت ابراہیم نخعیؒ کا مسلک بھی قرار دیا۔

لیکن باب میں مذکور مسئلہ میں اس بات میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ، اگر بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے مردہ باہر آتا ہے، جیسا کہ ماقبل میں ذکر کیا جا چکا، تو آیا وہ حلال ہے یا نہیں؟ تو اس میں علمائے کرام کا اختلاف ہے۔

جنین کا حکم اور اختلافِ ائمہ

<u>جمہور کا مذہب:</u> ماں کے پیٹ سے جو مردہ بچہ پیدا ہوا ہے وہ حلال ہے۔

<u>امام ابو حنیفہ کا مذہب:</u> امام صاحب کے نزدیک بچہ مردہ ہے تو حلال نہیں ہے۔

<u>جمہور کی دلیل:</u> حضرت جابرؓ کی حدیث ہے: "ذَكَاةُ الجَنِيْنِ ذَكَاةُ أُمِّهٖ".

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بچہ کو ذبح کرنا بعینہٖ اس کی ماں کو ذبح کرنا ہے۔ بچہ

ماں کے پیٹ میں اس کے ایک عضو کے مانند ہے، لہٰذا جس طرح ذبح کرنے سے مذبوح کے دیگر اعضاء حلال ہو گئے، یہ بھی حلال ہو گیا، ہر عضو کو مستقلاً ذبح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں نیابت مراد نہیں ہے، یعنی حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ماں کا ذبح کرنا جنین کے ذبح کرنے کے قائم مقام ہے، اس لئے الگ سے ذبح کرنے کی ضرورت نہیں ہے؛ بلکہ یہ حدیث زندہ جنین کے متعلق ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر بچہ زندہ نکل آئے تو اس کو اسی طرح ذبح کیا جائے گا، جس طرح اُس کی ماں کو۔ عبارت اس طرح ہوگی: "ذَکٰوۃُ الجَنِینِ کَذَکَاۃِ أُمِّہٖ".

بچہ ماں کے عضو کے مانند نہیں ہے، اس لیے کہ بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ماں مر جاتی ہے اور بچہ زندہ پیدا ہوتا ہے۔ اور ایسا بھی بہت ہوتا ہے کہ پیٹ کا بچہ مر جاتا ہے اور ماں زندہ رہتی ہے، دونوں کی حیات مستقلاً ہے، لہٰذا دونوں کا ذبح بھی مستقلاً ہوگا۔

حنفیہ کی دلیل: قرآنِ کریم کی آیت ہے: "حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃُ" اس لیے مردہ بچہ بھی حرام ہوگا۔ نیز اسی آیت میں آگے "مُنْخَنِقَةُ" (یعنی وہ جانور جس کا دَم گھٹ گیا ہو) جانور کو بھی حرام بتلایا گیا ہے۔ اور بچہ بھی ماں کے ذبح کرنے کے بعد سانس نہ پہنچنے کی وجہ سے گھٹ کر مر جاتا ہے، اس لیے اس کا بھی وہی حکم ہوگا جو "مُنْخَنِقَة" کا ہے، یعنی ایسا جنین حرام ہوگا۔

……☆☆☆……

(ب:۵۹) بَابُ أكلِ الجَرادِ

ٹڈی کھانے کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ دِينَارٍ، عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ، عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الْجَرَادِ؟ فَقَالَ: وَدِدْتُ أَنَّ عِنْدِي قَفْعَةً مِنْ جَرَادٍ فَآكُلُ مِنْهُ، قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ، فَجَرَادٌ ذُكِّيَ كُلُّهُ لا بَأْسَ بِأَكْلِهِ إِنْ أُخِذَ حَيًّا، أَوْ مَيِّتًا، وَهُوَ ذَكِيٌّ عَلَى كُلِّ حَالٍ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: حضرت عمر بن خطابؓ سے ٹڈی دَل کے بارے میں (حلال وحرام ہونے کے متعلق) پوچھا گیا، آپ نے فرمایا: میں پسند کرتا ہوں کہ میرے پاس ٹڈی دَل سے بھرا ایک تھیلہ ہو اور میں اس میں سے کھاؤں۔

امام محمدؒ کہتے ہیں: ہم اس روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ ٹڈی ذبح شدہ ہے، اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ زندہ پکڑی گئی ہو، یا مردہ، وہ بہرصورت حلال وپاک ہے۔ اور یہی قول امام ابوحنیفہؒ اور ہمارے عام فقہائے کرام کا ہے۔

ٹڈی کی حقیقت

تشریح: جَراد: جرادةٌ کی جمع ہے۔ ٹڈی کو کہتے ہیں۔ یہ جَـرْدٌ سے مشتق ہے، لأنّه لَا يَنزِلُ علىٰ شَيءٍ مِن الأجردة.

(فتح الباری، ج:۹، ص:۷۷۴)

ٹڈی ایک قسم کا پردار کیڑا ہے، جسے مکڑی بھی کہتے ہیں اور ہرے بھرے کھیت اس کا نشانہ بنتے ہیں۔ یہ بڑی تعداد میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں اور درختوں اور فصلوں پر حملہ آور ہو کر اُن کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

اُڑنے والے پرندوں میں یہ ایک ایسا پرندہ ہے جو ذبح کیے بغیر حلال ہے اور اس کا کھانا ہر طرح جائز ہے، اس لیے کہ قرآنِ کریم نے جو مردار کی حرمت بیان فرمائی ہے "حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ" اس سے دو قسم کے مردار مستثنیٰ کیے گئے ہیں: ایک کا تعلق خشکی اور دوسرے کا تعلق پانی سے ہے۔ خشکی کا مردار یہی ٹڈی (مکڑی) ہے۔ اور پانی کا مردار مچھلی ہے۔ یہ دونوں ذبح کیے بغیر حلال ہیں۔

(ب:٦٠) بَابُ ذَبَائِحِ نَصَارَى الْعَرَبِ

عرب عیسائیوں کے ذبح کردہ جانوروں کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا ثَوْرُ بْنُ زَيْدٍ الدِّيلِيُّ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّهُ سُئِلَ عَنْ ذَبَائِحِ نَصَارَى الْعَرَبِ؟ فَقَالَ: لا بَأْسَ بِهَا، وَتَلا هَذِهِ الآيَةَ: (وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ).

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بارے میں یہ بات منقول ہے کہ اُن سے عرب میں رہنے والے عیسائیوں کے ذبیحہ کے بارے میں دریافت کیا گیا، تو انہوں نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ پھر انہوں نے اس آیت کی تلاوت کی: "اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست رکھتا ہے وہ اُن

میں سے ایک ہے"۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں: ہم اس روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

نصاریٰ العرب سے مراد کون لوگ ہیں؟

تشریح: نصاریٰ العرب کون ہیں؟ اس بارے میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ لوگ بنی اسرائیل میں نہ ہونے کی وجہ سے "اہل کتاب" میں شامل نہیں ہیں۔ اور قرآنِ کریم میں: "وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوْا الْکِتَابَ حِلٌّ لَّکُمْ" کے حکم میں یہ لوگ شامل نہیں، لہٰذا اُن کے اہل کتاب نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھانا جائز نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان کے ذبیحہ کو حلال قرار دیا اور آپ کا استدلال: "وَمَنْ یَتَوَلَّھُمْ مِنکُمْ فَإِنَّهُ مِنْھُمْ" ہے، یعنی نصاریٰ العرب اگرچہ خود اہلِ کتاب نہ سہی؛ لیکن اُن کی اہل کتاب (بنی اسرائیل) سے دوستی ہے۔ اور اس بناء پر وہ اہل کتاب نہ ہوتے ہوئے بھی اہل کتاب میں شامل کر دیئے گئے، دوستی بھی اور اُن کا دین بھی انہوں نے قبول کر لیا، اس لئے ان کے ساتھ معاملہ وہی اور ویسا ہی کیا جائے گا جو اہل کتاب سے کرنے کا حکم ہے، جب اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے تو ان نصاریٰ العرب کا ذبیحہ بھی حلال ہوگا۔

امام محمد علیہ الرحمہ نے آخر میں فرمایا کہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے فتویٰ پر ہم سب کا عمل ہے۔

اعتراض: نصاریٰ عرب کو بنی اسرائیل میں شامل کر کے اُن کا ذبیحہ

حلال قرار دینا بروایت ابن جریر، حضرت علی المرتضیٰ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ درست نہیں ہے، چنانچہ حضرت علی المرتضیٰؓ سے نصاریٰ عرب کے ذبیحہ کے متعلق سوال کیا گیا: تو آپ نے فرمایا: ان کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا: نصاریٰ عرب کے ذبیحہ کو مت کھاؤ۔

(تفسیر ابن جریر، ج:٦، ص:٥)

جواب: یہ دونوں روایات قرآنِ کریم کی ان آیات کے مقابلے میں نہیں لائی جاسکتیں جو اہل کتاب کے ذبیحہ کو حلال قرار دیتی ہیں۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے مؤطا میں بھی آپ نے ایک روایت ملاحظہ فرمائی، جس میں آپ نے نصاریٰ عرب کے ذبیحہ کو ایک قرآنی آیت کے حوالے سے حلال فرمایا۔ اور ابن جریر سے مذکورہ روایت کا ایک راوی ''لیث'' نامی ہے، جس کی کنیت ''ابن ابی سلیم'' ہے، اسے کمزوری حافظہ کی بنا پر لیث سے ناقدین حدیث نے ضعیف کہا ہے، لہٰذا اس کا کوئی وزن نہ رہا۔

اہل کتاب کے ذبیحہ کی شرطیں

فقہاء نے اہل کتاب کے ذبیحہ کے حلال ہونے کے لئے تین شرطیں لکھی ہیں:

اوّل یہ کہ ذبح اسلامی طریقے سے کیا ہو۔ دوم: یہ کہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام واقعتاً لیا ہو۔ سوم: یہ کہ ذبح کرنے والا واقعتاً اہل کتاب ہو۔

ان میں سے کوئی بھی شرط فوت ہوگئی، تو پھر ذبیحہ جائز نہیں ہوگا، مثلاً: اگر معلوم ہو جائے کہ ذبح کے وقت اللہ کے نام کے بجائے صرف حضرت مسیح علیہ السلام کا نام لیا گیا ہے، یا ذبح کرنے والا اہل کتاب میں سے نہیں؛ بلکہ ملحد ہے، تو ایسا ذبیحہ

کھانا جائز نہیں۔ (فتاوی ہندیہ، ج:۵،ص:۲۸۵)

اہل کتاب سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل ہوں اور تورات وانجیل میں سے کسی پر ایمان رکھتے ہوں، اگرچہ اُن کے عقائد مشرکانہ ہوں۔تو ان کا ذبیحہ درست ہوگا۔

وَ قَالَ الزُّهرِي: لَا بأسَ بِذبيحةِ نَصارَى العَرب.

(ب:٦١) بَابُ مَا قُتِلَ بِالحَجَر

پتھر مار کر جس جانور کو مارا گیا، اس کا حکم

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، قَالَ: رَمَيْتُ طَائِرَيْنِ بِحَجَرٍ وَأَنَا بِالْجُرُفِ، فَأَصَبْتُهُمَا، فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَمَاتَ، فَطَرَحَهُ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ، وَأَمَّا الآخَرُ فَذَهَبَ عَبْدُ اللَّهِ يُذَكِّيهِ بِقَدُومٍ فَمَاتَ قَبْلَ أَنْ يُذَكِّيهِ فَطَرَحَهُ أَيْضًا.

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ، مَا رُمِيَ بِهِ الطَّيْرُ، فَقُتِلَ بِهِ قَبْلَ أَنْ تُدْرَكَ ذَكَاتُهُ لَمْ يُؤْكَلْ، إِلا أَنْ يُخْرَقَ، أَوْ يُبْضَعَ فَإِذَا خُرِقَ وَبُضِعَ، فَلا بَأْسَ بِأَكْلِهِ وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا.

ترجمہ: نافع بیان کرتے ہیں: میں ''جرف'' کے مقام پر موجود تھا، میں نے دو پرندوں کو پتھر مارے وہ انہیں لگے، اُن میں سے ایک مر گیا، تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اُسے پھینک دیا اور دوسرے کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ ''قدوم'' کے ذریعے ذبح کرنے لگے، تو اسے ذبح کرنے سے پہلے وہ بھی مر

گیا، تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اسے پھینک دیا۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں: ہم اس روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں کہ جس پرندے کو پتھر مار کر قتل کر دیا جائے اور اسے ذبح کرنے کا موقع نہ مل سکے، اس کا گوشت نہیں کھایا جائے گا؛ البتہ اگر اسے زخم آ جائے، یا اس کا کوئی عضو کٹ جائے تو حکم مختلف ہوگا، جب اسے کوئی زخم آ جائے، یا اس کا کوئی عضو کٹ جائے تو اسے (ذبح کر کے) کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: مذکورہ اثر میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ایک فعل یا فتویٰ ذکر کیا گیا ہے۔ پتھر مارنے سے جو جانور مر گیا، اُسے آپ نے حرام سمجھ کر پھینک دیا اور جس میں ابھی جان تھی اسے ذبح کرنا چاہا تو وہ بھی ذبح کرنے سے قبل مر گیا، اسے بھی حرام کہا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ پتھر مارنے سے اگر کوئی پرندہ مر جاتا ہے تو وہ حلال نہیں، خواہ پتھر مارتے وقت تکبیر پڑھی جائے، یا نہ پڑھی جائے۔

امام محمدؒ اس اثر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اگر پتھر مار کر کسی جانور کو زندہ پکڑ کر ذبح کر دیا، تو وہ حلال ہے۔

جن آلات سے شکار کرنے سے جانور کے زخمی ہو جانے کی صورت میں اس کا کھانا حلال ہے، ان آلات کے بارے میں علامہ ابن قدامہ نے ایک ضابطہ لکھا ہے جو درج ذیل ہے کہ ہر ایسا آلہ جس سے جانور کا جسم کٹ جائے، خواہ وہ لکڑی کا بنا ہوا ہو، یا لوہے کا، جب اس آلہ کو جانور پر مارتے وقت ''بسم اللہ اللہ اکبر'' پڑھ کر مارا گیا اور جانور اس سے زخمی ہوا اور اس کا خون بہہ نکلا تو وہ جانور حلال ہے۔ اس کے علاوہ تمام صورتوں سے شکار کیا گیا جانور حرام ہوگا۔

تیر سے شکار کرنے کی شرطیں

تیر سے شکار کرنا بالاتفاق جائز ہے؛ البتہ اس کے حلال ہونے کے لیے ایک شرط تو یہ ہے کہ تیر پھینکتے ہوئے بسم اللہ پڑھی گئی ہو، قصداً تسمیہ ترک نہ کیا گیا ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس بات کا یقین، یا ظن غالب ہو کہ شکار تیر لگنے ہی سے مرا ہے، کسی اور چیز سے اس کی موت واقع نہیں ہوئی۔ اگر شک ہو جائے کہ اس کی موت کسی اور چیز سے واقع ہوئی ہے، تو اس شکار کا استعمال درست نہیں ہے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ تیر پھینکنے کے بعد شکار کے غائب ہونے کی صورت میں اس کی تلاش مسلسل جاری رکھی گئی ہو۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے، ردالمحتار، ج:۶، ص:۴۶۸)

(ب:۶۲) بَابُ الشَّاةِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ تُذَكّٰى قَبْلَ أَنْ تَمُوتَ

بکری وغیرہ کے مرنے سے پہلے اُسے ذبح کرنا

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ، عَنْ أَبِي مُرَّةَ، أَنَّهُ سَأَلَ أَبَا هُرَيْرَةَ عَنْ شَاةٍ ذَبَحَهَا فَتَحَرَّكَ بَعْضُهَا؟ فَأَمَرَهُ بِأَكْلِهَا، ثُمَّ سَأَلَ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ فَقَالَ: إِنَّ الْمَيْتَةَ لَتَتَحَرَّكُ، وَنَهَاهُ.

قَالَ مُحَمَّدٌ: إِذَا تَحَرَّكَتْ تَحَرُّكًا: أَكْبَرُ الرَّأْيِ فِيهِ وَالظَّنِّ أَنَّهَا حَيَّةٌ أُكِلَتْ، وَإِذَا كَانَ تَحَرُّكُهَا شَبِيهًا بِالِاخْتِلَاجِ، وَأَكْبَرُ الرَّأْيِ وَالظَّنِّ فِي ذٰلِكَ أَنَّهَا مَيْتَةٌ لَمْ تُؤْكَلْ.

ترجمہ: ابومرّہ بیان کرتے ہیں: انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایسی بکری کے بارے میں دریافت کیا جسے وہ ذبح کردیتے ہیں اور اس کا بعض حصہ پھر بھی حرکت کرتا رہتا ہے، تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اسے کھانے کی ہدایت کی۔

پھر انھوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے یہی مسئلہ دریافت کیا، تو وہ بولے: بعض اوقات مردار میں بھی حرکت پیدا ہوجاتی ہے۔ حضرت زیدؓ نے اسے کھانے سے منع کردیا۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں: جب وہ جانور اس انداز میں حرکت کرے کہ اس کا زندہ ہونے کا غالب گمان ہو، تو اسے کھالیا جائے گا اور جب یہ ہو کہ اس کے اعضاء پھڑک رہے ہوں اور غالب گمان یہی ہو کہ وہ مرچکا ہے، تو اسے نہیں کھایا جائے گا۔

تشریح: اس باب میں جو مسئلہ مذکور ہوا وہ ذبح کئے جانے والے جانور کی موت وحیات کے متعلق ہے، یعنی ذبح کرتے وقت جانور کا زندہ ہونا ضروری ہے، جو ذبح سے پہلے ہی مرچکا ہو اور ٹھنڈا ہوچکا ہو وہ میتۃ (مردار) کے حکم میں ہوجاتا ہے۔

جانور کی زندگی دو قسم کی ہوتی ہے: (۱) مستقرہ (۲) اصلی۔

مستقرہ: وہ حیات ہے جس میں زندگی ثابت کرنے کے لیے کسی علامت کی ضرورت نہ ہو؛ بلکہ جانور کی ظاہری شہادت ہی اس کی زندگی پر دلالت کرتی ہے۔

اصلی: وہ حیات ہے کہ جس میں نفس حیات کا ثبوت پایا جائے، یعنی علامات کے ذریعہ اس کی زندگی معلوم کی جاسکے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک ذبح کیے جانے والے جانور میں نفس حیات ہی کافی ہے، یعنی جس کو علامات کے ذریعہ معلوم کیا جاسکے، لیکن حضرت زید بن ثابتؓ کے نزدیک حیات مستقرہ کا پایا جانا ضروری ہے، اسی فرق کے پیش نظر ایک ہی مسئلہ میں حضرت ابو ہریرہؓ نے اسے کھانے کا حکم دیا؛ کیونکہ جانور نے ذبح ہونے کے بعد ہاتھ پاؤں ہلائے تھے اور یہ حرکت اس کی زندگی کی علامت ہے، لہٰذا زندہ جانور ذبح کیا گیا۔

لیکن حضرت زید بن ثابتؓ کے نزدیک حیاتِ مستقرہ کا پایا جانا ضروری ہے، یعنی ذبح کیے جانے والے جانور کی حالت خود بتاتی ہو کہ وہ زندہ ہے۔ ان دونوں اقوال میں سے احناف کے نزدیک قولِ ابو ہریرہؓ معمول بہ ہے۔ اس کی تائید حضرت علیؓ کے اثر سے بھی ہوتی ہے: "إذَا ضَربَتْ بِذَنَبِها أو رِجلِهَا" کہ جب ذبح شدہ جانور دُم ہلائے، یا ٹانگوں کو حرکت دے، یا اس کی آنکھیں اِدھر اُدھر پھریں تو وہ جانور ذبح ہوگیا اور حلال ہے۔ (مصنف عبدالرزاق، ج:۴، ص:۴۹۹) معلوم ہوا کہ جانور میں اصل حیات کا ہونا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت زیدؓ کا قول صرف اُن کی ذات تک محدود ہے۔

(ب:٦٣) بَابُ الرَّجُلِ يَشْتَرِى اللَّحْمَ فَلا يَدْرِى أذَكِيٌّ هُوَ أمْ غَيرُ ذَكِيٍّ

جب کوئی شخص گوشت خریدے اور اسے یہ پتہ نہ ہو کہ اسے شرعی طریقے سے ذبح کیا گیا ہے، یا نہیں کیا گیا؟

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخبَرَنَا هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّهُ قَالَ: سُئِلَ

رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيلَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّ نَاسًا مِنْ أَهْلِ الْبَادِيَةِ يَأْتُونَ بِلُحْمَانٍ، فَلَا نَدْرِي هَلْ سَمَّوْا عَلَيْهَا أَمْ لَا؟ قَالَ: فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: سَمُّوا اللّٰهَ عَلَيْهَا، ثُمَّ كُلُوهَا، قَالَ: وَذٰلِكَ فِي أَوَّلِ الْإِسْلَامِ.

ترجمہ: ہشام بن عروہ اپنے والد کا یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ: نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا: عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! ہم لوگ دیہاتوں میں رہتے ہیں، ہمارے پاس گوشت آجاتا ہے، جس کے بارے میں ہمیں یہ پتہ نہیں ہوتا کہ کیا انہوں نے اس کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا تھا، یا نہیں؟ تو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم اس پر اللہ کا نام لے کر اسے کھالو۔

راوی کہتے ہیں: یہ ابتدائے اسلام کے دور کی بات ہے۔

تشریح: اس حدیث کا پس منظر بیان کرتے ہوئے علماء نے یہ بات بیان کی ہے کہ ابتدائے اسلام میں مدینہ منورہ کے گردونواح علاقوں میں بعض غیر مسلم بھی رہتے تھے، جو مسلمان نہیں ہوئے تھے، جب وہ اپنے جانوروں کا گوشت مدینہ منورہ میں فروخت کرنے کے لیے لاتے تھے تو صحابہ کرامؓ اس بارے میں مشکوک ہو جایا کرتے تھے؛ کیونکہ انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ جس شخص نے اس جانور کو ذبح کیا ہے اس نے ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا ہے، یا نہیں؟ تو نبی اکرم ﷺ نے یہ ہدایت کی کہ: تم اب اس پر اللہ کا نام لے لو اور اسے کھالو۔

اس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ عبدالحئی لکھنویؒ نے یہ بات تحریر کی ہے کہ: علامہ طیبیؒ نے مشکوٰۃ کے حواشی میں یہ بات تحریر کی ہے: یہ حکمت آمیز اسلوب ہے؛ گویا کہ ان صحابہ کرامؓ سے یہ کہا گیا ہے کہ تم اس حوالے سے ان لوگوں پر اعتراض نہ

کرواور اس بارے میں تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ تم اس پر اللہ کا نام لے لو۔

اس حدیث کے بارے میں امام مالکؒ کہتے ہیں کہ: یہ اجازت ابتدائے اسلام میں تھی، یعنی "وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ" والی آیت اُترنے سے قبل یہ مسئلہ تھا، اس آیت کے نزول کے بعد وہ بات ختم ہوگئی۔

ایک سوال اور اس کا جواب

سوال: مذکورہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بوقت ذبح "بسم اللہ اللہ اکبر" پڑھنا لازم اور شرط نہیں؛ کیونکہ اگر شرط ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دونوں صورتوں میں کھانے کی اجازت نہ فرماتے۔ یہ استدلال "مہلب" کا ہے۔

(تفصیل کے لیے دیکھیں: اوجز المسالک، ج:۹، ص:۱۲۰)

جواب اوّل: وقت ذبح اگر بسم اللہ پڑھنا شرط نہ ہوتا تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب کچھ یوں ہوتا: تم پر بسم اللہ پڑھنا ذبح کرنے کے وقت شرط نہیں ہے، اس لیے جو چیز شرط نہیں اس کے بارے میں شکوک وشبہات کیوں کرتے ہو؟ لیکن جو جواب آپؐ نے ارشاد فرمایا اس میں آپ نے ان کے سوال کو رد نہیں فرمایا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذبح کے وقت بسم اللہ پڑھنا ضروری ہے۔

دوسرا جواب: مُستَدرَك على الصحيحين میں حضور ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے: إذَا دخلَ أحدُكُم على أخِيهِ المُسلمِ فليأكُلْ مِن طَعامِهِ، ولا يَسئَلْ، وَ يَشرَبْ مِن شَرابِه ولَا يَسئَلْ .... إنَّ المُسلمَ لَا يُطعِمُه ولا يَسقِيهِ إلَّا مَا هُو حَلالٌ عِندَهُ. (مستدرک، ج:۱، ص:۱۲۶)۔

اس حدیث نے موّطا کی وضاحت کردی کہ جب مسلمان لے کرآئے ہیں تو یہ گمان کیوں کرتے ہو کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کوحرام کھلائیں گے، اس لیے اسے بسم اللہ پڑھ کرکھالیا کرو، یہ اس لیے نہیں فرمایا کہ بسم اللہ بوقت ذبح شرط نہیں؛ بلکہ اس لیے فرمایا کہ تمہیں اپنے مسلمان ساتھیوں کے بارے میں یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ انہوں نے بسم اللہ پڑھی یا نہ پڑھی۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ إِذَا كَانَ الَّذِي يَأْتِي بِهَا مُسْلِمًا، أَوْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ، فَإِنْ أَتَى بِذَلِكَ مَجُوسِيٌّ، وَذَكَرَ أَنَّ مُسْلِمًا ذَبَحَهُ، أَوْ رَجُلا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمْ يُصَدَّقْ، وَلَمْ يُؤْكَلْ بِقَوْلِهِ.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں: ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔امام ابوحنیفہ بھی اسی بات کے قائل ہیں۔اس گوشت کولانے والا شخص اگر مسلمان ہو، یا اہل کتاب ہو، تو یہ حکم ہوگا۔لیکن اگرکوئی مجوسی اسے لے کرآتا ہے اور یہ بات ذکر کرتا ہے کہ ایک مسلمان نے اسے ذبح کیا ہے، یا اہل کتاب نے اسے ذبح کیا ہے، تواس کی بات کی تصدیق نہیں کی جائے گی اوراس کے بیان کی وجہ سے اس گوشت کونہیں کھایا جائے گا۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ: ہم احناف کا مسلک قرآنِ کریم کی مذکورہ آیت ”وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ“ کے مطابق ہے چنانچہ فرمایا کہ: اگر باہر دیہات سے گوشت لانے والا مسلمان، یا کتابی ہے، تواس کا کھانا جائز ہے۔اوراگرمجوسی ہے، تووہ اگرچہ کہہ دے کہ: اسے مسلمان یا کتابی نے اللہ کے نام پر ذبح کیا تھا، تب بھی اس کی بات کی

تصدیق نہیں کریں گے اور اس سے گوشت لے کر نہیں کھائیں گے۔

نوٹ: مزید تفصیل ماقبل میں آچکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں!

......☆☆☆......

(ب:٦٤) بَابُ صَيدِ الكَلْبِ المُعَلَّم

تربیت یافتہ کتے کے شکار کا بیان

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ، كَانَ يَقُولُ فِي الْكَلْبِ الْمُعَلَّمِ: كُلْ مَا أَمْسَكَ عَلَيْكَ، إِنْ قَتَلَ، أَوْ لَمْ يَقْتُلْ.

قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهَذَا نَأْخُذُ، كُلُّ مَا قُتِلَ، وَمَا لَمْ يُقْتَلْ إِذَا ذَكَّيْتَهُ مَا لَمْ يَأْكُلْ مِنْهُ، فَإِنْ أَكَلَ، فَلا تَأْكُلْ فَإِنَّمَا أَمْسَكَهُ عَلَى نَفْسِهِ، وَكَذَلِكَ بَلَغَنَا عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ، وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا رَحِمَهُمُ اللَّهُ تَعَالَى.

ترجمہ: نافعؒ بیان کرتے ہیں: حضرت عبداللہ بن عمرؓ تربیت یافتہ کتے کے بارے میں فرمایا کرتے تھے: جس شکار کو وہ تمہارے لیے روک لے، اسے کھالو، خواہ اس نے اسے قتل کر دیا ہو یا قتل نہ کیا ہو۔

امام محمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ہم اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ ہر وہ شکار جسے اس تربیت یافتہ کتے نے قتل کر دیا ہو، یا قتل نہ کیا ہو، جب آپ اسے ذبح کر لیتے ہیں، اسے کھا لیتے ہیں، جب کہ اس کتے نے اس میں سے کچھ نہ کھایا ہو، لیکن اگر اس نے خود اس میں سے کچھ کھا لیا ہو، تو پھر آپ

اسے کھانہیں سکتے؛ کیونکہ اس جانور نے اپنے لیے شکار کیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالے سے اسی طرح کی روایت ہم تک پہنچی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء اسی بات کے قائل ہیں۔

تشریح: مذکورہ باب میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ایک قول ''شکاری کتے'' کے شکار کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: شکاری کتے کا پکڑا ہوا شکار حلال ہے۔

اس کے بعد امام محمدؒ نے اسی مسئلہ کے بارے میں اپنا موقف بیان کیا اور اس کی تائید میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا حوالہ دیا، وہ یہ کہ اگر شکاری کتے نے اس میں سے کھایا نہ ہو، تو حلال اور اگر کھالیا تو پھر نا جائز۔ ہاں! اگر زندہ پکڑا گیا تو اسے شرعی طریقے سے ذبح کرنے پر وہ حلال ہو جائے گا۔

شکاری کتے سے شکار کرنا قرآن کریم کی آیت ''یَسْاَلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ'' الآیۃ. سے ثابت ہے۔ مذکورہ آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر کھڑے ہو کر اندر آنے کی اجازت طلب کی، آپ نے اجازت دے دی؛ مگر وہ اندر نہ آئے۔ عرض کیا: یارسول اللہؐ! گھر میں ایک کتا ہے اور ہم فرشتے کتے والے گھر میں نہیں جایا کرتے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دے دیا، چنانچہ مدینہ منورہ کے تمام کتے مار دیے گئے۔ پھر عوالی مدینہ کے لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! کیا کتا رکھنا جائز بھی ہے، یا سب کو مار ڈالا جائے؟ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، یعنی شکار کرنے کے لیے کتے رکھنا اور پالنا جائز ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے ضرورت کے لئے کتے پالنے اور رکھنے کی اجازت دے دی۔ ضرورت یہ کہ

کھیتی باڑی کی حفاظت کے لیے، شکار کے لیے۔ (تفسیر خازن، ج:۱،ص:۱۷۵)

شکاری کتے کے شرائط تین ہیں

(۱) شکار کو دیکھ کر خود نہ دوڑ پڑے؛ بلکہ مالک کے دوڑانے سے دوڑے۔

(۲) مالک اسے جھڑکے اور رُکنے کے لئے کہے، تو وہ رک جائے۔ اگر واپس بلانا چاہے تو واپس آ جائے۔

(۳) شکاری کتا شکار کو پکڑنے کے بعد خود اس میں سے کچھ نہ کھائے؛ بلکہ اس شکار کو مالک کے لئے لے آئے۔

شکار کے حلال وطیب ہونے کی شرائط

(۱) جس جانور سے شکار کیا جائے وہ شکاری جانور ہو، اگر غیر شکاری جانور ہوگا، تو اس کا پکڑا ہوا شکار اس حکم میں شامل نہ ہوگا، مثلاً: بلی کا پکڑا ہوا شکار۔

(۲) وہ شکاری جانور سدھایا گیا ہو، لہٰذا کسی غیر مسلم کا سدھایا ہوا جانور جو پکڑ کر اور مار کر لے آئے، وہ حلال نہ ہوگا۔

(۴) اس نے شکار کو زخمی کر کے مارا ہو، اگر گلا گھونٹ کر مارا، یا وہ خود دہشت سے مر گیا، یا گر کر مر گیا، ان صورتوں میں وہ حرام ہوگا۔

(۵) اس شکاری جانور کو بسم اللہ پڑھ کر چھوڑا گیا ہو، اگر جان بوجھ کر بسم اللہ ترک کی گئی، تو بھی شکار حرام ہوگا۔

(۶) اگر شکار زندہ پکڑ کر لے آیا، تو اسے شرعی طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو۔

(۷) شکاری جانور مثلاً کتے کے ساتھ غیر شکاری کتا، یا غیر مسلم کا کتا شریک کار نہ ہو۔

(۸) شکار کیا ہوا جانور پانی میں ڈوبا ہوا نہ ملے۔ (از خود)

(ب:٦٥) بَابُ العَقِيقَة

عقیقہ کا بیان

عقیقہ کے لغوی اور اصطلاحی معنیٰ

عقیقہ اس جانور کو کہتے ہیں جو نومولود کی طرف سے ذبح کیا جاتا ہے۔

ابوعبیدؒ، اصمعیؒ اور زمخشریؒ نے فرمایا کہ "عقیقہ" اصل میں ان بالوں کو کہا جاتا ہے جو نومولود بچے کے سر پر ہوتے ہیں۔ عَقّ کے معنیٰ: کاٹنے کے ہیں، چونکہ وہ بال کاٹے جاتے ہیں، اس لیے انہیں "عقیقہ" کہا جاتا ہے، پھر اس حالت میں ذبح کی جانے والی بکری کو "عقیقہ" کہا جانے لگا۔ (فتح الباری، ج:۹، ص:۷۳۲)

علامہ خطابی فرماتے ہیں: العَقِيقَةُ اسمُ الشَّاة المَذبُوحَةِ عَن الوَلَدِ، سُمِّيتْ بذٰلكَ، لأنَّها تَعُقُّ مَذابحَها، أي تَشقُّ وَ تقطَعُ". یعنی عقیقہ اس بکری کا نام ہے جو بچے کی طرف سے ذبح کی جاتی ہے، اس لیے عقیقہ کہتے ہیں کہ اس کی رگیں کاٹی جاتی ہیں۔ (عمدۃ القاری، ج:۲۱، ص:۸۲)

عقیقہ کا حکم

عقیقہ کے بارے میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے۔ صاحب بدایۃ المجتہد نے اس اختلاف کو یوں بیان کیا ہے:

اصحابِ ظواہر اور امام احمدؒ کی ایک روایت میں عقیقہ واجب ہے۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک عقیقہ سنت ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ عقیقہ نہ تو فرض ہے اور نہ ہی سنت ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ آپ کے مذہب کا حاصل یہ ہے کہ عقیقہ ان کے نزدیک تطوع

(مستحب) ہے۔ (بدایۃ المجتھد، ج:۱،ص:۳۳۹)

دنیا کی سب ہی قوموں اور ملتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ بچہ پیدا ہونے کو ایک نعمت اور خوشی کی بات سمجھی جاتی ہے اور کسی تقریب کے ذریعہ اس خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے، یہ انسانی فطرت کا تقاضہ بھی ہے اور اس میں ایک بڑی مصلحت یہ ہے کہ اس سے نہایت لطیف اور خوبصورت طریقے پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ باپ اس بچہ کو اپنا ہی بچہ سمجھتا ہے اور اس بارے میں اس کو اپنی بیوی پر کوئی شک وشبہ نہیں ہے، اس سے بہت سے فتنوں کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ عربوں میں اس کے لئے جاہلیت میں بھی عقیقہ کا رواج تھا۔ دستور یہ تھا کہ پیدائش کے چند روز بعد نومولود بچے کے سر کے وہ بال جو وہ ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوا ہے، صاف کر دیئے جاتے اور اس دن خوشی میں کسی جانور کی قربانی کی جاتی (جو ملت ابراہیمی کی نشانیوں میں سے ہے) رسول اللہ ﷺ نے اس کو باقی رکھتے ہوئے؛ بلکہ اس کی ترغیب دیتے ہوئے اس کے بارے میں مناسب ہدایات دیں۔ (فیض مشکوٰۃ، ج:۷،ص:۴۲۵)

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، حَدَّثَنَا زَيْدُ بْنُ أَسْلَمَ، عَنْ رَجُلٍ مِنْ بَنِي ضَمْرَةَ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنِ الْعَقِيقَةِ؟ قَالَ: لا أُحِبُّ الْعُقُوقَ، فَكَأَنَّهُ إِنَّمَا كَرِهَ الاسْمَ، وَقَالَ: مَنْ وُلِدَ لَهُ وَلَدٌ فَأَحَبَّ، أَنْ يَنْسُكَ عَنْ وَلَدِهِ فَلْيَفْعَلْ.

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا نَافِعٌ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ يَسْأَلُهُ أَحَدٌ مِنْ أَهْلِهِ عَقِيقَةً إِلا أَعْطَاهُ إِيَّاهُ، وَكَانَ يَعِقُّ عَنْ وَلَدِهِ بِشَاةٍ شَاةٍ عَنِ الذَّكَرِ وَالأُنْثَى.

ترجمہ: زید بن اسلم بنو ضمرہ سے تعلق رکھنے والے ایک شخص کے حوالے

سے ان سے ان کے والد کا یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے عقیقہ کے بارے میں دریافت کیا گیا: تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: میں عقوق (نافرمانی) کو پسند نہیں کرتا۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے: جس شخص کے ہاں بچہ ہو اور وہ اس بچے کی طرف سے قربانی کرنا چاہے تو وہ ایسا کرے۔

نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے گھر والوں میں سے جب بھی کوئی ان سے عقیقے کے لیے کہتا تھا، تو وہ اسے (جانور) عطا کر دیتے تھے۔ وہ اپنی اولاد کی طرف سے ایک ایک بکری ذبح کیا کرتے تھے؛ خواہ وہ مذکر ہو یا مؤنث ہو۔

تشریح: پہلی روایت میں حضور ﷺ سے مروی ہے کہ آپ سے عقیقہ کے متعلق دریافت کیا گیا: تو آپ نے ''عقوق'' (نافرمانی) کو ناپسند فرمایا۔

راوی اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ ''عقوق'' والدین کی نافرمانی کرنے کو کہا جاتا ہے، اس لیے لفظ عقیقہ میں معنوی طور پر ناراضگی کا احتمال ہونے کی بنا پر آپ نے اس لفظ کو ناپسند فرمایا، اس لئے آپ نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ جسے لڑکا عطا کرے وہ اس کی طرف سے جانور ذبح کرنا چاہے تو کر لے۔

آپ کے اس ارشاد سے بعض حضرات نے یہ سمجھا کہ عقیقہ مباح ہے، مندوب نہیں ہے؛ کیونکہ آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہی ہے کہ جانور ذبح کرے یا نہ کرے، اسے اختیار ہے؛ لیکن جب ہم دوسری احادیث میں خود حضور کا عمل دیکھتے ہیں کہ آپ نے حسنؓ و حسینؓ کا عقیقہ خود کیا اور بہت سی روایات میں عقیقہ کی ترغیب دی گئی، ان تمام کو سامنے رکھ کر خلاصہ یہ نکلا: "إنَّ تحصِیل مَذهبه أنَّها عِنده تَطوُّع. امام صاحب کے مذہب کا ماحصل یہ ہے کہ اُن کے نزدیک عقیقہ مستحب ہے۔

اشکال اور اس کا جواب

اشکال: عقیقہ کے جواب میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: میں ''عقوق'' کو پسند نہیں کرتا؛ چونکہ آپ نے یہ جواب عقیقہ کے متعلق فرمایا، نہ کہ والدین کی نافرمانی کے مسئلہ میں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے عقیقہ کو ناپسند فرمایا ہے۔ جب حضور ﷺ نے اسے ناپسند فرمایا، تو اس کی اباحت واستحباب کہاں رہا؟

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ سائل کو عقیقہ اور عقوق میں لفظی مشارکت کی بنا پر شبہ تھا کہ کہیں دونوں کا حکم ایک سا نہ ہو اور وہ جانتا تھا کہ ''عقوق'' اللہ کو ناپسند اور ''عقیقہ'' پسند ہے، تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے شبہات کو دور فرمادیا کہ اشتراکِ لفظی اگرچہ ہے، لیکن دونوں کا استعمال الگ الگ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ''عقوق'' ناپسند اور عقیقہ تو اللہ کو بہت محبوب ہے، حتی کہ آپ نے ارشاد فرمایا: "الغُلامُ مُرتهَنٌ بِعقِيقة". لڑکا عقیقہ کے ساتھ رہن کیا گیا ہے۔

(مرقاۃ المفاتیح، ج:۸، ص:۱۵۹)

دوسری روایت میں یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کسی بچہ کی پیدائش پر عقیقہ کے مطالبے پر عقیقہ کردیتے۔

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنَا جَعْفَرُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّهُ قَالَ: وَزَنَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَعْرَ حَسَنٍ، وَحُسَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، وَ زَيْنَبَ، وَأُمِّ كُلْثُومٍ، فَتَصَدَّقَتْ بِوَزْنِ ذَلِكَ فِضَّةً.

أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، أَخْبَرَنِي رَبِيعَةُ بْنُ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمَنِ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنٍ، أَنَّهُ قَالَ: وَزَنَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَعْرَ حَسَنٍ، وَحُسَيْنٍ، فَتَصَدَّقَتْ بِوَزْنِهِ فِضَّةً.

ترجمہ: امام جعفر صادقؒ اپنے والد (امام باقرؒ) کے حوالے سے یہ بات نقل کرتے ہیں کہ سیدہ فاطمہؓ نے حضرت امام حسنؓ امام حسینؓ سیدہ زینبؓ و سیدہ اُمّ کلثومؓ (کی پیدائش پر) ان کے سر کے بالوں کے وزن جتنی چاندی صدقہ کی تھی۔

ربیعہ بن عبد الرحمٰن امام محمد الباقرؒ کے حوالے سے یہ بات نقل کرتے ہیں کہ: سیدہ فاطمہؓ نے حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما (کی ولادت پر) ان کے بالوں کے وزن جتنی چاندی صدقہ کی تھی۔

تشریح: مذکورہ دونوں روایتوں میں یہ ہے کہ سیدہ خاتونِ جنت فاطمہؓ نے حسنؓ و حسینؓ وغیرہما کی ولادت کے بعد اُن کے سر کے بالوں کے ہم وزن چاندی کو صدقہ کیا۔ ان دونوں باتوں کے ضمن میں علمائے احناف نے چند مسائل ذکر فرمائے:

(۱) بچہ کی پیدائش کے بعد ساتویں دن اس کے سر کے بال صاف کیے جائیں اور ان کے ہم وزن چاندی کا صدقہ کیا جائے اور بچے کا نام رکھا جائے۔

(۲) لڑکے کی صورت میں دو جانور اور لڑکی کی صورت میں ایک جانور کا عقیقہ دیا جائے، جیسا کی روایت میں ہے: عَنِ الغُلَامِ شَاتَانِ وَعَنِ الجَارِيَةِ شَاةٌ. اگرچہ لڑکے کے عقیقہ میں ایک بکرا بھی ذبح کیا جا سکتا ہے، یعنی کمال استحباب تو دو بکرے ذبح کیا جانا ہے، لیکن استحباب کا کم سے کم درجہ ایک بکرا ذبح کرنے سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

(۳) نیک فال کے پیشِ نظر عقیقہ کے جانور کا گوشت زیادہ نہ توڑا جائے، یعنی اس کی چھوٹی چھوٹی زیادہ بوٹیاں بنانے کے بجائے بڑی بڑی بوٹیاں رکھی جائیں

اور ہڈی کو بھی بلا ضرورت ٹکڑے ٹکڑے نہ کیا جائے۔

نوٹ: یہ مسائل فتاویٰ اور فقہ کی کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ تفصیل کے لئے ان کتابوں کی طرف مراجعت کی جائے۔

قَالَ مُحَمَّدٌ: أَمَّا الْعَقِيقَةُ فَبَلَغَنَا أَنَّهَا كَانَتْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، وَقَدْ فُعِلَتْ فِي أَوَّلِ الإِسْلامِ ثُمَّ نَسَخَ الأَضْحَى كُلَّ ذَبْحٍ كَانَ قَبْلَهُ، وَنَسَخَ صَوْمُ شَهْرِ رَمَضَانَ كُلَّ صَوْمٍ كَانَ قَبْلَهُ، وَنَسَخَ غُسْلُ الْجَنَابَةِ كُلَّ غُسْلٍ كَانَ قَبْلَهُ، وَنَسَخَتِ الزَّكَاةُ كُلَّ صَدَقَةٍ كَانَتْ قَبْلَهَا، كَذَٰلِكَ بَلَغَنَا.

ترجمہ: امام محمدؒ فرماتے ہیں جہاں تک عقیقہ کا تعلق ہے، تو ہم تک یہ روایت پہنچی ہے کہ یہ زمانۂ جاہلیت کی رسم تھی اور ابتدائے اسلام میں بھی ایسا کیا گیا۔ پھر قربانی کے حکم نے اس طرح کے ہر ذبح کے حکم کو منسوخ کر دیا جو اس سے پہلے تھا، جس طرح رمضان کے روزوں نے تمام روزوں کو منسوخ کر دیا۔ اور غسل جنابت نے اس سے پہلے کے تمام غسل کو منسوخ کر دیا۔ اور زکوٰۃ نے ہر طرح کے صدقات کے حکم کو منسوخ کر دیا، جو اس سے پہلے تھا، ہم تک یہی روایت پہنچی ہے۔

تشریح: حضرت امام محمد علیہ الرحمہ کے مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ عقیقہ دور جاہلیت کی رسم تھی، ابتدائے اسلام میں چلتی رہی اور قربانی کے حکم نے اسے منسوخ کر دیا، ان حالات میں کہ عقیقہ اور دیگر ذبائح کو قربانی نے منسوخ کر دیا۔

منسوخ ہونے کے بعد اس کی حیثیت کیا ہوگی؟ بعض اہل علم نے اس کے نسخ کو دو اقسام کے روزوں کے منسوخ ہونے پر قیاس کیا، وہ یہ کہ "عتیرہ" اور "رجبہ" نام کے روزے پہلے فرض تھے، رمضان کی فرضیت نے اُن کو ایسا منسوخ کر دیا کہ استحباب بھی باقی نہ چھوڑا، لہٰذا قربانی نے عقیقہ کو ایسا ہی منسوخ کر دیا، اس

لیے اب عقیقہ بدعت ہے، جیسا کہ عتیرہ اور رجبہ کے روزے بدعت ہیں۔ یہ بات صاحب تلویح نے لکھی ہے۔

بعض علمائے احناف عقیقہ کی تنسیخ کو عاشورہ کے روزہ کی تنسیخ پر محمول فرما کر اس کی فرضیت کو منسوخ قرار دیتے ہیں اور سنیت کے قائل ہیں، یعنی عقیقہ فرض نہیں رہا؛ بلکہ سنت کے درجہ میں آ گیا۔ صاحب تلویح کی رائے کو جمہور نے کوئی اہمیت نہیں دی۔

اب فرضیت کے منسوخ ہونے پر عقیقہ کی اپنی حیثیت سنت کی ہوئی یا استحباب ومباح کے درجے میں آ گیا؟ یہ بات ماقبل میں بِدایۃُ المُجتَہِد کے حوالے سے آ چکی ہے۔ مختصر یہ کہ احناف کے یہاں راجح مسلک یہی ہے کہ عقیقہ ''تطوع'' میں داخل ہے۔

تمت بالخیر

آج مورخہ: ۲۸ ربیع الثانی ۱۴۴۲ ہجری، مطابق: ۲۳ اپریل ۲۰۲۰ بروز شب جمعہ ربّ ذوالجلال خالق السموات والارض کے بے پایاں احسانِ عظیم اور حضراتِ اساتذۂ کرام ومخلص احباب کی دعاؤں کی بدولت یہ شرح اپنے اختتام کو پہنچی، پروردگار کی بارگاہ میں بصمیم قلب دعا گوہوں کہ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرما کر آخرت کا ذریعہ بنائے!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أنتَ السَّمِيْعُ العَلِيْمُ، اللّٰهُمَّ! لَكَ الحَمدُ ولَكَ الشُّكرُ.

خاص تیرے ہی لئے ہے اے خدا!
حمد وشکر وفضل واحسان و عطاء

مراجع ومصادر

اس شرح کی ترتیب میں درجِ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

	نام کتاب	مصنف کا نام	مطبوعہ
۱	القرآن الکریم		
۲	احکام القرآن	امام ابوبکر احمد بن علی الرازی جصاصؒ	دار الکتب العلمیہ بیروت
۳	الجامع الصحیح للبخاری	ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ	مکتبہ زکریا دیوبند الہند
۴	الجامع الصحیح للمسلم	امام ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیریؒ	زکریا بک ڈپو دیوبند
۵	الجامع الترمذی	ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذیؒ	زکریا بک ڈپو دیوبند
۶	السنن الصغریٰ للنسائی	ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی	مکتبہ نعیمیہ دیوبند
۷	السنن للامام ابن ماجہ	امام ابوعبداللہ محمد بن یزید القزوینیؒ	زکریا بک ڈپو دیوبند
۸	المعجم الکبیر للطبرانی	ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی	مکتبہ ابن تیمیہ قاہرہ
۹	المصنف لابن ابی شیبہ	امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ العبسی کوفی	مکتبہ رحمانیہ اُردو بازار لاہور، پاکستان
۱۰	السنن لابی داؤد	امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی	مکتبہ اشرفیہ دیوبند
۱۱	المصنف لابن عبدالرزاق (بتحقیق: نصرالدین ازہری)	امام ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام صنعانی	دار الکتب العلمیہ بیروت، لبنان

۱۲	مسند امام احمد بن حنبل	امام احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی	دار الکتب العلمیہ بیروت
۱۳	المؤطا للامام مالک	امام مالک بن انس الاصبحی	کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
۱۴	المؤطا للامام محمد	امام ابو عبداللہ محمد بن الحسن شیبانی	کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
۱۵	شرح الطیبی	شرف الدین الحسین بن محمد الطیبی	دار الکتب العلمیہ بیروت
۱۶	المغنی لابن قدامہ	الشیخ موفق الدین ابو محمد القدامہ	دار الفکر بیروت لبنان
۱۷	اوجز المسالک	الشیخ محمد زکریا کاندھلویؒ	مکتبہ یحیوی سہارنپور
۱۸	التعلیق الممجد علی الموطا للامام محمد	علامہ ابو الحسنات عبدالحیٔ لکھنوی	مکتبہ بلال دیوبند
۱۹	المبسوط للسرخسی	شمس الائمہ شمس الدین ابو بکر محمد سرخسی	دار الکتب العلمیہ بیروت
۲۰	ارشاد الساری	امام شہاب الدین ابو العباس احمد بن محمد قسطلانی	دار الفکر بیروت لبنان
۲۱	الدُّرُّ المَنضُود	مولانا محمد عاقل مدظلہ العالی	مکتبہ خلیلیہ سہارنپور
۲۲	المُحلّٰی بالآثار	امام ابو محمد علی بن احمد بن سعید ابن حزم اندلسی	دار ابن حزم بیروت
۲۳	البحر الرائق	زین العابدین ابراہیم بن نجیم مصری	زکریا بکڈپو دیوبند
۲۴	بدائع الصنائع	علاؤ الدین ابو بکر بن سعود کاسانیؒ	زکریا بکڈپو دیوبند
۲۵	بدایۃ المجتھد	علامہ ابو الحفید ابن رشد القرطبی	مکتبہ مدنیہ دیوبند
۲۶	الجوہرۃ النیرۃ	امام ابو بکر بن علی بن محمد الحداد	فیصل بکڈپو دیوبند
۲۷	الموسوعۃ الفقہیہ	مجموعۃ من العلماء	دار ابن حزم بیروت
۲۸	توضیحات	مولانا فضل محمد یوسف زئی	المکتبۃ العربیہ پاکستان

۲۹	البنایہ	علامہ بدرالدین العینی	نعیمیہ بک ڈپو دیوبند
۳۰	فتاویٰ تاتارخانیہ	علامہ عالم بن علاء الانصاری	زکریا بکڈپو دیوبند
۳۱	تفسیر خازن	علاء الدین علی بن محمد البغدادی	دارالکتب العلمیہ بیروت
۳۲	تحفۃ الاحوذی	الشیخ عبدالرحمٰن المبارکپوری	اشرفی بک ڈپو دیوبند
۳۳	زرقانی	علامہ السید محمد الزرقانی	دار المخرفة بیروت
۳۴	شرح معانی الآثار	الامام احمد بن محمد طحاوی	نعیمیہ بک ڈپو دیوبند
۳۵	تحفۃ الالمعی	مفتی سعید احمد صاحب پالنپوریؒ	مکتبہ حجاز دیوبند
۳۶	تحفۃ القاری	مفتی سعید احمد صاحب پالنپوریؒ	مکتبہ حجاز دیوبند
۳۷	حاشیہ ہدایہ	علامہ ابوالحسنات عبدالحیٔ لکھنوی	مکتبہ اشرفیہ دیوبند
۳۸	درسِ ترمذی	مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی	دارالکتاب دیوبند
۳۹	نصرالباری	علامہ محمد عثمان غنی	زکریا بک ڈپو دیوبند
۴۰	رحمۃ اللہ الواسعۃ	مفتی سعید احمد صاحب پالنپوریؒ	مکتبہ حجاز دیوبند
۴۱	الشامی	علامہ محمد امین الشہیر بابن عابدین	زکریا بک ڈپو دیوبند
۴۲	فیض الباری	الشیخ محمد انور الکشمیری	دارالکتاب دیوبند
۴۳	عمدۃ القاری	العلامہ بدرالدین عینی	نعیمیہ بک ڈپو دیوبند
۴۴	کتاب الآثار	الامام محمد بن الحسن الشیبانی	دارالسلام، مصر
۴۵	مجمع الزوائد	علامہ الشیخ ابوبکر الہیثمی	دارالکتب العلمیہ بیروت
۴۶	فتح القدیر	علامہ کمال الدین محمد بن عبدالواحد	زکریا بک ڈپو دیوبند
۴۷	قواعد الفقہ	علامہ مفتی عمیم الاحسان	فیصل بک ڈپو دیوبند
۴۸	کتاب المسائل	مفتی محمد سلمان منصور پوری	فیصل بک ڈپو دیوبند

۴۹	کشف الباری	علامہ محمد سلیم اللہ خان	دارالکتاب دیوبند
۵۰	انیس الساری	تحقیق: نبیل بن منصور بن یعقوب	المکتب الاسلامیہ لاہور
۵۱	مجمع الانہر	عبدالرحمٰن محمد بن سلیمان شیخ زادہ	دارالکتب العلمیہ بیروت
۵۲	مرقاۃ المفاتیح	علامہ علی بن السلطان محمد القاری	دارالکتب العلمیہ بیروت
۵۳	نیل الاوطار	الامام محمد بن علی بن محمد الشوکانی	دارالکتب العلمیہ بیروت
۵۴	نووی علیٰ مسلم	الامام یحییٰ بن شرف النووی دمشقی	دارالنوادر
۵۵	فیض مشکوٰۃ	مولانا حارث عبدالرحیم فاروقی	مکتبہ فیض دیوبند
۵۶	ہدایہ	الامام برہان الدین ابوالحسن مرغینانی	دارالکتاب دیوبند
۵۷	مشکوٰۃ المصابیح	محمد بن عبداللہ خطیب تبریزی	فیصل بک ڈپو دیوبند
۵۸	کتاب التعریفات	علی بن محمد بن علی الحسینی الجرجانی	مکتبہ فقیہ الامت دیوبند
۵۹	جوہر النقی	علامہ ابن الترکہانی علاء الدین علی بن عثمان حنفی	دارالنوادر
۶۰	اثمار الہدایہ	مولانا ثمیر الدین قاسمی مدظلہ العالی	ثاقب بک ڈپو دیوبند
۶۱	نورالانوار	الشیخ احمد المعروف ملاجیون صدیقی	دارالکتاب دیوبند
۶۲	مستدرک حاکم	علامہ حافظ ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیسا پوری	دار المحرفہ بیروت
۶۳	اختلاف الائمہ فی المسائل المہمہ	مفتی عبدالرؤوف سنبھلی	نعیمیہ بک ڈپو دیوبند
۶۴	صحیح ابن حبان	الامیر علاء الدین علی بن بلبان الفارسی	دارالکتب العلمیہ بیروت

ختم شد فہرست